ارمغانِ حنیف
محمد اسحٰق بھٹی
ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲- کلب روڈ، لاہور

مرتبہ

محمد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

طبعِ اوّل 1989ء

ناشر : سراجِ منیر
ناظمِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲، کلب روڈ، لاہور

مطبع : کبسا اِن پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۱۰۰ روپے

ترتیب

۱۔ کچھ ارمغانِ حنیف کے بارے میں ۹

۲۔ ابتدائیہ
سراج منیر ۱۱

۳۔ مولانا محمد حنیف ندوی خود اپنی زبانی ۱۷

۴۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات
ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے ۲۳
محمد اسحاق بھٹی

۵۔ تفسیر سراج البیان ۵۵
محمد سعید الرحمٰن علوی

۶۔ مولانا محمد حنیف ندوی اور ان کی
خدماتِ گوناگوں ۸۷
محمد اسحاق بھٹی

۷۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا اسلوبِ نگارش
چند اشارات ۱۸۷
میرزا ادیب

۸ ۔ دین حنیف اور مولانا محمد حنیف ندوی ۱۹۷
تحسین فراقی

۹ ۔ مولانا محمد حنیف ندوی
بحیثیت ریڈیو مقرر ۲۰۹
عبدالحیّ قریشی

۱۰ ۔ مولانا محمد حنیف ندوی
واقعات و لطائف کے آئینے میں ۲۱۵
محمد اسحاق بھٹی

۱۱ ۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا سفر آخرت ۳۵۱
محمد اسحاق بھٹی

کچھ ارمغانِ حنیف کے بارے میں

آج سے ساڑھے چار سال پہلے ۳۰۔ جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیر اہتمام واپڈا آڈیٹوریم (لاہور) میں مولانا محمد حنیف ندوی کے ساتھ ایک شام منائی گئی تھی، جس کی صدارت اس زمانے کے وفاقی وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل نے کی تھی۔ اس تقریب میں علوم وفنون کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات نے شرکت کی تھی اور مولانا کی تحقیق وکاوش کے مختلف پہلوؤں پر متعدد اصحابِ علم نے مقالے تحریر کیے تھے۔ مقالہ نگاروں میں جناب میرزا ادیب، پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی، مولانا قاری سعید الرحمٰن علوی اور ان سطور کا راقم شامل تھے۔

یہ مقالے مولانا کی زندگی ہی میں کتابت کے مراحل سے گزر گئے تھے اور "ارمغانِ حنیف" کے نام سے جلد ہی ان کو طبع کرانے کا ارادہ تھا ـــــ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر صاحب کا خیال تھا کہ کتاب چھپنے کے بعد مولانا کے اعزاز میں ایک اور تقریب منعقد کی جائے گی، جس میں یہ کتاب مولانا کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ لیکن اس اثنا میں مولانا شدید بیماری کی گرفت میں آگئے۔ پھر علاج کے لیے لندن چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح کتاب کی طباعت واشاعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔

اس مجموعۂ مضامین میں صرف دو مضمون ایسے ہیں جو مولانا کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ ایک جناب سراج منیر صاحب کا 'ابتدائیہ' اور ایک راقم عاجز کا، جس کا عنوان ہے "مولانا محمد حنیف ندوی کا سفر آخرت"۔ باقی تمام مضامین میں مولانا زندہ ہیں اور یہ مضامین مولانا کے مطالعے میں بھی آچکے ہیں۔

اس کا افسوس ہے کہ "ارمغانِ حنیف" مولانا کی خدمت میں پیش نہ ہو سکی، لیکن یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے عقیدت مندوں اور ان پر کام کرنے والوں کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

محمد اسحاق بھٹی

۱۶۔ فروری ۱۹۸۹ء

ابتدائیہ

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی روایتِ علم کا اپنا ایک خاص مزاج رہا ہے اور یہ مزاج اس اعتبار سے پورے عالم اسلام میں ہمیشہ ایک شانِ امتیاز کا حامل رہا کہ اس کی ترتیب میں عالم اسلام کے مختلف منطقوں کے عناصر نے اپنا ایک نادر توازن دریافت کیا۔ اس میں منقولات کا عرب مزاج اگر ایک طرف پوری طرح کارفرما دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف عجم کی روایتِ دانش جلوہ نما نظر آتی ہے۔ صدیوں پر پھیلے ہوئے اس نظامِ علم کو اکابر علما اور اہل دانش نے مرحلہ وار کمال تک پہنچایا اور اس اعتبار سے اس نظام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں انسانی شخصیت کی تکمیل کے لیے ضروری تمام عناصر کو یکجا کر دیا گیا۔ عہدِ جدید میں ہمیں اس نظامِ علم کا نقشِ اوّل مدرسۂ رحیمیہ کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ عین اس وقت جب برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار چراغِ سحری تھا دینی میدان میں دو بڑے کارنامے سرانجام دیے گئے۔ فتاویٰ عالمگیری کی

تدوین ہوئی اور مدرسہ رحیمیہ کی بُنیاد رکھی گئی۔ یہی وہ وقت ہے جب مغلوں کا شاہجہان آباد روحانی انوار کے پرتو سے جگمگا رہا ہے اور اس کی کرنیں پورے برصغیر بلکہ اس سے باہر کے علاقوں کو بھی منور کر رہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے روایتِ علم و فکر کی جو تجدید کی اور تصورِ جہاد کی جو عملی صورت حضرت سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی شکل میں سامنے آئی وہ ہماری تاریخ کا عظیم سرمایہ ہے۔ ایک خاص وقت میں ان تجدیدی کارناموں کا یکجا ہونا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عموماً جب روایتی تمدن ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے پہلے دور میں حاصل کیے ہوئے سارے سرمائے کی ترتیبِ نو کرتے ہیں۔ زمانے اور اُس کے مطابق نفوسِ انسانیہ میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کے لیے نظاموں میں ردو بدل کر کے ایک ایسا سانچہ ترتیب دیا جاتا ہے جو مقاصدِ دین کو پورا کرنے کے لیے زیادہ سازگار اور مناسب ہو۔ یہی عمل اٹھارویں صدی کے آغاز سے برصغیر میں دکھائی دیتا ہے اور تیزی سے اپنے تمدن اور علومِ دینیہ کے لیے ایک ایسا نظام وضع کرتا ہے کہ وہ طوفانِ بلاخیز جو اس کے فوراً بعد اس خطۂ ارض پر نمودار ہوا اور یہاں کی دوسری تہذیبوں کی مذہبی روایت کو سمیٹتا ہوا چلا گیا، وہ اسلامی علوم اور نظامِ علم کو سلبی طور پر کہیں متاثر نہیں کر سکا۔

مسلمانوں کا نظامِ علم دُنیاوی سلطنت کے عین وسط میں وہ روحانی اقلیم تھی جو زمانے کی گردشوں سے منزہ رہی اور اس طرح اس نے اپنے لوگوں کے عقائد اور علوم کی حفاظت کا فریضہ اس کمال کے ساتھ سرانجام دیا کہ آج اس کا شمار ایک عظیم

تاریخی کرامت کے طور پر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دینی علوم کے منظر پر اس سے مدارس کا ایک پورا نظام پیدا ہوا جس میں دیوبند اور ندوۃ العلما کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ایک ایسے زمانے میں جب جدید سائنس اور فلسفے کی یورش کا اصل نشانہ مسلمانوں کی دینی روایت ہو اور مغرب میں تاریخ کے نئے تنقیدی تصورات کا تختۂ مشق نہایت فیاضی سے اسلامی تاریخ کو بنایا جا رہا ہو، اس وقت یہ ضروری تھا کہ ایک نئے کلامی اسلوب کی بنیاد رکھی جائے اور تاریخ کو ایک ایسے نقطۂ نظر سے مرتب کیا جائے کہ وہ صحتِ بیان کے ساتھ ساتھ دنیا میں تاریخ نگاری کے اعلیٰ ترین معیاروں پر پوری اُتر سکے۔ نظام علم میں تصنیفی عنصر کی اہمیت بھی اس بات کی متقاضی تھی کہ تحقیق کی ایک نئی روش جو کسی طور دُنیا کے کسی اور تحقیقی اسلوب سے کمتر نہ ہو آغاز کی جائے۔ یہ وہ عناصر ہیں جو ندوۃ العلما میں خصوصی توجہ کا مرکز رہے اور دینی میدان میں آج ہماری روایتِ علم کا دامن ان شعبوں میں ندوہ کی ہی اس کاوش سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کے زیر اثر جو نقطۂ نظر اور اسلوبِ بیان پیدا ہوا اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے قلم سے بیسویں صدی کی اختتامی دہائیوں تک پہنچا اس کا اپنا ایک اہم کردار ہے۔ ندوۃ العلما نے میدانِ علم میں جو نمایاں لوگ پیدا کیے، ان میں مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جگہ ایک یگانۂ روزگار نابغہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کا ایک بڑا اعزاز یہ بھی ہے کہ ادارے کو مولانا کی سرپرستی سے طویل استفادے کا موقع ملا اور ادارے

کے علمی مزاج پر اُن کی چھاپ بہت گہری ہے۔ مولانا کا قلم علوم دینیہ کے تمام میدانوں میں یکساں سہولت و اعتماد کے ساتھ چلتا تھا۔ قرآن، حدیث، تفسیر، تاریخ، کلام، اخلاقیات، مسائلِ جدید، غرض کوئی اہم شعبہ ایسا نہیں جس میں مولانا کی تصنیف اپنے موضوعات پر اُن کی گرفت کی کامل شہادت نہ دیتی ہو۔ آپ کی طبیعت میں ایک ایسی نادر لطافتِ فہم موجود تھی کہ عہدِ جدید میں نفوس انسانیہ اور تاریخ کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ نے گویا علوم دینیہ کے تمام بڑے شعبوں میں نشانِ راہ قائم کیے اور ان سارے شعبوں میں آپ کو سند کی حیثیت حاصل رہی۔ علمی کاموں میں اس قدر استغراق کے باوجود آپ انتہائی شگفتہ مزاج، علومِ مجلسی کی لطافتوں سے آشنا اور شعر و سخن کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ تھے کسی بھی محفل میں آپ کی موجودگی مولانا روم کے اس مصرعے کی مصداق ہوا کرتی تھی ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی است

مولانا کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ایک تمدن کتنا مکمل آدمی پیدا کر سکتا ہے اور کس طرح مختلف پہلوؤں سے متوازن شخصیت کی تربیت کر سکتا ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی کی جُدائی برصغیر میں مسلمانوں کی پوری علمی دُنیا کے لیے ایک عظیم صدمہ تھی اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے تو اہم ترین علمی سرپرستی سے محرومی کا جانکاہ واقعہ تھا۔ مولانا نے اپنی علمی زندگی کا بیشتر حصہ ادارے میں بسر کیا۔ ادارے میں اپنے قیام کے دوران، نہ صرف یہ کہ انھوں

نے متعدد کتابیں تصنیف کیں بلکہ اپنے رفقائے کار کی علمی تربیت اور رہنمائی بھی فرمائی۔ مولانا کی جامع کمالات شخصیت اور اُن کے علمی کارناموں پر مشتمل یہ کتاب "ارمغانِ حنیف" شائع کی جا رہی ہے ۔ یہ کتاب ادارے پر مولانا کے احسانات کا بدل تو نہیں، ان کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی صرف ایک ادنیٰ کوشش ہے ۔

سراج منیر

مولانا محمد حنیف ندوی

خود اپنی زبانی

یہ نہایت مختصر مضمون تین سال پہلے مولانا محمد حنیف ندوی نے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے مجلہ "مہک" کے خصوصی نمبر بسلسلہ کالج کے جشن سیمیں (سلور جوبلی) کے لیے لکھا تھا۔ اس میں اُنھوں نے اپنے ابتدائی دورِ زندگی اور اپنے شہر گوجرانوالہ کی چند اہم شخصیتوں کے بارے میں کچھ اشارے کیے ہیں جو بلیغ بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ (مرتب)

میں ان عالی قدر مرتبین مجلہ کی، جو گوجرانوالہ کی علمی و فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے مرتب کر رہے ہیں، یاد فرمائی کا بہرحال ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے فراموش نہیں کیا۔ میں ذاتی طور پر سستی شہرت کو پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی علم و دانش کے معنی میرے نزدیک یہ نہیں کہ کوئی شخص فقہ و حدیث، قرآن و سنت اور مروجہ علوم و معارف کو کس حد تک جانتا اور ان پر عبور رکھتا ہے۔ میں اس شخص کو عالم، دانشور اور محقق سمجھتا ہوں جو اپنے حدودِ جہل کو اچھی طرح پہچانتا ہو اور اس حقیقت سے آشنا ہو کہ جن حقائق سے وہ آگاہ ہے، مقدار و اہمیت کے اعتبار سے وہ بہت کم ہیں، اور علم و فن کے جن دروازوں پر اس نے دستک نہیں دی، ان کی تعداد بہت زیادہ، بہت وسیع اور پھیلی ہوئی ہے۔

میں اس حقیقت پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ جس شخص نے بھی اپنی زندگی میں علم و آگہی کی تکمیل کا دعویٰ کیا، اس نے اپنی موت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ میں چونکہ اس بڑھاپے میں بھی اپنے ذہن و فکر کی نشاط آفرینیوں کو زندہ و تابندہ دیکھنے کا آرزومند ہوں، اس لیے خوب جانتا ہوں کہ اس کاوش و محنت کے باوجود جو میں نے فکر و علم کی زلف و کاکل کو سنوارنے اور سجانے کے سلسلے میں انجام

دی، ہنوز اپنے جہل کا اعتراف کروں۔ میں اس بات کا قطعی سزاوار ہوں کہ میرا نام گوجرانوالہ کے مشاہیر کی فہرست میں نہ آنے پاتا۔ مجلہ کی تکمیل کے آخری مرحلے میں غالباً میری یاد فرمائی کی ایک معقول وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں نے جو کچھ بھی علم کے دائروں میں کیا دھرا، اس کا تعلق، گوجرانوالہ سے صرف اس قدر ہے کہ میں نے اس شہر وفا شعار میں جنم لیا اور اپنی تعلیم و تدریس کے ابتدائی مرحلے اس شہر مردم آفریں میں طے کیے۔

میری ساری زندگی میں کوئی معرکہ آرائی، مہم جوئی اور غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہُوا۔ ہاں کچھ پڑھا اور لکھا ضرور ہے۔ کچھ مسائل پر اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے اظہارِ خیال بھی کیا ہے۔ یہ ہے میری زندگی کی کل کائنات۔

مختصراً حالات و کوائف کا انداز کچھ اس طرح ہے کہ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز میونسپلٹی کے پرائمری سکول میں ہُوا۔ درجہ چہارم تک پڑھا اور پھر والد محترم کی خواہش و آرزو کے مطابق دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ ابتدا میں دینی تعلیم پُر کشش ثابت نہ ہوئی۔ لیکن جوں جوں تعلیم کے قدم آگے بڑھتے گئے، اس اسلوبِ تعلیم کی عظمت و گہرائی کے نقوش لوح و قلب پر برابر مرتسم ہوتے چلے گئے۔

سکول کی تعلیم میں جس شخص نے پہلے پہل ذوق و آگہی کو جلا بخشی وہ خاندانِ حکیماں کے ایک فرد جلیل حکیم ظہور الدین تھے، جن کو فارسی ادب پر بہت عبور حاصل تھا۔ وہ کلاس میں اکثر حافظ کے اشعار لَے کے ساتھ اور سکر و مستی کے وجد آفریں عالم میں ہمیں سناتے رہتے۔ حکیم ظہور الدین گوجرانوالہ کے معروف عالم اور طبیب حکیم شہاب الدین کے فرزند اور مشہور عالم دین مفتی جعفر حسین مرحوم کے تایا زاد بھائی تھے۔

عربی میں درسِ نظامیہ کی تکمیل حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ مولانا مرحوم نہ صرف میرے گرامی قدر استاد تھے بلکہ میرے مربی و مرشد بھی تھے۔ علم و ادراک کی پہلی قندیل انہی کی کوشش سے دل میں فروزاں ہوئی۔ ان کے مطالعہ و استعداد کے دائرے بہت وسیع اور بہت پھیلے ہوئے تھے۔ اگر اپنی اصلاحی کوششوں کو گوجرانوالہ کے ماحول تک محدود نہ رکھتے تو ان کا شمار علمی اعتبار سے برصغیر کے عظیم لوگوں میں ہوتا۔

انھی میں سے ہم عصر جن سے اگرچہ میں نے کچھ پڑھا نہیں، لیکن ان کے استحضارِ علمی اور جامعیت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ان کی ذات میں منقول و معقول کا ایسا اونچا، گہرا اور عمیق امتزاج پایا جاتا ہے کہ اُن کے بے شمار تلامذہ میں سے اگر کوئی شخص ان کے فیوضِ علمی کی پہنائیوں کو قلم بند کر لیتا تو ان کی عظمت کا لوہا ہر پڑھا لکھا عالم بغیر کسی تحفظ کے جان لینے پر مجبور ہو جاتا۔ ان کا نامِ نامی مولانا حافظ محمد گوندلوی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ان کے سینکڑوں تلامذہ میں سے کسی کو بھی یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی۔

میں نے اپنے دور کے جیّد عالم مولانا عبدالعزیز خطیب جامع مسجد کی صحبتوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مرحوم کی علوم حدیث اور عربی کے ادبی و علمی لطائف و نکات پر بہت دسترس تھی۔ مزاج میں انکسار اور تواضع کا عنصر عجیب بہار دکھاتا تھا۔

قاضی عبدالرحیم سے بھی جو اپنے وقت کے مشہور طبیب، عالم اور نہایت شریف النفس انسان تھے، میں نے مولانا اسماعیل مرحوم کی غیر حاضری میں چند اسباق پڑھے۔ میں نے پہلی دفعہ ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحات کی تمام جلدیں نہ صرف ان کے ہاں دیکھیں بلکہ بعض مشکل مقامات کی تشریح بھی ان کی زبانِ فیض ترجمان سے سُنی۔ رموز و اسرار سے آشنائی کا یہ نقطۂ آغاز تھا جس نے آگے چل کر تصوف کے اسرار و رموز کو سمجھنے میں مدد دی۔ میں واضح الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی صحبت سے اگر مجھے مستفید ہونے کا موقع نہ ملتا تو آج کل کے مشہور محقق، صوفی اور عظیم فلسفی و مفکر شوآن کی کتابیں قطعی سمجھ نہ پاتا جو مغرب میں وحدت الوجود اور وحدتِ ادیان کے زبردست حامی اور ترجمان ہیں۔ یوں کہیے کہ وہ اس دور کے ابن عربی ہیں۔

ناانصافی ہوگی اگر اس سلسلے میں شیخ برادری کے کھاتے پیتے گھرانے کے مہذب و شائستہ عالم دین شیخ نورالدین کا ذکر نہ کروں، جن کی تقریروں کے سلجھاؤ، روانی اور تاثیر نے مجھے خطابت کے گُر سلجھائے۔ ان کے دلچسپ اور برموقع مواعظ کا اثر اب تک مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

آفاق و ابعادِ فکر کی وسعت و گیرائی کے متعدد دریچے شہر کے مشہور وکیل اور قانون دان دین محمد کی ایک تقریر دل پذیر سے کھلے جو اسلام کے فضائل و محامد پہ مشتمل تھی۔ میں نے

جب گوجرانوالہ کے ایک اجلاس میں ان کی یہ تقریر سنی تو اس سے فکر و نظر کے دائرے نہ صرف کشادہ ہوئے بلکہ مطالعہ و تحقیق کے نئے موڑ فکر و نظر کے سامنے آئے۔

میرے دور کے ایک اور فاضل مولانا عبداللہ مہاس تھے، جن سے متعدد بار گفتگو کے مواقع میسر آئے۔ یہ عربی زبان و ادب کے بہت بڑے رمز شناس تھے۔

پاکستان کی بالخصوص اور مردم آفریں بلدۂ طلیبہ گوجرانوالہ کی بالعموم میرے نزدیک اس دور میں کیا اہمیت ہے۔ اس کو چند جملوں میں بیان کر کے اپنے تاثرات کو شکسپیئر اور میزینی کے الفاظ میں یوں ختم کرتا ہوں۔ انگلستان کے بارے میں شکسپیئر نے کہا تھا۔

"یہ خوش آئند انسانوں کا مقام ہے۔ یہ پورے کارخانۂ عالم کا ننھا سا آئینہ دار ملک ہے۔ یہ وہ قیمتی پتھر ہے جو سیمیں سمندر میں نصب ہے۔ یہ برکت آفریں جگہ ہے۔ اس اقلیم کا نام انگلینڈ ہے۔"

میزینی نے اٹلی کے بارے میں کہا تھا۔ "اٹلی میرا مذہب ہے۔"

میں کہتا ہوں، میرا ملک پاکستان اور میرا شہر گوجرانوالہ مادی و روحانی خزائن سے مالا مال ہے۔ اس شہر نے عظیم علما، صحافی اور شاعروں کو جنم دیا ہے۔ یہ علم و فضل کا گہوارہ ہے اور اس کا مستقبل روشن و تابندہ ہے۔ میرے ملک اور شہر کی مٹی میں الفت، محبت اور اخلاص کی مہک ہے۔ اور میری رائے میں وہ صبح صادق جلد طلوع ہونے والی ہے، جس سے زندگی، دین اور اعلیٰ انسانی اقدار کے آفاق دمک اٹھیں گے۔ میرے شہر کے مکین مخلص، متدین اور مہمان نواز ہیں۔ خدا کرے ان میں علم و عرفان کے خوابیدہ جذبے جاگ اٹھیں اور یہ پورے ملک میں اپنے لیے ایک مقام حاصل کر لیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی

کی خدمات
ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے

محمد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ۱۹۵۰ میں قائم ہوا۔ اس کے بانی ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم تھے۔ اس زمانے میں مولانا محمد حنیف ندوی گوجرانوالہ میں اقامت گزیں تھے اور ہفت روزہ "الاعتصام" کے ایڈیٹر تھے جو اُن دنوں گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا۔ میں اس اخبار کا معاون ایڈیٹر تھا۔ خلیفہ صاحب مرحوم کو مولانا کی منزلتِ علمی کا پتا چلا تو انھیں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ مولانا لاہور آئے اور خلیفہ صاحب سے ملے۔ گفتگو ہوئی تو انھوں نے مولانا سے ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور اس سے وابستگی اختیار کرنے کی درخواست کی۔ یہ اوائلِ مئی ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔

خلیفہ صاحب سے ابتدائی گفتگو کے بعد مولانا نے ان کی پیش کش کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور ۱۵ مئی ۱۹۵۱ کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے۔ اس وقت مولانا کی عمر تینتالیس برس کی تھی۔ اس وقت سے اب (۲۰ ستمبر ۱۹۸۶) تک جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، مولانا ادارے سے منسلک ہیں۔ شمسی حساب سے اس پر پینتیس ۳۵ برس چار مہینے پانچ دن کا عرصہ گزر چکا ہے۔

اس اثنا میں مولانا نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے پندرہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں بعض کتابیں وہ ہیں، جنھیں عربی سے اُردو میں منتقل کیا اور پاکستان کی قومی زبان کو نئی اصطلاحات، نئے اسلوب اور نئے علوم و فنون سے روشناس

کرایا۔ اس طرح انھوں نے جہاں علوم و فنون کی گراں مایہ خدمت انجام دی، وہاں اُردو زبان کو بھی ایک نیا آہنگ اور نیا عنوان عطا کیا۔ عربی زبان کو بھی لغت ولحن کے خاص میدان سے نکال کر اصحابِ تحقیق و کاوش کے نئے حلقے سے متعارف کرایا۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ عربی اور اردو دونوں زبانیں مولانا کی زیر بارِ احسان ہیں۔

مولانا کا اندازِ فکر و بیان خالص فلسفیانہ ہے اور زبان وطرزِ ادا ان کی اپنی ہے، جس کی شگفتگی و شیرینی اور سلاست و روانی انھی سے مخصوص ہے۔

انھوں نے قرآن و حدیث کے بحرِ بے کراں میں بھی غوطے لگائے، اسلامی اوامر و احکام کو بھی ہدفِ فکر ٹھہرایا، فلسفہ و کلام کی وسعتوں کا بھی ان کے قلم حقیقت رقم نے احاطہ کیا اور منطق و حکمت کی وادیوں کے بھی ہر گوشے کی ان کے خامہ عنبر شمامہ نے جی بھر کر سیاحت کی۔ تحریر کے ہر موڑ پر، تصنیف و تالیف کے ہر مرحلے میں اور ترجمے کی ہر منزل میں، ادبیت کی لطافت اور زبان کی چاشنی ان کے ہم رکاب رہی۔

بعض مقامات پر وہ الفاظ و اصطلاحات کی انتہائی مشکلات سے بھی دوچار ہوئے اور وادیٔ فن کی نہایت کٹھن منزلیں بھی ان کے سامنے آئیں، لیکن ان کی رسائیٔ فہم نے ہر موقعے پر ان کا ساتھ دیا اور ان کا رہوارِ قلم علم و فن کے تمام نشیب و فراز سے نہایت سُبک رفتاری سے گزرتا اور ہر گھاٹی کو انتہائی ہنرمندی سے عبور کرتا گیا۔

ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فلسفہ و منطق کے پیچیدہ اور گنجلک ترین مسائل و مضامین کو ادب کا دلآویز خلعت پہنا دیا ہے اور قاری ان کی تصنیفات سے بہ یک وقت دو فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ زیر بحث موضوع میں وسعتِ معلومات سے بھی اپنا دامنِ طلب بھر سکتا ہے اور ادب و زبان کی لطافتوں اور حلاوتوں سے بھی بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ یبوست اور عبوست کا کوئی شائبہ نہ ان کی تحریر میں دخل اندازی کی جرأت کر سکتا ہے، نہ تقریر اور عام گفتگو میں راہ پا سکتا ہے۔

مولانا حنیف ندوی کا شمار اصحابِ جبہ و قبا میں نہیں ہوتا اور انھوں نے کبھی اپنا

کوئی خاص حلقہ قائم کرنے کی طرف بھی عنانِ توجہ مبذول نہیں کی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ تحقیقِ موضوع اور سلاست و شگفتگیٔ بیان کے سلسلے میں طبقۂ علما میں ان کا کوئی حریف نہیں، علومِ اسلامی پر درک و عمق میں کوئی ان کا رگا نہیں کھا سکتا اور ذہن و فکر کی صفائی اور نہجِ ادا میں کوئی ان کی انفرادیت کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ یہ اللہ کا خاص عطیہ ہے اور اللہ نے اس سے ان کو خوب نوازا ہے۔

قرآن و تفسیر، حدیث و سنت، فقہ و اصول، کلام و منطق اور فلسفۂ قدیم و جدید پر مولانا کو عبور و استحضار حاصل ہے اور ان تمام موضوعات پر انھوں نے لکھا اور بہت لکھا جو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آیا۔ تصنیفات کے علاوہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ترجمان دو ماہانہ رسالوں —— "ثقافت" اور "المعارف" —— میں بھی مختلف علمی و تحقیقی عنوانات پر ان کے بہت سے مضامین شائع ہوئے اور طبقۂ اہلِ علم میں مستحقِ داد و تحسین قرار پائے۔

"ثقافت" پہلا ماہانہ رسالہ تھا جو جنوری ۱۹۵۵ء میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس میں مولانا نے متعدد مضامین سپردِ قلم کیے۔ ثقافت میں انھوں نے قرآنِ مجید کی تفسیر کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کیا، جس کا عنوان تھا، ایک آیت کی تفسیر"۔ یہ سلسلہ عرصے تک جاری رہا۔ اس میں وہ قرآنِ مجید کی کسی مشکل اور ایسی اہم ترین آیت کی تفسیر بیان کرتے تھے، جس میں کوئی خاص علمی، ادبی، فقہی، نحوی یا لغوی نکتہ پنہاں ہو۔

مولانا طبعاً مشکل پسند ہیں اور زیادہ تر کسی ایسے ہی موضوع کو منتخب کرتے اور زیرِ بحث لاتے ہیں، جس میں کوئی اشکال پایا جاتا ہو۔ پھر اپنے اسلوبِ خاص سے اس اشکال کی عقدہ کشائی کرنا یا بقول ان کے اس کی "معقدِ پریشاں کو سلجھانا"، ہمیشہ ان کا محبوب مشغلہ رہا۔

جنوری ۱۹۶۸ میں "ثقافت" کا نام بدل کر اُسے "المعارف" کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ اس میں بھی مولانا کے بہت سے مضامین شائع ہوئے جو انتہائی ذوق و

شوق سے پڑھے گئے۔

مولانا ندوی کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنی بات کہہ کر آگے نکل جانے کے عادی ہیں۔ کوئی اس سے کیا اثر لیتا ہے اور اس کا کیا جواب دیتا ہے، اس کی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ پیچھے گردن موڑ کر دیکھنا، حریف کا انتظار کرنا اور پھر اس سے گتھم گتھا ہونا، ان کا شیوا نہیں۔ بعض حضرات نے ان کے بعض افکار پر تنقید بھی کی اور انھیں نشانۂ اعتراض بھی بنایا، حتیٰ کہ بعض لوگ ذاتیات پر بھی اُتر آئے لیکن انھوں نے نہ کبھی کسی کو اپنا حریف گردانا اور نہ کسی کی تنقید و اعتراض کو قابلِ جواب یا لائقِ اعتنا ٹھہرایا۔

مولانا نے اپنی تحقیق کے مطابق ہمیشہ کتاب و سنّت کو مشعلِ راہ بنائے رکھا اور یہی ان کا عقیدہ اور یہی ان کا اصل سرمایۂ حیات ہے۔ لیکن اس ضمن میں ان کی اپروچ سائنٹیفک اور فلسفیانہ ہے اور ان کے نزدیک منقول و معقول دونوں اپنی اپنی جگہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے دونوں سے کسبِ ضیا کرنا ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

وہ اس اعتبار سے "قدامت پسند" ہیں کہ ان کے نزدیک ہمارے تمام معاملات کا اصل ماخذ و مرجع کتاب و سنّت ہے اور اسی کی روشنی میں ہمیں آگے بڑھنا اور اپنے لیے ترقی و تقدّم کا راستہ تلاش کرنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ عصری تقاضوں اور دورِ جدید کے مسائل سے بھی کسی صورت میں روگرداں ہونے کو تیار نہیں۔ ان کا نقطۂ فکر یہ ہے کہ کوئی فرد یا معاشرہ اپنے عہد کے مسائل اور تقاضوں کو نظر انداز کر کے سفرِ حیات کی طویل اور کٹھن منزلیں ہرگز طے نہیں کر سکتا۔ پیش آئند مسائل کے حل و کشود کے لیے جہاں کتاب و سنت سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے، وہاں فقہ و اصول، اجماع و قیاس اور اجتہاد کے بابِ عالی پہ دستک دینا بھی لازم ہے۔ اور یہ باتیں اپنی تصنیفات میں مختلف مقامات پر انھوں نے تفصیل سے لکھی ہیں۔

آئیے پہلے ترتیبِ تصنیف کے اعتبار سے مولانا کی ان کتابوں کا شمار کریں جو انھوں نے

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے لکھیں۔ اس کے بعد تقدیسِ موضوع کی روشنی میں ان کا تعارف کرایا جائے گا۔

۱۔ مسئلۂ اجتہاد : یہ ادارے کی طرف سے ان کی پہلی تصنیف ہے۔ سالِ اشاعت ۱۹۵۲ء۔

۲۔ افکارِ ابنِ خلدون : ۱۹۵۴ء۔

۳۔ افکارِ غزالی : ۱۹۵۶ء۔

۴۔ سرگزشتِ غزالی : ۱۹۵۹ء۔

۵۔ تعلیماتِ غزالی : ۱۹۶۲ء۔

۶۔ مکتوبِ مدنی : ۱۹۶۵ء۔

۷۔ عقلیاتِ ابنِ تیمیہ : ۱۹۶۶ء۔

۸۔ مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد اوّل) : ۱۹۶۸ء۔

۹۔ مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد دوم) : ۱۹۷۰ء۔

۱۰۔ اساسیاتِ اسلام : ۱۹۷۳ء۔

۱۱۔ تہافت الفلاسفہ (تلخیص و تفہیم) : ۱۹۷۴ء۔

۱۲۔ مطالعۂ قرآن : ۱۹۷۸ء۔

۱۳۔ مطالعۂ حدیث : ۱۹۷۹ء۔

۱۴۔ لسان القرآن (جلد اوّل) : ۱۹۸۳ء۔

۱۵۔ لسان القرآن (جلد دوم) : ۱۹۸۴ء

یہ پندرہ کتابیں ہیں جو مولانا نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے تصنیف کیں یا جن کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ مولانا کا طریقِ ترجمہ کچھ ایسا ہے کہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ ترجمہ شدہ کتاب ہے تو قطعی پتا نہیں چلتا کہ اسے کسی دوسری زبان سے اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اگر یہ ممکن ہو کہ خود مصنف اپنی کتاب کا وہ ترجمہ پڑھ سکے جو مولانا نے کیا تو اسلوب و انداز اور زبان و ادب کے لحاظ سے ترجمے کو اپنی اصل

کتاب پر ترجیح دینے کے لیے مجبور ہو جائے۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ مولانا جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہ الفاظ کو منتخب نہیں کرتے، بلکہ خود الفاظ اپنے وسیع حلقۂ الفاظ سے منتخب ہو کر اور نہایت ادب سے قطار بنا کر ان کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کا قلمِ حُسن آشنا انتہائی سلیقے اور دلکش ترتیب سے ان کو جُملوں اور فقِروں کی خوب صورت لڑی میں پروتا جاتا ہے۔ شروع سے آخر تک یہ سلسلہ پورے وقار اور تمام لوازمِ احترام کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

اب ذیل میں مولانا کی تصنیفات کا قدرے تفصیل سے تعارف کرایا جاتا ہے۔ اس تعارف میں تقدیسِ موضوع کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی پہلے قرآنِ حکیم سے متعلق کتابیں آئیں گی، اس کے بعد حدیث، پھر اسلام، بعد ازاں اجتہاد اور پھر جن حضرات سے متعلق کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی ترتیبِ زمانی کو سامنے رکھا گیا ہے۔ تو آئیے سب سے پہلے قرآنِ مجید-!

مطالعۂ قرآن

ایک عرصے سے مولانا محمد حنیف ندوی کے دل میں یہ خواہش شدت سے کروٹ لے رہی تھی کہ قرآن اور حدیث کو موضوعِ تحقیق ٹھہرایا جائے۔ اس کی بنیادی وجہ اس مقدس اور جاں فزا موضوع سے ان کا روحانی اور قلبی تعلق ہے۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز بھی اسی سے کیا تھا اور "سراج البیان" کے نام سے پانچ جلدوں میں قرآنِ مجید کی تفسیر لکھی تھی جو پندرہ سولہ دفعہ چھپ چکی ہے۔ اب عمر کے آخری دور میں بھی وہ یہی خدمت انجام دینا چاہتے تھے۔ اس کا آغاز انھوں نے "مطالعۂ قرآن" سے کیا۔

مطالعۂ قرآن میں انھوں نے قرآنِ کریم سے متعلق ان تمام مباحث و مسائل پر محقّقانہ اظہارِ خیال کیا ہے، جن سے قرآن فہمی میں مدد ملتی ہے، اور اس کتابِ ہُدیٰ کی عظمت و رفعت واضح شکل میں فکر و نظر کے زاویوں میں آتی ہے۔ نیز جن سے قرآن کے علوم و معارف اور دعوت و اسلوب کی معجز طرازیوں کا تفصیلی نقشہ سامنے آتا ہے۔

مطالعۂ قرآن میں مولانا نے اپنے خاص شگفتہ اسلوب اور حکیمانہ انداز میں مستشرقین کے قرآن کے بعض مضامین پر پیدا کردہ ان اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیا ہے جو لوگوں کے قلب و ذہن میں شکوک و شبہات ابھارنے کا باعث ہو سکتے ہیں۔

مطالعۂ قرآن میں درج ذیل سولہ عنوانات کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے:

۱۔ قرآن کا تصوّرِ وحی و تنزیل۔

۲۔ قرآنِ مجید اور کتبِ سابقہ۔

۳۔ اسفارِ خمسہ۔

۴۔ عہد نامۂ جدید اور اناجیلِ اربعہ۔

۵۔ قرآنِ حکیم اور اس کے اسما و صفات۔

۶۔ قرآنی سورتوں کی قسمیں اور ترتیب۔

۷۔ قرآنی سورتوں کی زمانی و مکانی تقسیم۔

۸۔ جمع و کتابتِ قرآن کے تین مراحل۔

۹۔ قرآنِ حکیم کی لسانی خصوصیات۔

۱۰۔ اعجازِ قرآن اور اس کی حقیقت۔

۱۱۔ محتویاتِ قرآن۔

۱۲۔ مشکلاتِ قرآن۔

۱۳۔ قرآن کے رسم الخط کے بارے میں نقطۂ اختلاف۔

۱۴۔ تفسیر۔

۱۵۔ تفسیر کے دو مشہور مدرسۂ فکر۔ اصحاب الحدیث اور اہل الرائے۔

۱۶۔ اوّلیاتِ قرآن۔

مطالعۂ قرآن کا "پیش لفظ" جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان مرحوم و مغفور کا تحریر کردہ ہے۔

یہ کتاب ۳۱۰ صفحات پر محتوی ہے۔ فہرستِ مضامین اور مقدمے کے آٹھ صفحے

اس کے علاوہ ہیں۔

مطالعۂ قرآن پہلی بار ۱۹۷۸ء میں طبع ہوئی۔

لسان القرآن۔ جلد اوّل

قرآنِ مجید اور اس کے مضامین و متعلقات پر غور و فکر مولانا محمد حنیف ندوی کا مرغوب اور چہیتا موضوع ہے۔ ۱۹۷۸ء میں انھوں نے "مطالعۂ قرآن" لکھی، اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں "مطالعۂ حدیث" تصنیف کی۔ پھر قرآنِ مجید کے توضیحی لغت کو محورِ تحقیق ٹھہرایا اور اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس عظیم کام کا آغاز انھوں نے ۱۹۷۹ء کے آخر میں کیا اور ۱۹۸۲ کے آخر میں اس کی ایک جلد مکمل ہوگئی، جس کا نام "لسان القرآن" رکھا گیا۔ یہ جلد حرفِ الف، "اب" سے شروع ہوئی اور حرفِ ج (ج ی د) "جید" پر ختم ہوئی۔

یہ قرآنِ مجید کا ایک جامع تفسیری اور توضیحی لغت ہے، جس میں مولانا نے قرآنِ حکیم کے الفاظ اور مطالب و معانی کو نہایت عمدہ طریقے سے نکھار کر بیان کیا ہے۔ بلاشبہ قرآن کے متعلق ان کی یہ ایک گراں قدر کوشش ہے۔ اس میں قرآن، حدیث، محاوراتِ عرب اور قدیم و جدید علوم و تحریکات کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جائزہ لیا گیا ہے، جن کا کسی نہ کسی طرح عمرانیات، تاریخ، فلسفہ یا سائنس سے تعلق و ربط ہے۔ کثرتِ معلومات کے اعتبار سے "لسان القرآن" کو قرآن کے حِکَم و معارف کا گنجینہ قرار دینا چاہیے۔ مولانا کا پیرایۂ بیان ایسا پیارا اور مؤثر ہے کہ اس کے مطالعہ سے ذہن قرآن کی ضوفشانیوں سے دمک اٹھتا ہے اور قلب و باطن میں عظمتِ قرآنی کا حسین نقش مرتسم ہو جاتا ہے۔

لسان القرآن کی اس پہلی جلد پر ۳۲ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں قرآن فہمی کے اصول اور تقاضے بیان کیے گئے ہیں۔

کتاب ۴۰۰ صفحات پر محیط ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

لسان القرآن - جلد دوم

لسان القرآن کی دوسری جلد حرفِ ح (ح ب ب) "الحبّ" سے شروع ہو کر حرفِ د (د ی ن) "الدین" پر ختم ہوئی ہے۔ پہلی جلد کے آخری صفحے کا نمبر ۴۰۰ ہے۔ دوسری جلد مسلسل صفحات نمبر کے مطابق صفحہ ۴۰۱ سے شروع ہوتی اور ۷۹۳ صفحات تک پہنچی۔ اس حساب سے دوسری جلد ۳۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

لسان القرآن کی دوسری جلد ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔

جلد سوم حرفِ ذ سے شروع کی گئی ہے۔ مولانا یہ کام نہایت تیزی اور مستعدی سے کر رہے تھے کہ بیمار پڑ گئے۔ مسودہ تقریباً سو صفحات تک پہنچا ہے۔ اب کم و بیش ایک سال سے مولانا بیمار ہیں اور کام رُک گیا ہے۔ وہ اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بے تاب ہیں۔ لیکن بیماری کے ہاتھوں بے بس ہیں، ایک لفظ بھی لکھنے کی ہمت نہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحتِ عاجلہ و کاملہ سے نوازے اور وہ اس عظیم کام کو جس کا آغاز انھوں نے انتہائی شوق و ذوق سے کیا تھا، مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مطالعۂ حدیث

مستشرقین اور استشراق زدہ حضرات نے ایک مدت سے حدیث و سنّت کے بارے میں اس ہرزہ سرائی کو "علمی و تحقیقی" سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد شروع کر رکھی ہے کہ اس کی تدوین و تسوید کا سلسلہ محض تاریخی عوامل کی بنا پر معرضِ ظہور میں آیا۔ ہمارے ہاں کے کچھ لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے مستشرقین کے اس اندازِ فکر کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کی کوشش کی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے "مطالعۂ حدیث" میں اس کا مثبت اسلوب میں جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ حدیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اشاعت و فروغ اور حفظ و صیانت کا سلسلہ عہدِ نبوی سے لے کر صحاح ستّہ کی تدوین تک ایک خاص نوع کا تسلسل لیے ہوئے ہے، جس میں شک و ریب کی

کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی - علاوہ ازیں مولانا نے اس کتاب میں حدیث کے علوم و معارف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور دلائل سے واضح کیا ہے کہ یہ مکمل سائنس ہے، جس میں رجال و رواۃ کی جانچ پرکھ کے پیمانوں کی تشریح کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور ان اصولوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے، جن سے محدثین نے متنِ حدیث کی صحت و استواری کا تعین کیا ہے۔

یہ بہت اہم سوالات ہیں کہ اسلام کے احکام و فرامین میں حدیث و سنّت کا کیا درجہ ہے؟

اس نے کب اور کس طرح تدوین و ترتیب کے محنت طلب مرحلے طے کیے؟

کن مؤثر اور معتبر ترین علمی ذرائع سے ہم تک پہنچی؟

یہ اپنے آغوش میں تحقیق و تفحص کے کن معیاروں کو سمیٹے ہوئے ہے؟

مولانا نے ان تمام سوالات کا جو بعض ذہنوں میں خلجان پیدا کرتے ہیں، "مطالعۂ حدیث" میں تحقیقی جواب دیا ہے۔

مطالعۂ حدیث پندرہ عنوانات پر مشتمل ہے جو حسبِ ذیل ہیں:

۱- قرآنِ حکیم اور اطاعتِ رسول۔

۲- سنّت کن حقائق سے تعبیر ہے؟

۳- سنّت عہدِ نبوی میں۔

۴- آنحضرت کا اسلوبِ دعوت وارشاد۔

۵- صحابہ اور تابعین کے دور میں علمِ حدیث کی اشاعت کا جذبہ۔

۶- صحابہ اور تابعین کے زمانے میں اشاعتِ حدیث کے اسباب و عوامل۔

۷- روایت کی دو قسمیں۔

۸- تدوینِ حدیث۔

۹- حدیث کے بارے میں فنِ جرح و تعدیل۔

۱۰- فتنۂ وضعِ حدیث اور محدثین کی مساعیِ جمیلہ۔

۱۱۔ اصطلاحاتِ حدیث۔

۱۲۔ علومِ حدیث۔

۱۳۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ۔

۱۴۔ امام زہریؒ۔

۱۵۔ کتبِ حدیث اور ان کے مؤلفین۔

مولانا کو حدیث وسنت سے قلبی شغف و محبت ہے اور منکرین و معترضینِ حدیث سے انتہائی نفرت۔! یہی جذبۂ صادقہ اور داعیۂ حق اس کتاب کی تصنیف کا باعث بنا۔

مطالعۂ حدیث ۲۱۵ صفحات پر محتوی ہے۔ مقدمہ اور فہرستِ مضامین کے بارہ صفحے اس کے علاوہ ہیں۔

پہلی دفعہ یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں طبع ہوئی۔

اساسیاتِ اسلام

مولانا محمد حنیف ندوی کی تصنیفات میں "اساسیاتِ اسلام" اس بنا پر نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مولانا نے تعبیر و استدلال کی ایک بالکل نئی اور خوش آئند روایت کی طرح ڈالی ہے۔ اِس دَور کا بنیادی سوال یہ ہے کہ موجودہ تحریکات اور رائج الوقت فلسفوں کے مقابلے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟ اور ان حالات میں اسلامی احکام کو کس نہج سے لوگوں کے قلب و روح میں اُتارا جا سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں عام طور پر دو اسلوب اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک معذرت خواہانہ اسلوب، جس میں فقط یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام علم و دانش کی مروّجہ تحریکات کا ہرگز مخالف نہیں۔ دوسرا اسلوب یہ ہے کہ مخالفانہ نظریات کو پورے زور سے ہدفِ تنقید ٹھہرایا جاتا ہے اور ان کے نقائص کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے کہ یہ نظریات چونکہ غلط ہیں، لہٰذا اسلام کا تصورِ حیات صحیح ہے۔

تعبیر و تشریح کے یہ دونوں اسلوب قرینِ صحت نہیں اور ان سے جدید تعلیم یافتہ لوگ قطعاً متاثر نہیں ہوتے، کیوں کہ اس سے یہ حقیقت واضح نہیں ہو پاتی کہ اسلام جو دنیا کا آخری اور فلاحِ انسانی کا ضامن مذہب ہے، فرد اور معاشرے کے تمام روحانی اور تہذیبی و ثقافتی مسائل کا سائنسی اور علمی زبان میں، متعیّن و مثبت اور ریچا تُلا حل پیش کرتا ہے۔ جواب کی ان دونوں نہجوں سے اسلام کی روحِ اجتہاد کا فعّال اور تخلیقی کردار بھی فکر و نظر کے زاویوں میں نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ معذرت خواہانہ انداز لوگوں پر کوئی اثر ڈال سکتا ہے اور نہ منفی انداز۔

مولانا حنیف ندوی نے "اساسیاتِ اسلام" میں جواب کی ان دونوں صورتوں سے ہٹ کر بات کی ہے اور اس اسلوب سے اسلامی احکام کو پیش کیا ہے کہ جس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں ہمارے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور روحانی مسائل کا حل بہ طریقِ احسن موجود ہے۔ اگر اس کے تمام پہلوؤں پر صدقِ دل سے غور کیا جائے اور ان کو محورِ عمل بنایا جائے تو پتا چلے گا کہ یہاں ہر شے موجود ہے۔ کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے جو یہ ہیں:

باب ۱ ۔ اساسیاتِ اسلام۔

باب ۲ ۔ کیا اساسی نہیں ہے۔

باب ۳ ۔ تعمیرِ فرد۔

باب ۴ ۔ نظریۂ توحید اور اس کی اساس۔

باب ۵ ۔ نماز اور اس کے اثرات۔

باب ۶ ۔ اسلام کا تصورِ ثقافت۔

باب ۷ ۔ اسلام اور اس کی سیاسی قدریں۔

باب ۸ ۔ اقتصادیات میں اسلام کا موقف۔

باب ۹ ۔ اسلام کا نظریۂ اخلاق۔

ہر باب کے تحت ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن کی تعداد ۱۹۴ ہے۔ مقدمہ اور فہرستِ مضامین سمیت کتاب ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اساسیاتِ اسلام پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

مسئلۂ اجتہاد

مولانا محمد حنیف ندوی نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں آنے کے بعد سب سے پہلی کتاب "مسئلۂ اجتہاد" تصنیف کی تھی۔ اس زمانے میں مولانا گوجرانوالہ میں قیام پذیر تھے اور روزانہ وہاں سے لاہور آتے تھے۔ اس موضوع پر اُن کی یہ نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام ایک مکمل اور ابدی ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام جہاں اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ توحید کیا ہے، دلوں میں ایمان کے داعیے کس طرح پیدا ہوتے ہیں، تقویٰ کیسے ابھرتا ہے اور کردار و سیرت کی تشکیل کے کیا ذرائع ہیں، وہاں اس میں اس بات کا بھی پورا اہتمام پایا جاتا ہے کہ بدلتے ہوئے اجتماعی اور معاشرتی حالات میں احکام و مسائل کی کیا شکل ہو۔ یعنی وہ کون سے اصول اور پیمانے ہیں جن پر قیاس اور اجتہاد کا قصرِ رفیع تعمیر ہوتا ہے۔ کتاب میں ان فقہی بنیادوں اور پیمانوں کی بھی تشریح کی گئی ہے، جن کی روشنی میں فقہِ جدید کی تدوین و ترتیب کا مسئلہ آسانی سے ذہن و فکر کی گرفت میں آجاتا ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ چھوٹے بڑے ۸۵ عنوانات پر مشتمل ہے اور ۲۴۸ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد اوّل)

علامہ ابوالحسن اشعری چوتھی صدی ہجری کی جلیل القدر شخصیت تھے جو ۲۶۰ھ کو بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ ہجری کے لگ بھگ بغداد میں جنّت کو سدھارے۔ وہ مسلسل چالیس برس تک اعتزال و جہمیت کی فتنہ سامانیوں کا شکار رہے۔ اس کے بعد اُن کے فکر و تعمّق نے ایسی انگڑائی لی کہ اعتزال و جہمیت کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور اجتہاد و کلام کا اپنا ایک علیحدہ اور منفرد دبستان سجایا۔ انھوں نے سو

سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں جو اپنے مضامین و محتویات کے اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

ان کی تصنیفات میں سے ایک مشہور ترین کتاب "مقالات الاسلامیین" ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ان کا وہ علمی شاہ کار ہے جسے افکار و نظریات کے دائرۃ المعارف سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس میں انھوں نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل یعنی اپنی زندگی تک ابھرنے والے وہ تمام عقائد و افکار بغیر کسی تعصب اور ذہنی تحفظ کے بیان کر دیے ہیں جو طویل عرصے تک مسلمانوں کے فکری مناظروں اور کلامی مجادلوں کا محور بنے رہے۔

کتاب کے مطالعہ سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمان نفسیات، اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کو منظر عام پر لائے ہیں، وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو قائم اور برقرار رکھا۔ آج آفتاب اسلام پوری طرح تابندہ و درخشندہ ہے اور تمام دنیا اس سے کسبِ ضیا کر رہی ہے اور وہ تمام گمراہیاں اور ضلالتیں جو کئی سو سال پیشتر اسلامی احکام کو ختم یا مجروح کرنے کے درپے تھیں، دنیا سے نابود ہو گئی ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے "مسلمانوں کے عقائد و افکار" کے نام سے اس عربی کتاب کو اُردو کا خلعت پہنا دیا ہے۔ زبان نہایت عمدہ ہے، جلد اوّل پر ۴۸ صفحات کا مقدمہ ہے۔ فہرستِ عنوانات، مقدمہ اور اشاریہ سمیت یہ جلد ۳۸۰ صفحات کو گھیرے ہوئے ہے۔ جلد اوّل ۱۹۶۸ کو معرضِ اشاعت میں آئی۔ کل عنوانات ۲۵ ہیں۔

مسلمانوں کے عقائد و افکار (جلد دوم)

یہ "مقالات الاسلامیین" کی جلد دوم کا اُردو ترجمہ ہے اور اس پر فاضل مترجم نے ۳۰ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ سرورق کے دو صفحے اور فہرستِ مضامین

کے بائیس صفحات شامل کر کے کتاب ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد کے کل عنوانات ۳۰۲ ہیں اور سنِ طباعت ۱۹۷۰ء ہے۔

سرگزشتِ غزالی

امام غزالی طوس کے ایک گاؤں میں ۴۵۰ھ کو پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ کو وفات پائی۔ ان کی تصنیفات میں "المنقذ من الضلال" کو اہلِ علم میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ غزالی کی دلچسپ اور دلآویز سرگزشت ہے جو انھوں نے خود اپنے قلم سے رقم کی۔ اس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ان کے نکرہ و ذہن میں کیوں تبدیلی پیدا ہوئی اور ان کے افکار کس طرح انقلاب و تغیر کی خوش خرام موجوں سے روشناس ہوئے۔ وہ جبّہ و عبا اور مسند و دستار کی نہایت شان دار زندگی بسر کر رہے تھے اور تعلیم و تعلّم کے ہنگاموں میں مشغول تھے کہ ان کے فہم و فراست نے اس اسلوب سے پلٹا کھایا کہ جبّہ و عبا اتار پھینکے اور دنیا سے بے زار ہو کر بادیہ پیمائی شروع کر دی۔ فقر و درویشی کی روش اختیار کر لی اور فلسفہ و حکمت کے میدانوں سے نکل کر کتاب و سنّت کی روح پرور وادی میں سکونت پذیر ہو گئے کہ اطمینانِ قلب اور سامانِ سکینت اسی میں ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ ذہنی و فکری انقلاب کیوں بپا ہوا؟ کتاب میں اس سوال کا مفصّل جواب دیا گیا ہے جو دل کی گہرائیوں میں اُترتا اور روح و ضمیر میں پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔

غزالی نے المنقذ من الضلال میں اپنے وقت کی تمام مروّجہ مذہبی و فکری تحریکات کا کھل کر جائزہ لیا ہے اور اذعان و یقین کی ان بنیادوں کی نشان دہی کی ہے جو کتاب و سنّت سے ہم آہنگ اور مسلکِ سلف سے ہم دوش ہیں۔

کتاب میں نفسیات، فلسفہ، منطق، تنقید، تمام چیزیں انتہائی اعتدال و توازن کے ساتھ موجود ہیں اور قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں تصوّرِ نبوت کو نہایت معقول، بے حد سلجھے ہوئے اور بہ درجہ غایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

غزالی کے دور میں تعلیمیہ اور قرامطہ (جنھیں باطنیہ بھی کہا جاتا ہے) کا فتنہ زوروں

پر تھا اور انہی کے عقائد و تصورات کی خطرناکیوں سے اثر پذیر ہو کر انھوں نے یہ کتاب سپردِ قلم کی۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ کون تھے؟ ان کے عقائد و افکار کیا تھے؟ ان میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور فکر و فلسفہ میں انھوں نے کیا اضافہ کیا؟

مولانا محمد حنیف ندوی نے "المنقذ من الضلال" کا "سرگزشتِ غزالی" کے نام سے ترجمہ کیا ہے اور اس پر ۸۹ صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں اس دور کی فکری تفصیلات اور غزالی کے قدیم رجحانات کو اجاگر کیا ہے، نیز ان میں تبدیلی کے وجوہ و اسباب اور ان کے فلسفہ و حکمت کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ مع فہرستِ مضامین اور مقدمے کے کتاب ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اُردو ترجمہ اتنا جان دار اور دلکش ہے کہ اگر غزالی زندہ ہوتے اور اس ترجمے کا مطالعہ کرتے تو زیادہ نہیں تو اسے اپنی عربی کتاب کے برابر ضروری جگہ دیتے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں چھپی تھی۔

افکارِ غزالی

امام غزالی سے مولانا محمد حنیف ندوی کو خاص تعلقِ خاطر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں انھوں نے تین کتابیں لکھیں، ایک افکارِ غزالی، دوسری تعلیماتِ غزالی اور تیسری سرگزشتِ غزالی۔ تعلیماتِ غزالی، "احیاء علوم الدین" کے بعض ابواب کی تلخیص ہے، سرگزشتِ غزالی "المنقذ من الضلال" کا ترجمہ ہے اور افکارِ غزالی میں "احیاء علوم الدین" کے مضامین و مشمولات کا خلاصہ اور اختصار بیان کر دیا گیا ہے۔ ان تینوں کتابوں پر علیحدہ علیحدہ مبسوط مقدمات تحریر کیے گئے ہیں جو اپنی جگہ مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ افکارِ غزالی کا مقدمہ ۱۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرگزشتِ غزالی کا مقدمہ ۸۹ صفحات پر محتوی ہے اور تعلیماتِ غزالی کا مقدمہ ۱۰۳ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح ہر مقدمہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کتبِ ثلاثہ میں باعتبارِ ترتیبِ تصنیف کے پہلا نمبر افکارِ غزالی کا، دوسرا سرگزشتِ غزالی کا اور تیسرا تعلیماتِ غزالی کا ہے۔

جیساکہ پہلے بتایا گیا "افکارِ غزالی"، احیاء علوم الدین کے بعض اہم مضامین کا خلاصہ ہے ___ اس کے بڑے بڑے عنوان یہ ہیں: فضائلِ علم، قلب کی موت، حصولِ علم کے فضائل، تعلیم، علم کے محامد شواہد عقلیہ کی روشنی میں، وہ علوم جن کا سیکھنا فرضِ کفایہ ہے، علم المکاشفہ اور علم المعاملہ، مشاغلیاتِ علم الکلام، ائمہ فقہ کا زہد و ورع، مضر علوم، وہ الفاظ و مصطلحات جن کے معنوں میں تغیر و تبدل ہوا ہے، بحث و جدل سے لوگوں کی دلچسپی کے اسباب و وجوہ اور اس کے شرائط، بحث و مناظرہ سے کیا کیا نفسی برائیاں پیدا ہوتی ہیں، استاد اور شاگرد کے آداب، ارشاد و تعلیم کی ذمہ داریاں، عقل اور اس کی قسمیں، مدارکِ عقل میں تفاوت، عقائد کی تفصیل، عقائد کی تلقین میں تدریج کا لحاظ، ظاہر و باطن کی تقسیم، ظاہر و باطن میں فرق کی نوعیت، ایمانیات میں پہلا رکن توحید، دوسرا رکن اللہ کی صفات، تیسرا رکن اللہ کے افعال کا علم، چوتھا رکن سمعیات، ایمان اور اسلام کے اطلاقات، کیا ایمان میں کمی بیشی ممکن ہے؟ ایمانیات میں استثنا کا استعمال ___ ان موٹے موٹے عنوانات میں بہت سے ضمنی عنوانات ہیں۔

احیاء علوم الدین کے ان ابواب میں امام غزالیؒ نے عقائدِ اسلامی کا پورا تجزیہ کیا ہے، تہذیب و اخلاق کے تمام گوشوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ایمان کی گتھیوں کو سلجھایا ہے، عبادات کی روح متعین کی ہے اور ان کی تہہ میں جو فلسفہ کار فرما ہے، اس کی نشان دہی کی ہے، معاملات کی وضاحت فرمائی ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی دینِ اسلام کی ایسی دلآویز تشریح کی ہے کہ جس سے الحاد و زندقہ کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور احکامِ دین میں جو روشنی پنہاں ہے، وہ پوری آب و تاب کے ساتھ قلب و نظر میں سما جاتی ہے۔

مولانا ندوی کی اپنی زبان اور اپنا انداز ہے جو انھی کے ساتھ مخصوص ہے۔ انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے غزالی کے ان مضامین کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔

مقدمۂ کتاب میں، جو ۱۱۳ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا نے امام غزالی کے حالات و سوانح پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ان کے خیالات و افکار کی اہمیت بیان کی ہے اور

علمی دنیا میں ان کے مقام و مرتبے کی وضاحت کی ہے۔

فہرستِ مضامین کے سولہ صفحات سمیت کتاب ۵۱۴ صفحات پر محیط ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۶ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

تعلیماتِ غزالی

امام غزالی کی مشہور تصنیف "احیاء علوم الدین" حلقۂ اہلِ علم اور اصحابِ تصوّف میں ہمیشہ متداول رہی ہے۔ غزالی نے اس کتاب میں ارکانِ دین، احکامِ اسلام، رموزِ تصوف اور فرامینِ الٰہی کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں کیا اسرار پنہاں ہیں اور کس رکنِ دین کی بجاآوری میں کیا فلسفہ و حکمت کار فرما ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے غزالی کی اس معرکۃ الآرا کتاب کے گیارہ ابواب کی تلخیص کی ہے اور وہ ابواب یہ ہیں:

۱۔ ابوابِ صلوٰۃ۔
۲۔ ابوابِ زکوٰۃ۔
۳۔ حدیثِ صوم۔
۴۔ اسرارِ حج۔
۵۔ ذکر و دعا۔
۶۔ تہذیب و آداب۔
۷۔ نکاح و معاشرت۔
۸۔ محبت و اخوت۔
۹۔ معاملات۔
۱۰۔ فہمِ قرآن۔
۱۱۔ تفسیر بالرائے۔

احیاء علوم الدین کے یہ انتہائی اہم اور بنیادی ابواب ہیں۔ مولانا نے نہایت شگفتہ زبان میں اُن کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور اس کو "تعلیماتِ غزالی"

کے دل کش نام سے مرتب کیا ہے۔

کتاب پر ۱۰۳ صفحات کا مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں تصوّف کے رموز و نکات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مقدمے میں بتایا گیا ہے کہ تصوف جو ذوق و وجدان کا قیمتی سرمایہ ہے، تزکیۂ باطن اور تعمیرِ سیرت کے اعتبار سے کن اہمیتوں کا حامل ہے اور ارتقا کے کن کن مراحل سے دوچار ہوا ہے۔ اس کے مشائخ کون کون ہیں اور اس کی اصطلاحات کیا ہیں۔ نیز اس سے وارداتِ قلب کی کن کیفیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اپنے مندرجات و مشمولات کے اعتبار سے "تعلیماتِ غزالی" نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس کے گیارہ ابواب میں جو اوپر درج کیے گئے ہیں، بہت سے ضمنی عنوانات بھی ہیں۔

تعلیماتِ غزالی کا پہلا ایڈیشن جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا، ۵۶۰ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فہرستِ مضامین کے سات صفحے اس کے علاوہ ہیں۔

تہافت الفلاسفہ (تلخیص و تفہیم)

غزالی اور ابنِ رشد دونوں نے حکمت و فلسفہ کے امام و مجتہد کی حیثیت سے شہرت پائی۔ غزالی کی تصنیفات میں سے ایک مشہور کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" ہے اور ابن رُشد کی قابلِ قدر فلسفیانہ تصنیفات میں سے ایک بہت معروف تصنیف تہافتہ التہافہ ہے جو انھوں نے غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کے جواب میں لکھی۔ یہ دونوں کتابیں اسلامی عقائد و افکار کے سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں یونانی فلسفے اور انسانی فکر و کاوش کی کمزوری اور درماندگی کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسانی فکر اور عقیدے کی اپنی منطق اور فہم و استدلال کا اپنا اسلوب ہے، جس کو صرف اسی کی روشنی میں سمجھنا ممکن ہے۔

ابنِ رشد نے اس کے جواب میں تہافتہ التہافہ لکھی، جس میں یونانی فلسفے کی رُو سے غزالی کے اعتراضات کا خالص فلسفیانہ زبان میں جواب دیا — اپنے موضوع کے اعتبار سے دونوں کتابیں اصحابِ فلسفہ کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور نہایت

دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے غزالی کے شاہ کار "تہافت الفلاسفہ" کی نہایت شگفتہ اور رواں دواں اردو میں تلخیص و تفہیم کی ہے۔ علاوہ ازیں اس پر ایک طویل اور شان دار مقدمہ لکھا ہے، جس میں غزالی اور ابنِ رُشد کے افکار و خیالات پر جچا تُلا محاکمہ کیا ہے۔ اس محاکمے میں مولانا نے علامہ طوسی اور خواجہ زادہ کے تاریخی محاکموں سے بھی استفادہ کیا ہے اور موجودہ فلسفے کے رجحانات کو بھی پیشِ نگاہ رکھا ہے، اور پھر اپنی آرا کا بھی خاص انداز سے اظہار کیا ہے۔

اسلامی فلسفے کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے والے حضرات کے لیے مولانا کی یہ کوشش نہایت قیمتی دستاویز ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یونانی فلسفے نے اسلامی علمِ کلام کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی فکر و نظر کی سطح پر اُبھرتی ہے کہ مسلمان حکما و متکلمین نے یونانی افکار و تصوّرات کے کن کن گوشوں میں مجتہدانہ اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں فکر و نظر کی ان نئی جہتوں کی بھی نشان دہی ہوتی ہے، جن کی روشنی میں جدید علمِ کلام کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔

مولانا نے اس کتاب میں بیس فلسفیانہ مباحث و مسائل کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ قدمِ عالم کا ابطال۔

۲۔ ابدیتِ عالم کا ابطال۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کو اس عالم کا صانع اور فاعل قرار دینے کے معاملے میں حکما کی ابلہ فریبی۔

۴۔ وجودِ صانع کے بارے میں حکما کی بے چارگی۔

۵۔ اثباتِ توحید کے بارے میں حکما کی ناکامی۔

۶۔ کیا مسئلہ ذات و صفات کی دوئی کثرت کا سبب ہے؟

۷۔ کثرت و تعدّد کا دوسرا سبب

۸۔ کثرت و تعدّد کا تیسرا سبب۔

۹۔ کثرت و تعدّد کا چوتھا سبب۔

۱۰۔ حکما اثباتِ صانع سے قاصر ہیں۔
۱۱۔ حکما یہ بات نہیں ثابت کر سکتے کہ مبدأِ اوّل تمام کائنات کے بارے میں ادراکِ کلّی رکھتا ہے۔
۱۲۔ حکما مبدأِ اوّل سے متعلق اس حقیقت کا اثبات بھی نہیں کر سکتے کہ اس کو ادراکِ ذات حاصل ہے۔
۱۳۔ اس بات کی تردید کہ اللہ تعالیٰ جزئیاتِ زمانی سے آگاہ نہیں۔
۱۴۔ حکما اپنے اس دعوے کو ثابت نہیں کر سکتے کہ آسمان ایک حیوان ہے جو اپنی حرکتِ دوریہ سے اللہ کے حکم کی اطاعت میں مصروف ہے۔
۱۵۔ حکما نے حرکتِ افلاک کے جس محرک وغایت کی نشان دہی کی ہے، وہ باطل ہے۔
۱۶۔ یہ بات غلط ہے کہ نفوسِ سماوی تمام جزئیات کو جانتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ لوحِ محفوظ سے مراد نفوسِ سماویہ ہیں۔
۱۷۔ اسباب ومسبّبات میں رشتہ وتعلّق کی نوعیت۔
۱۸۔ انسانی وحیوانی قویٰ کی تفصیل۔
۱۹۔ حکما کا یہ دعویٰ کہ نفوسِ انسانی سرمدیّت کے حامل ہیں۔
۲۰۔ حکما کی رُو سے نفس و روح کا انجام۔

یہ کل بیس فلسفیانہ مسئلے ہیں۔ ان میں سے ہر مسئلے کے الگ الگ ضمنی اور ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

کتاب ۲۱۹ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۸۸ صفحات کا مقدمہ شامل ہے۔ فہرستِ مضامین کے چھ صفحے اس کے علاوہ ہیں۔ اس طرح کل ۲۲۵ صفحے بنتے ہیں۔

مولانا ندوی کی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۴ء میں چھپی۔

عقلیاتِ ابنِ تیمیہ

مولانا کو متقدمین میں سے جن حضرات سے قلبی لگاؤ ہے، ان میں ایک امام ابنِ تیمیہ

ہیں جو علم و کمال اور عمل و سیرت کے اعتبار سے ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا ان کی تصنیفات، افکار و نظریات اور عقائد و تصورات سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کے منطق و فلسفہ کی علمی فراوانیوں کا بھی ان پر انتہائی اثر ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے امام کے حالات و سوانح سے زیادہ تعرض نہیں کیا کہ اس ضمن میں تین چار کتابیں معرضِ اشاعت میں آچکی ہیں۔ مولانا نے اپنی طبعِ مشکل پسند کے مطابق صرف امام کی منطق و عقلیات اور فلسفہ و حکمت کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے کہ اس پر اردو میں (یا غالباً کسی زبان میں بھی) کوئی کام نہیں ہوسکا۔ کوئی شک نہیں کہ امام ابنِ تیمیہ سے متعلق اس موضوع پر مولانا کا یہ اوّلین کارنامہ ہے۔

امام ابنِ تیمیہ اپنے دور کے بہت بڑے مفسر، جلیل القدر محدث، فقہ و اصول کے امام اور منطق و فلسفہ میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ ۱۰ ربیع الاوّل ۶۶۱ھ کو حرّان میں پیدا ہوئے اور ۲۸۔ ذی قعدہ ۷۲۸ھ کو وفات پائی۔ ان کا نام احمد، لقب تقی الدین اور کنیت ابو العباس تھی۔ ان کے حالات و سوانح میں عربی اور اردو وغیرہ زبانوں میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

امام ابنِ تیمیہ کی جامعیتِ تحقیق و ادراک کے دائرے نہایت وسیع بلکہ ہمہ گیر ہیں۔ امام غزالی کے بعد یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام کے نظامِ حیات کا انتہائی دقتِ نظر سے جائزہ لیا اور بتایا کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور اصول کی تشریح و تبیین میں کن امور کو پیشِ نگاہ رکھنا ضروری ہے اور یہ کہ علمِ کلام یا عقائد میں وہ کون کون سے موڑ ہیں، جہاں مسلمانوں کے فکر و بصر کے قافلوں نے یونانی تہذیب و ثقافت کی پرانی اور پٹی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اپنے لیے جداگانہ اور منفرد راستہ اختیار کیا۔

امام ابنِ تیمیہ وہ مردِ مجاہد ہیں جن کی حیاتِ مستعار کا ایک ایک لمحہ الحاد و زندقہ کے خلاف جہاد میں بسر ہوا۔ انھوں نے جس کامیابی اور حسنِ تدبیر سے کتاب و سنّت کے رخِ زیبا کو نکھارا، بدعات کی پُر زور تردید کی اور اسلام کے چہرۂ روشن سے یونانیت

اور عجمیت کے دبیز نقابوں کو ہٹایا، یہ انہی کا حصہ ہے۔

وہ جامعیتِ علم و فضل اور وسعتِ فکر و نظر کی بنا پر اپنے عہد کے عظیم مجدد اور بہت بڑے مصلح تھے۔ ان کے گوناگوں کارناموں میں ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی "عقلیات" کو کمال ژرف نگاہی سے کھنگالا اور تنقید و احتساب کی کسوٹی پر پرکھا اور ثابت کیا کہ اس کے مقابلے میں اسلام کا عقلی موقف کہیں زیادہ صحیح، کہیں زیادہ استوار اور متوازن ہے ۔۔۔ مولانا ندوی نے "عقلیاتِ ابنِ تیمیہ" میں اسی کی وضاحت کی ہے۔

یہ کتاب آٹھ فصلوں پر محتوی ہے اور ہر فصل میں الگ الگ ضمنی عنوانات قائم کیے گئے ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۱۴۸ ہے۔ فہرستِ مضامین اور مقدمے سمیت یہ کتاب ۳۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں امام ابنِ تیمیہ کی منطق و عقلیات سے متعلق یہ اوّلین کتاب ہے ۔۔۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۶ میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے اہتمام میں شائع ہوئی۔

افکارِ ابنِ خلدون

بہ اعتبار ترتیب کے مولانا کی یہ دوسری کتاب ہے جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی۔

ابنِ خلدون عمرانیات و اجتماعیات کے ماہر اور تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے عدیم المثال عالم تھے۔ ان کی "تاریخ ابنِ خلدون" نے جو شہرت حاصل کی، اس سے کہیں زیادہ "مقدمہ ابنِ خلدون" نے تداول و قبولیت کی منزلیں طے کیں۔

ابنِ خلدون ماہ رمضان ۷۳۲ھ کو تیونس میں پیدا ہوئے اور ۸۰۸ھ کو وفات پائی۔ انھوں نے بھرپور زندگی گزاری، بہت سی اونچی شخصیتوں سے تعلقات استوار کیے، بعض ملوک و سلاطین سے روابط بڑھائے، کئی ملکوں کی سیاسیات میں دخیل ہوئے اور ان میں عجیب و غریب کردار ادا کیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے "افکار ابنِ خلدون" میں مقدمہ ابنِ خلدون کے

بعض اہم حصوں کو خلعتِ اُردو سے مفتخر کیا ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ تاریخ کیا ہے؟
۲۔ انسان مدنی الطبع ہے۔
۳۔ موسم وہوا کا اثر اخلاق واطوار پر۔
۴۔ غذا کی فراوانی وعمدگی اور ردایت وکمی کا اخلاق پر اثر۔
۵۔ نبوت کے علائم وخصوصیات۔
۶۔ حقیقتِ نبوت۔
۷۔ دیہاتی اور شہری کی تقسیم معاشی وثقافتی ہے۔
۸۔ اہلِ بادیہ کی اوّلیت۔
۹۔ سادہ زندگی میں خیر کے پہلو زیادہ قوی ہیں۔
۱۰۔ انسان اپنے حالات کا نتیجہ ہے۔
۱۱۔ احکام کی جبریہ پیروی سے نفسِ انسانی ذلیل ہو جاتا ہے۔
۱۲۔ عصبیّت کی اخلاقی اہمیت۔
۱۳۔ تہذیب وثقافت کا اثر شجاعت وبسالت پر۔
۱۴۔ تقلیدِ اقوام اور ان کا فلسفہ۔
۱۵۔ عرب۔
۱۶۔ عربوں میں اصلاح کا ایک ہی انداز تھا۔
۱۷۔ دین سے سیاسی قوت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔
۱۸۔ توسیع مملکت کی طبعی حد۔
۱۹۔ اشخاص کی طرح سلطنت وریاست کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔
۲۰۔ گزشتہ قومیں جسمانی قوتوں کے اعتبار سے ہم سے زیادہ مختلف نہیں تھیں۔
۲۱۔ بادشاہ، اس کی تعریف اور ضروری اوصاف۔
۲۲۔ حکومت کی تین صورتیں ــــــ ملوکیت، سیاستِ عقلی اور خلافت۔

۲۳۔ خلافت کے شرائطِ انعقاد۔

۲۴۔ خلافت، ملوکیت کی طرف کیوں لوٹی؟۔

۲۵۔ عہدِ صحابہ کی لڑائیاں اور ان کا دینی موقف۔

۲۶۔ عہدِ خلافت کے بڑے بڑے دینی عہدے۔

۲۷۔ احتساب کے حدود اسلامی حکومت میں۔

۲۸۔ خلافت کے مختلف القاب کیوں کر پیدا ہوئے؟

۲۹۔ محصولات کی کثرت عمرانی کوششوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

۳۰۔ ظلم سے عمرانی تگ و دو میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

۳۱۔ رزق کی حقیقت۔

۳۲۔ علوم و فنون کی تحصیل انسان کا فطری تقاضا ہے۔

۳۳۔ تعلیم کا فطری طریق۔

۳۴۔ تعلیمی سختی سے بچوں میں اخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۳۵۔ ایک ہی فن میں شروح و حواشی کی کثرت علم کے لیے سخت مضر ہے۔

۳۶۔ اختصارِ فنون کا عیب۔

۳۷۔ تفسیر اور اس کی قسمیں۔

۳۸۔ علومِ حدیث۔

۳۹۔ ائمۂ فقہ۔

۴۰۔ فقہ و قیاس کی شرعی بنیادیں۔

۴۱۔ علمِ کلام۔

۴۲۔ تصوف۔

یہ موٹے موٹے بیالیس عنوانات ہیں جو مولانا ندوی نے ترجمے کے لیے مقدمہ ابنِ خلدون سے منتخب کیے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا معیارِ اخذ و انتخاب کتنا اونچا، کس قدر صحیح اور اپنے اندر کس درجے استحکام اور استواری لیے ہوئے

ہے۔ ان عنوانات میں بہت سے ضمنی عنوانات بھی ہیں۔

زبان اتنی صاف، شگفتہ اور سلیس ہے کہ قاری کو کہیں شبہ نہیں پڑتا کہ یہ ترجمہ ہے۔

افکار ابنِ خلدون پر اکہتر[1] صفحات کا مبسوط مقدمہ ہے، جس میں ابنِ خلدون کے حالات و سوانح، ان کے افکار و نظریات اور ان کی اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ عمرانیات و اجتماعیات میں ان کا مرتبہ کتنا بلند تھا، مختلف ملکوں کی سیاسیات میں انھوں نے کیا کردار ادا کیا، تاریخ کے تسلسل کو کس قدر آگے بڑھایا اور اس میں کن نئی قدروں کا اضافہ کیا۔

غرض مولانا نے ابنِ خلدون کی سرگزشتِ حیات کے تمام پہلوؤں کو مقدمۂ کتاب میں اجاگر کیا اور ان کے خیالات و تصورات کے ہر گوشے کا کھل کر تجزیہ کیا ہے اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے، جس کے خود اپنی نظر و بصر کے زاویے وسعت پذیر ہوں اور اس کے علم و مطالعہ کا دامن ہر سُو پھیلا ہوا ہو۔ بحمد اللہ مولانا محمد حنیف ندوی ان اوصاف سے پوری طرح متصف ہیں اور اس نوع کی خدمتِ علمی بہ طریقِ احسن سرانجام دینے کا کامل استحقاق رکھتے ہیں۔

"افکار ابن خلدون" پہلی دفعہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی ــــ فہرستِ مضامین اور مقدمے سمیت یہ کتاب ۲۳۳ صفحات پر محتوی ہے۔

مکتوبِ مدنی

الٰہیات کے سلسلے میں یہ بحث خاص طور سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور کائنات میں ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس ضمن میں ابن عربی نے "وحدتِ وجود" کا نظریہ پیش کیا ہے، جس کا دو لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ بحرِ وجود دراصل ایک ہے اور تمام کائنات اسی بحرِ بیکراں کی موجیں ہیں۔

مجدد الف ثانی نے اس کے مقابلے میں "نظریۂ شہود" کی وضاحت کی ہے، جس میں دو وجود ہیں۔ ایک مادی دنیا کا اور دوسرا حقیقتِ ورارالورا کا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان دونوں نظریوں کے درمیان تطبیق دینے

کی کوشش کی ہے۔ شاہ صاحب سے اس دور کے مشہور عالم اسماعیل بن عبداللہ آفندی رومی مدنی نے اس سلسلے میں سوال کیا تو انھوں نے بذریعہ مکتوب اس کا تفصیلی جواب دیا جو کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مکتوب عربی زبان میں ہے اور "مکتوبِ مدنی" کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا حنیف ندوی نے شاہ صاحب کی اس اہم علمی کاوش کا شگفتہ اور سلیس اردو ترجمہ کردیا ہے۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔

"مکتوبِ مدنی" ۳۶ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ اسے ۱۹۶۵ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع کیا گیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی کی یہ پندرہ کتابیں ہیں، جن کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ کتابیں چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ تمام کتابیں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے اہتمام میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ادارے کے لیے (۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۶ء تک) مولانا کی پینتیس سالہ خدمات کا یہ عظیم القدر نتیجہ ہے۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے دو ماہانہ رسالوں —— ثقافت اور المعارف —— میں ان کے بہت سے مطبوعہ مضامین اور لسان القرآن کی تیسری جلد کے ایک سو غیر مطبوعہ صفحات اس کے علاوہ ہیں۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے انسلاک کے بعد مولانا تین مرتبہ شدید بیماری سے دوچار ہوئے۔

پہلی مرتبہ ۷۱-۱۹۷۲ء میں ان پر تبخیر کا حملہ ہوا، جس کی وجہ سے دس گیارہ مہینے صاحبِ فراش رہے اور کوئی کام نہیں کر پائے۔

دوسری مرتبہ ۷۶-۱۹۷۷ء میں بیمار ہوئے اور سات آٹھ مہینے بیمار رہے۔ اس اثنا میں بھی کوئی تحریری کام نہیں ہوسکا۔

اب تقریباً ایک سال سے پھر بیمار ہیں۔ نہ لکھنے پڑھنے کی ہمت باقی رہی ہے اور

نہ چلنے پھرنے کی سکت۔! ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور یونانی ہر قسم کے علاج کرائے اور لاہور کے مشہور معالجوں کے زیرِ علاج رہے، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو مولانا علاج کے لیے لندن گئے۔ ان کی صاحب زادی وردہ ضیا وہاں مقیم ہیں۔ لندن جا کر پہلے مثانے کے سپیشلسٹ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا۔ اس لیے کہ لاہور کے ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق انھیں مثانے کی تکلیف تھی۔ لیکن لندن کے ڈاکٹر نے تمام ٹیسٹ مکمل کرنے کے بعد بتایا کہ مثانے کی تکلیف نہیں ہے، معدے کی تکلیف ہے۔ اب اس کی ہدایت کے مطابق معدے اور آنتوں کے ماہر سے رجوع کیا گیا تو پتا چلا کہ جو آنت معدے کو غذا پہنچاتی ہے وہ سکڑ گئی ہے۔ جب وہ کھلتی ہے تو افاقہ ہو جاتا ہے اور جب بند ہو جاتی ہے تو تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا اس آنت کا علاج ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ڈاکٹر نے دوائیں لکھ دی ہیں اور خوراک وغیرہ کے سلسلے میں ہدایات دے دی ہیں اور مولانا ۷ جنوری ۱۹۸۷ء کو لاہور واپس آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق علاج ہو رہا ہے۔

مولانا ندوی نے ۱۹۷۹ء میں "لسان القرآن" کے کام کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر اکہتر برس کی تھی۔ آغازِ کار ہی میں مجھ سے کہا کہ یہ اہم کام عمر کے آخری حصے میں شروع کر رہا ہوں اور قلب وضمیر کی شدید طلب سے مجبور ہو کر کر رہا ہوں۔ دعا کرو، اللہ تعالیٰ میری یہ دلی تمنا قبول فرمائے اور یہ اہم کام بخیر وخوبی اختتام پذیر ہو۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق بے تکلفی سے عرض کیا کہ شیر شاہ سوری ستر سال کی عمر میں ہندوستان کا بادشاہ بنا تھا، جب کہ اس کی زندگی کا سایہ ڈھل چکا تھا۔ وہ آئینہ دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ "مجھے اس وقت حکومت ملی، جب میری زندگی کی شام ہو چکی ہے۔" اس کا دورِ حکومت صرف پانچ سال پر مشتمل ہے، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے بے پناہ کام کیا اور ہندوستان میں ایک بالکل نئے طریقِ حکومت اور انوکھے اسلوبِ حکمرانی کی طرح ڈالی، جسے برصغیر کی تاریخِ سیاست میں ایک اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا، گھبرایئے نہیں، اللہ تعالیٰ آپ سے بھی ان شاء اللہ مزید بہترین کام لے گا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا حنیف ندوی کو شفائے کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے اور لسان القرآن

کے اہم کام کو مکمل کرنے کی توفیق سے نوازے جو انھوں نے اپنے قلب وضمیر کی شدید خواہش کے تحت شروع کیا ہے اور جس کی تمنائے تکمیل کا جذبہ ان کے دل گہرائیوں میں بدرجہ غایت شدت سے مچل رہا ہے۔ آمین یا ارحم الراحمین۔ واشف انت الشافی لاشفاء الاشفاءك، شفاء لایغادر سقما اذهب الباس رب الناس۔

تفسیر سراج البیان

محمد سعید الرحمٰن علوی

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی ہمارے سراپا اخلاص دوست ہیں۔ ۳۰ ر جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے جب مولانا محمد حنیف ندوی کے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا گیا تو مقالہ نگاروں کی فہرست میں علوی صاحب کا اسمِ گرامی بھی شامل تھا۔ مولانا کی تفسیر سراج البیان پر مضمون لکھنا نہایت ضروری تھا۔ یہ موضوع علوی صاحب کے ذمے لگایا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل تھا اور کوئی دوسرا شخص یہ خدمت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ علوی صاحب نے (جیساکہ آئندہ سطور سے پتا چلتا ہے) مضمون کی تکمیل کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی اور نہایت محنت سے یہ مضمون سپردِ قلم فرمایا۔ اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین۔

(مرتب)

۱۴۰۴ھ کے رمضان المبارک کی کوئی تاریخ تھی کہ مَیں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ گیا، یہ جانا میرے معمول کا حصہ تھا کیونکہ میں جن اداروں اور شخصیات سے ربط و ضبط رکھتا ہوں، ان سے ملاقات کی غرض سے گاہ بگاہ جانا میری زندگی کا معمول ہے ـــــ اس ادارے میں مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا محمد اسحاق بھٹی دو ایسے محترم بزرگ ہیں جن سے میری سالہا سال سے یاد اللہ ہے، ان سے علمی استفادہ اور رسمی و غیر رسمی ملاقات مجھے مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ضرور ادھر لے آتی ہے۔ ان کے علاوہ باقی انتظامی عملہ اور دوسرے حضرات بھی

محبت سے پیش آتے ہیں اور مجھے بھی ان سے ایک گونہ اُنس ہے۔

ادارے کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر صاحب سے بھی متعدد وجوہ سے میرا تعلق ہے اور ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ میں نے وہاں یہ مژدۂ جانفزا سنا کہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے سینئر ترین رکن اور متعدد کتبِ علمیہ کے مصنف مولانا محمد حنیف ندوی کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ میرے لیے یہ خبر نہایت خوش کن تھی۔ ابو سعید بزمی مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق اپنے تجزیاتی مضامین میں یہ شکوہ کیا تھا کہ ہماری قوم بدقسمتی سے مردہ پرست واقع ہوئی ہے، زندوں کی اس کے یہاں کوئی قدر نہیں ـــــ حالات کو دیکھ کر اس کا احساس مجھے بھی تھا، اس لیے ایک زندہ و سلامت علمی شخصیت کے لیے اس قسم کی تقریب بہت بڑی خوشی کا باعث تھی۔

پڑوسی ملک ہندوستان میں اس قسم کے واقعات رونما ہو چکے ہیں جن میں سے دو تقریبوں کی تحریری رپورٹ مطبوعہ شکل میں میرے سامنے موجود ہے، یعنی ہندوستان کے مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے اعزاز میں ہونے والی تقریب جو "نذرِ ذاکر" کے نام سے شائع ہوئی اور آزاد ساہتیہ اکیڈمی کے سربراہ مالک رام صاحب کے سلسلے کی تقریب جو "ارمغانِ مالک" کے نام سے طبع ہوئی اور میرے مرحوم بزرگ پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی نے مجھے عنایت فرمائی۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے اربابِ حل و عقد کا اس قسم کی تقریب کا اہتمام یقیناً ایک حوصلہ افزا کام تھا اور اس ملک میں ایک عالمِ دین سے متعلق یہ اپنی نوع کی پہلی تقریب ہے جس پر یہ حضرات بجا طور پر مستحقِ تبریک ہیں۔ مولانا ندوی کے بارے میں تقریب کی روح پرور خبر سنانے کے ساتھ ہی یہ بات سامنے آئی کہ جن حضرات گرامی کو اس سلسلے میں مقالات کی زحمت دی جا رہی ہے اس میں میرا نام بھی شامل ہے۔

یہ بات ادارے کی طرف سے بطور نمائندگی میرے محترم دوست محمد اسحاق بھٹی صاحب نے فرمائی، جس سے میں سخت حیران ہوا۔ میرے سامنے اگرچہ اپنی کم علمی کے تمام ابواب وا تھے اور مَیں سوچ رہا تھا کہ اربابِ ادارہ نے ایسا کیوں سوچا؟ لیکن نصرتِ خداوندی کی

امید پریس نے "ہاں" کر لی ـــــ بھٹی صاحب نے کہا کہ مولانا کی وہ چیزیں جو ادارے سے انسلاک سے قبل اشاعت پذیر ہو چکی ہیں ان پر کام ہونا چاہیے ـــــ ساتھ ہی انھوں نے فرمایا کہ ملک سراج الدین اینڈ سنز تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور کی طرف سے ایک زمانے میں مولانا کی تفسیر قرآن شائع ہوئی تھی ـــــ تفسیر قرآن کا لفظ سن کر مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، اپنے گھریلو ماحول کے اعتبار سے قرآن عزیز سے مجھے خاص لگاؤ ہے، اس کی مختلف تفاسیر کو دیکھنا اور ان سے استفادہ کرنا میرا خاص ذوق ہے ـــــ لسان القرآن کے نام سے مولانا کی جو کتاب ابھی تھوڑا عرصہ قبل ادارے کی طرف سے چھپی ہے اس نے مجھے بے حد متاثر کیا ـــــ میں نے ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور کی اشاعت مجریہ ۱۶ مارچ ۱۹۸۴ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

" مولانا چونکہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ عصر نبوت کے استحضار، زبانِ عربی پر کامل عبور اور قرآن سے بدرجہ غایت محبت کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں، اس لیے وہ دل و دماغ کی تمام وسعتوں کے ساتھ اس میدان میں اترے ہیں۔ انھوں نے حضور ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی سیرت کو کھنگالا اور پوری طرح زبانِ عربی پر عبور حاصل کیا اور بالآخر قرآن سے اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دیا کہ بس اب اسی کے ہو کر رہ گئے ـــــ وہ اس بات کو قطعاً تسلیم نہیں کرتے کہ ایک شخص چند تراجم کو سامنے رکھ کر یا مستشرقین کی تصریحات پڑھ کر فاضلِ قرآن ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن سے پہلے غیر قرآنی خم خانوں کو یکسر مٹا دیں اور اس کلامِ الٰہی کے اتھاہ سمندر میں اس طرح غوطہ زنی کریں کہ آپ کی روح میں وہ رچ بس جائے ـــــ تب قرآن اپنے خزانے آپ پر وا کرے گا۔"

یہ گفتگو لسان القرآن کے مقدمے کی ایک طرح کی تلخیص تھی جس میں مولانا کا پورا ذوقِ قرآنی آگیا ہے۔ اس لیے جب میں نے یہ سنا کہ مولانا کی تفسیر قرآن چھپی تھی تو دل میں یہ خیال چٹکیاں لینے لگا کہ لسان القرآن کے ۷۵ سالہ باہمت بوڑھے کے دورِ جوانی کی تفسیر ضرور دیکھنا چاہیے۔

میں نے مولانا ندوی سے استفسار کیا کہ "تفسیر آپ کے پاس تو ہو گی؟" مولانا نے جواب

دیا "نہیں"۔ یہ "نہیں" مجھ پر قیامت بن کر گری - اتنی محنت کرنے والے کے پاس بھی اپنا شاہکار نہیں تو پھر وہ کہاں ملے گی ــــ ؟ بھٹی صاحب سے معلوم کیا تو ان کا جواب بھی "نہیں" تھا ـــ بعض اہم شخصیات کے معاملے میں پوچھا جن سے توقع تھی تو ہر ایک کے متعلق ایک ہی جواب تھا کہ ان کے پاس نہیں ہے۔

اب میں نے پنجاب پبلک لائبریری کا رُخ کیا کہ شاید "بیت القرآن" کے ذخیرے میں موجود ہو، مگر وہاں بھی نہ تھی۔ لاہور میوزیم کی لائبریری گیا، لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ وہاں سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری گیا تو ایک کتاب دیکھی۔ کشمیری بازار جو کبھی لاہور میں علمی خزانوں کا واحد مرکز تھا، اس کی روایات کے مطابق، کتاب کا رنگ و روغن تھا ـــ بے تابی سے کتاب کھولی تو وہ فقط پارہ ۱۹ سے آخر تک تھی، گویا آخری بارہ پارے ـــ نمبر صفحات مسلسل تھے از ۸۶۵ تا ۱۴۴۸، ٹائیٹل وغیرہ کچھ نہ تھا۔ لائبریری کی سلپ پر "قرآن حکیم مع تفسیر سراج البیان" اور مولانا کا نام درج تھا۔

نمبر ح ۸۲ ت ۱۶، ۲۹۷ ــــ ۲۴۵۸

چند صفحات پڑھے، دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی کہ کچھ تو ہاتھ آیا۔ باہر نکلا تو سوچا کہ دیال سنگھ لائبریری دیکھتا چلوں، لیکن وہاں بھی مایوسی ہوئی ــــ قائداعظم لائبریری گیا، وہاں بھی تفسیر نہ ملی۔ دارالسلام لائبریری دیکھی، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگلے دن جب مولانا ندوی اور بھٹی صاحب سے تمام واقعہ بیان کیا تو وہ ایک جزو کے ملنے پر بے حد مسرور ہوئے۔ پوری تفسیر کے لیے گوجرانوالہ کے گرامی قدر علما مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالواحد علیہما الرحمہ کی لائبریریوں سے پتا کیا گیا تو وہاں بھی جواب نفی میں تھا ـــ ایک سہو ہم سے یہ ہوا کہ ہم نے اپنے طور پر کسی غلط فہمی کی بنا پر یہ طے کر لیا کہ ملک سراج الدین کی فرم ختم ہو چکی ہے، حالانکہ وہ قائم ہے۔

تیسرے دن بھاٹی دروازے کے قریب ملک جلال الدین وقف ہسپتال کی دکانوں میں ملک سراج الدین کا بورڈ نظر آیا، بے تابی سے اُدھر بڑھا تو وہاں سے جواب ملا کہ کشمیری بازار میں، صحیح بات وہاں سے معلوم ہو گی ـــ کشمیری بازار گیا تو سنہری مسجد سے چند قدم آگے

دائیں ہاتھ ایک بڑا سا بورڈ نظر آیا ــــ ملک سراج الدین ــــ آگے بڑھ کر دکان پر پہنچا، معاملہ ایک صاحب کے گوش گزار کیا تو انھوں نے کہا کہ ایسی تفسیر چھپی تو تھی لیکن میرے بڑے بھائی صاحب ہی صحیح بتائیں گے۔ اب شام ہو رہی ہے، وہ نہیں ملیں گے، آپ کل آئیں۔ پھر گیا اور مقصد بیان کیا تو وہ نہایت احترام سے پیش آئے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے بعض اجزا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے، یہ ہے "سراج البیان" جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ اب ختم ہو گئی ہے، اسے ہم پھر چھاپ رہے ہیں، انشاء اللہ تعالٰی جلد ہی چھپ جائے گی ــــ میں نے عرض کیا مجھے اس پر مضمون لکھنا ہے، پرانے ایڈیشن کا کوئی نسخہ فراہم ہو سکے تو نوازش ہوگی۔ جواب نفی میں تھا۔ البتہ پارہ ۱۳ سے ۱۸ تک کے اجزا ایک سے زائد تھے۔ وہ ایک جز مجھے بھی منگوا دیا کہ آپ استفادہ کر لیں، باقی اجزا بالکل نہیں ہیں۔ مکمل صرف ایک نسخہ ہے، جس کے ہم فوٹو لے رہے ہیں، یہ صاحب ملک عبدالرؤف تھے، ملک سراج الدین کے بڑے فرزند۔

ملک سراج الدین ۱۹۰۳ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ میں ملک سراج الدین اینڈ سنز کے نام سے کشمیری بازار میں دکان کھولی۔ تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں شائع کیں۔ ۸ مارچ ۱۹۸۴ کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

تفسیر کے سلسلے میں مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ شیخ محمد اشرف مرحوم (تاجر کتب) نے یہ تفسیر لکھوانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ انہی کے تقاضے سے مولانا نے کام شروع کیا، ابتدائی پندرہ پارے ڈیڑھ سال کے عرصے میں مکمل ہوئے ــــ شیخ صاحب نے مبلغ تین سو روپے مولانا کی نذر کیے ــــ مجھے یہ سن کر خیال آیا کہ پچھلے دور میں ایک لفظ "استحصال" کا بہت پرچا ہوا ــــ میرے خیال میں اصل استحصال صرف "اہل علم" کا ہوا ہے ــــ اس کی بے شمار مثالیں میرے سامنے ہیں، ذکر کا فائدہ نہیں ــــ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ "علم فروش" اور "اہل علم" میں بڑا فرق ہے۔ علم فروش تو ہر سطر اور لفظ کے دام کھرے کرتے ہیں، لیکن اہلِ علم کا معاملہ الگ ہوتا ہے ــــ بہرحال پندرہ پاروں کی تکمیل کے بعد ملک سراج الدین صاحب نے شیخ صاحب سے تقاضا کر کے یہ تفسیر خود لے لی اور باقی پندرہ پاروں

کی تکمیل کے لیے مولانا کو سری نگر کے قریب ایک صحت افزا مقام پر بھیج دیا ــــ کہا جاتا ہے کہ مبلغ ایک سو روپے مولانا کے سفر خرچ کے لیے ملک صاحب نے مرحمت فرمائے، صرف پچیس دن وہاں قیام رہا۔ لاہور سے مولانا کے بچے کی وفات کی اطلاع پہنچی تو مولانا واپس آگئے۔ لیکن پچیس دن میں پندرہ پارے مکمل ہو چکے تھے ــــ سبحان اللہ و بحمدہٖ۔

مولانا ندوی اور ملک عبدالرؤف تفسیر کے سالِ تکمیل کا صحیح طور سے تعین نہ کر سکے۔ ملک صاحب کا کہنا ہے کہ یہ ۱۹۳۴ اور ۱۹۴۰ کے درمیان کا واقعہ ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ ۱۹۳۳ یا ۱۹۳۴ کی بات ہے ــــ ابتدا میں اس کے کم سے کم ۲۵ ایڈیشن ½۱۴ × ۱۱ کے سائز پر مروجہ طریق سے چھپے۔ متنِ قرآنی کے نیچے دو ترجمے تھے۔ ایک حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا اور دوسرا حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کا۔ دہلی کے مشہور عالم مولانا اخلاق حسین قاسمی نے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ایک عظیم الشان کتاب "محاسن موضح قرآن" لکھی ہے، جس میں شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے کمالات پر گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب "ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ اکادمی، بھیرہ ضلع سرگودھا" سے شائع ہو چکی ہے ــــ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ لفظی ہے اور اب تک لوگ اس سے خوب استفادہ کر رہے ہیں۔

تفسیر "سراج البیان" کے ان ۲۵ ایڈیشنوں میں مولانا ندوی کے تفسیری نوٹس حاشیے پر تھے۔ اس کے بعد اسے تفسیری انداز میں شائع کیا گیا۔ ۷ × ۱۰ کا سائز ہے، کل صفحات ۱۶۰۰ ہیں، ۶، ۶ پارے کی ایک جلد ہے۔ گویا کل پانچ جلدیں ہیں، صفحات کے نمبر مسلسل ہیں اور پہلی جلد کے بعد کسی جلد کی ابتدا میں ٹائیٹل نہیں ہے ــــ اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

میں نے ملک عبدالرؤف کے پاس ۱۹۶۶ اپریل کا ایڈیشن دیکھا، منشی سید احمد خوشنویس لاہور کی کتابت ہے، بہت خوب صورت اور صاف ــــ ہر صفحے کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ اوپر کے حصے میں آمنے سامنے متن اور ترجمہ ہے۔ لیکن اب کے ترجمے کا اور انداز ہے، یعنی ترجمے دو کے بجائے ایک ہے، لیکن وہ ترجمہ شاہ عبدالقادر یا شاہ رفیع الدین کا نہیں، بلکہ ان دونوں بزرگوں کے ترجمے سے مستفاد سلیس ترجمہ ہے۔ یہ خدمت انجام دینے والے بزرگ ہیں، گنگوہ کے جناب حکیم محمد یاسین مرحوم و مغفور۔ نیچے کے کالم میں مولانا ندوی

کے تفسیری نوٹس ہیں اور آخر میں حل لغات ـــــ ٹائیٹل پر " از علامہ محمد حنیف ندوی" لکھا ہے۔ آج کے دور میں جب کہ لفظ " علامہ "، " وبال جہل و نادانی " بن چکا ہے، مجھے یہ لفظ نہ جچا۔

لفظ " علامہ " کا ایک پس منظر اور پیش منظر ہے، لیکن اس دور کے خصوصی حالات میں بعض الفاظ کی طرح لفظ " علامہ " بھی رسوا ہوا اور بہت بُری طرح ـــــ شاید ہمارے محترم شاعر اکبر الہ آبادی نے اسی لیے کہا تھا:

مشرقی و مغربی علم حاصل کر مگر　　　بن کے علامہ وبالِ جہل و نادانی نہ بن

ان تفسیری نوٹس کے سلسلے میں مولانا ندوی نے جن مجموعہ ہائے تفسیر و حدیث سے مدد لی ہے ان کے نام ٹائیٹل پر مرقوم ہیں۔ ان میں قدیم و جدید تفاسیر بھی ہیں اور حدیث کے مستند مجموعے بھی ـــــ مولانا نے آیاتِ قرآنی سے جو مجموعی مطلب اخذ کیا ہے اسے نہایت خوب صورتی سے جامع الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ کتب حوالہ یہ ہیں: تفسیر خازن، روح المعانی، کبیر رازی، ابن جریر، درمنثور، ابن کثیر، مدارک، مسند حاکم، بزار، اسباب النزول سیوطی، حقانی، خلاصۃ التفاسیر، موضح قرآن، حسینی، بیان القرآن اور صحاح ستہ سمیت متعدد کتب حدیث۔

تفسیر کے ساتھ منشی عبدالرحمٰن صاحب طارق کا قیمتی مقدمہ قرآن پاک کی افادیت اور اس کے علمی مباحث پر ہے اور اردو تراجم پر ایک مضمون مولوی مشرف علی صاحب کا مقدمے کے ساتھ ملحق ہے ـــــ جو خصوصیات ان نوٹس کی درج ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں ـــــ اور یہ نوٹ فرمالیں کہ یہ خصوصیات واقعۃً موجود ہیں، محض یہ نہیں کہ انھیں زیب قرطاس بنا دیا گیا ہو اور ایسا عام ہوتا ہے، لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ ہر صفحے پر یہ خصوصیات جلوہ گر ہیں۔

۱ـــ ہر صفحے کے اہم مضامین کی تبویب اس طرح ہے کہ متعلقہ آیت کا مرکزی موضوع سرخی سے متعین کر دیا گیا ہے۔

۲ـــ انداز غایت درجہ محققانہ ہے ـــــ اور یہ بات ہر اس شخص پر واضح ہے جو ہمارے مولانا کے انداز نگارش سے واقف ہے، کمزور اور بودی بات ان کے قریب پھٹکتی ہی نہیں۔

۳۔ عصری علوم و معارف سے جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس کا احساس ہر قاری کو ہو گا۔

۴۔ تصوف و کلام کے معارفِ تفسیری کا مولانا نے خوب استیعاب کیا ہے — اس کی وجہ ظاہر ہے کہ تصوف کے لطائف اور اس کے حکم و اسرار کے بغیر فقہی پابندیاں ایک بوجھ بن جاتی ہیں، جس طرح کہ تصوف فقہ و تشریع کے بغیر الحاد بن جاتا ہے۔ تو گویا تصوف فرائض و ارکانِ اسلام کی باطنی روح ہے — ہمارے مولانا اسلام کی اس لازوال خوبی سے خوب واقف ہیں اور انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "تعلیماتِ غزالی" اسی انداز سے لکھی ہے کہ اپنے ممدوح امام غزالی کی وہ خصوصیت سامنے آ سکے کہ انھوں نے فقہ کی تفصیلات کو تصوف کے رنگ میں کس طرح بیان کیا ہے — یہ کتاب ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے شائع کی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے جو ۴۶۷ صفحات پر مشتمل ہے — یہ کتاب اسلامی احکام کے اسرار و حکم کی عجیب داستان ہے جس کے مقدمے میں مولانا نے تصوف اور اس کی تفصیلات پر مفصل گفتگو کی ہے۔

آج کے بوڑھے مولانا ندوی عنفوانِ شباب میں بھی قلبی واردات سے شناسا تھے اور انھوں نے کلامِ الٰہی (جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے) کی آیات میں یہ کھوج لگایا ہے — گویا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی جیسے صوفی منش بزرگ کی تفسیر بیان القرآن میں مسائل سلوک کی بحث کی طرح مولانا ندوی کی تفسیر میں بھی یہ حصہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ حدیث جبریل علیہ السلام کی احسانی کیفیات بھی مولانا نے خوب واضح کی ہیں — یہ الگ بات ہے کہ یار لوگ انھیں "صوفی" نہ مانیں۔ رہا کلام کا مسئلہ تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اسلامی نظامِ حیات کا یہ اہم شعبہ ہے — اس شعبے میں مولانا کی کمال درجہ دسترس کا اندازہ "مقالات الاسلامیین" کی ترجمانی و تفہیم سے ہوتا ہے جو متکلم اسلام علامہ ابوالحسن اشعری کی کتاب ہے اور جسے مولانا نے اس طرح اردو کے قالب میں ڈھالا ہے کہ وہ ان کی مستقل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

— ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے نوٹ کے مطابق "ابوالحسن اشعری وہ بزرگ تھے جو چالیس برس مسلسل اعتزال و جہمیت کی سازشوں اور فتنہ سامانیوں کا شکار رہے لیکن بعد میں اپنے لیے فکر و تعمق

اور اجتہاد وکلام کا ایک علیحدہ دبستان سجایا" —— اس دبستانِ علمی کی داستان یہ کتاب ہے۔
مولانا نے اسے "مسلمانوں کے عقائد وافکار" کے عنوان سے نیا رنگ دیا، لیکن اس معاملے میں بھی ان کی نگاہ بنیادی طور پر وہی ہے جس کا قرآن حکم دیتا ہے اور اس کی جھلک ان کی تفسیر میں نظر آتی ہے۔

۵ — ادبی ولغوی نکات وکلمات کا تذکرہ آپ کو مولانا کی اس تفسیر میں جا بجا ملے گا۔ حلِ لغات اس کا مستقل حصہ ہے اور گویا قرآن کے اعجاز کا منہ بولتا ثبوت —— ! کسے معلوم نہیں کہ اہلِ عرب زبان وبیان کے زعم میں باقی ساری دنیا کو عجمی کہتے تھے —— قرآن نے جہاں ان کے عقائدِ باطلہ، اعمالِ فاسدہ اور اخلاقِ رذیلہ پر نیر چلایا اور گمرہی وضلالت کی اتھاہ وادی میں گھرے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑا اور اس ماحول سے انھیں نکالا، وہاں زبان وادب کے اعتبار سے جو نقش اس نے قائم کیا اس کا اندازہ ان تفسیری روایات سے ہوسکتا ہے جن کے مطابق صنادید کفار قریش رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے کلامِ الٰہی سنتے اور "ما ھذا کلام البشر" کی حقیقت ان کی زبان پر طاری ہوئی —— مولانا کا اعلان ہے کہ

"اس کا مطالعہ کرنے والا محسوس کرے گا کہ قرآن دنیائے ادب میں سب سے عمدہ اضافہ ہے۔"

۶ — زندگی کی گاڑی رواں دواں ہے —— نت نئے مسائل ابھرتے ہیں اور نت نئی تعبیرات —— ہمارا دعویٰ ہے کہ ان سب کا حل قرآن میں ہے، لیکن اس دعوے کو دلائل سے مبرہن کرنا ہر کسی کا کام نہیں، یہ سعادت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو قسامِ ازل کی فیاضیوں سے ایک خاص انداز سے بہرہ ور ہوتے ہیں —— مولانا پر ان کے رب کا خاص کرم ہے کہ انھوں نے تفسیر کے اوراق میں جدید مسائل کی وضاحت کی، لیکن اس طرح کہ مذہب ومسلکِ اسلاف کا تفوق وبرتری برابر قائم ہے —— اسلاف کی فہرست میں سب سے پہلا نام حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کا ہے جو چشمۂ نبوت سے براہِ راست فیض یافتہ تھے، جنھوں نے اپنے قلبی شکوک وشبہات کے کانٹے سرکارِ دوعالم کی مجلسِ پاک میں بیٹھ کر نکالے، جنھوں نے جبریل ومحمد علیہما السلام کی زبان سے کلامِ الٰہی سنا ہی نہیں، اس کی تعبیرات، تشریحات اور

توضیحات کا درس اس محمد عربیؐ سے لیا جسے اللہ تعالیٰ نے " بیان " کی ذمہ داری سونپی تھی، لیکن اس طرح کہ پہلے جبریل خود بیان کرتے، پھر اسے آپؐ دہراتے۔

ان حضرات کی صداقت شعاری اور علوم مرتبت کی خود اللہ تعالیٰ نے شہادت دی، اللہ تعالیٰ کے رسول نے شہادت دی ــــ ان کے قلوب کو تقویٰ و ایمان کے لیے منتخب کر کے ہر قسم کے عصیان سے محفوظ کر دیا گیا۔ انھوں نے قرآن پڑھا، سیکھا اور پھیلایا، پھر نسلاً بعد نسلٍ یہ امانت منتقل ہوئی ــــ اس امانت پر اعتماد مسلمان کا سرمایہ ہے اور اس سے انحراف ضلالت و غوایت ــــ اس شاہراہ سے انحراف کر کے جو کاوش ہوگی اسے تفسیر نہیں تحریف کہا جائے گا۔

مولانا ندوی نے ان تمام امور کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور تفسیر کے ہر مقام پر یہ حقیقت نمایاں ہے کہ مفسر کے نہاں خانۂ دماغ میں یہ جذبہ شدت سے کارفرما ہے کہ ہر بات منشائے ربانی سے ہم آہنگ ہو ــــ بعض لوگوں نے اپنے سیاسی افکار اور مزعومات کے لیے اس کتاب مقدس کو نشانہ بنایا۔ گروہی عصبیتوں نے ایسے لوگوں کو بھی " مفسرین " کی صف میں لا بٹھایا، جنھوں نے قرآن کی من مانی تفسیر کی ــــ مولانا ندوی کا کوئی گروہ ہے نہ لجنہ، پارٹی ہے نہ حزب۔ وہ اوّل آخر فقط مسلمان ہیں، حزب اللہ کے فرد، جماعت حقہ اور طائفہ مقدسہ کی ایک کڑی ــــ ان کی تفسیر کے تیرہ چودہ ایڈیشن چھپے اور نکل گئے تو یہ اسی کا کرم ہے جس کی کتاب مقدس کی انھوں نے خدمت کی۔

برعظیم پاکستان و ہندوستان میں دوسری زبانوں میں تراجم قرآن کی باقاعدہ تحریک حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلوی سے شروع ہوتی ہے اور اردو ترجمے کے معاملے میں ان کے فرزندان گرامی شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ سرِ فہرست ہیں۔ شاہ عبدالقادر کا تفسیری کارنامہ بھی ہے ــــ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا مقولہ بڑا مشہور ہے کہ قرآن کا نزول اردو میں مقدر ہوتا تو شاہ عبدالقادر کا اسلوب ہوتا ــــ

حواشی کے معاملے میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام بڑا روشن ہے ــــ ان کے استاذ، استاذ الہند، شیخ العالم مولانا محمود حسن دیوبندی کے حواشی ابتدائی سورتوں کے بعد رہ گئے تو سہ روزہ مدینہ بجنور کے مالک و ایڈیٹر مولانا محمد مجید حسن نے ان کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا، اس کے

لیے قرعۂ فال مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام پڑا ـــــ مولانا نے نمونے کے طور پر لکھا تو محمد مجید حسن نے اسے تفسیر کہہ کر اختصار کی درخواست کی ـــــ علامہ عثمانی نے مصدقہ روایت کے مطابق ۲، ۲ صفحے کا مضمون چند چند سطروں میں سمیٹا ـــــ یہ تفسیری حواشی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کی قبولیت کا اندازہ کرنا مشکل ہے، بارہا یہ چھپے اور مسلسل چھپ رہے ہیں، ہر ذی شعور اور سنجیدہ شخص ان سے استفادہ کرتا ہے۔ ان کا ترجمہ حکومتِ افغانستان نے فارسی میں کرا کے چھاپا، اس کے متعدد ایڈیشن مختلف سائزوں میں طبع ہوئے ـــــ اپنے مزاج و افتاد کے باعث مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی خدمت ایک شاندار کارنامہ ہے، اِدھر اُدھر سے ہٹ کر نفسِ قرآن کی تفہیم مولانا آزاد کا طرۂ امتیاز ہے۔ مولانا عبدالسلام نیازی کہتے ہیں کہ :

"ابوالکلام جبریل امین کی زبان بولتے ہیں"

المیہ یہ ہے کہ ابوالکلام کی بار بار جیل اور نظر بندیوں نے اس کا مسودہ تین بار ضائع کرایا اور اشاعت کی نوبت آئی تو ابتدا میں معاملہ سورۂ مومنون کے آخر تک تھا۔ سورۂ نور کا مسودہ بعد میں ملا جو آزاد ساہتیہ اکادمی دہلی کے ایڈیشن میں مالک رام صاحب نے شامل کر دیا اور اب پاکستان میں بھی چھپ گیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب نے بتایا کہ ایبٹ آباد کے مشہور بزرگ ڈاکٹر شبیر بہادر خاں نبی کے نام ہندوستان سے مولانا محمد شعیب عمری کا گرامی نامہ آیا ہے جس میں یہ مژدۂ جانفزا ہے کہ مولانا کے مسودات مع مکمل مسودۂ تفسیر کا سراغ مل گیا ہے، اللہ کرے کہ ایسا ہو اور جلد سے جلد یہ شاہکار چھپ کر سامنے آجائے ـــــ پاکستان میں باقیات ترجمان القرآن اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں کئی کوششیں ہوئیں لیکن وہ بات کہاں ـــــ؟

محمد اسحاق بھٹی صاحب راوی ہیں کہ مشہور بزرگ ملک حسن علی صاحب جامعی (شرقپور) نے میرے ذریعے مولانا ندوی کو پیغام بھجوایا کہ ابوالکلام خلد آشیانی کے ادھورے کام کی تکمیل کا استحقاق صرف مولانا محمد حنیف ندوی کو ہے اور یہ کہ میری طرف سے انھیں عرض کریں کہ وہ یہ اہم کام کر دیں ـــــ نامناسب نہ ہو گا کہ خدام قرآن اور بلا نوشانِ محبت کے ایک بڑے قافلے کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا ندوی سے اس کام کی تکمیل کی درخواست کی جائے۔

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ آپ مولانا ندوی کی تفسیر دیکھیں تو آپ کو مولانا آزاد کا عکسِ جمیل

نظر آئے گا، ملک عبدالروف صاحب کی عنایت سے جو جز مجھے ملا اس کے چند مقامات سے نمونے کے طور پر بعض سطور شامل مقالہ کر رہا ہوں تاکہ مولانا کی قرآنی خدمت کا کچھ عکس قارئین کرام کے سامنے آسکے ـــــ اللہ کرے کہ ملک عبدالروف صاحب پروگرام کے مطابق یہ تفسیر جلد چھاپ دیں۔

سب سے پہلے سورۂ نور کی آیت ۳۵ اللّٰہ نور السموات والارض ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا نے اس پر عنوان قائم کیا ـــــ "اللہ نور ہے" ـــــ اور پھر لکھا ہے۔

اللّٰہ نور السّمٰوٰت والارض مثل نورہٖ کمشکوۃ فیھا مصباح

" ان آیات میں اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمینوں کے نور کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں یہ چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے، اور قندیل ایسی صاف اور چمک دار ہے، گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔ اس میں برابر یکساں روشنی ہے، نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ تیل اس طرح کا مصفا کہ بغیر آگ جلنے کے تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تیز روشنی ہوگی، واضح ہوگی، دُور تک پہنچنے والی اور پاکیزہ ہوگی۔ پس اپنے نور سے جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھلاتا ہے، کیونکہ اللہ کی ذات ہر قسم کی تشبیہ سے پاک ہے، لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ۔ چنانچہ آیت کے اختتام پر ارشاد ہے: یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ۔ یعنی اس کا پیغام بہت روشن ہے، منور ہے، تابناک ہے اور گمراہیوں اور ظلمتوں کی تاریکیوں کو دور کرنے والا ہے۔ جس کو چاہتا ہے اس نور سے کسبِ ضو کا موقع دیتا ہے۔ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ اور اللہ تعالیٰ ان تشبیہات کو مثالوں کے طور پر بیان کرتا ہے تاکہ اہلِ علم اکتسابِ معرفت کر سکیں، اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ہو سکتا ہے نور سے مراد یہ ہو کہ اللہ اپنی کائنات کے لیے مدبّر ہے، باعثِ رونق ہے، روشنی ہے۔

جریر کہتا ہے۔ وَ اَنْتَ لَھَا نُوْرٌ وَ غَیْثٌ وَ عِصْمَۃٌ ۔

تیسرا امکان یہ ہے کہ جس طرح نور اور روشنی سے تمام اشیا متجلّی ہو جاتی ہیں اور سب کچھ نظر آنے لگتا ہے، اسی طرح اللہ زمین و آسمان کے لیے بمنزلہ نور کے ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو نہ

تسلیم کیا جائے تو پھر کائنات کا نظام درہم و برہم ہو جاتا ہے اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے اور انسان علل و معلولات کے غیر متناہی سلسلے میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

بحث میں علت و معلول کی ہر عقل علیل

اور اگر اس پر ایمان رکھا جائے اور اس کی ذات کو خالق اور رب مان لیا جائے تو کائنات کی تمام گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور کسی گوشے میں تاریکی نہیں رہتی۔

وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ میں قرآن حکیم نے ایک ایسی حقیقت کو بیان کیا ہے جس کا اظہار آج چودہ سو سال بعد ہوا ہے۔

غور فرمایئے، عربی لٹریچر میں چراغ کے لیے کوئی لفظ موجود نہیں، چنانچہ "مصباح" خالص عربی اشتقاق کی رو سے صحیح نہیں، یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ سراج فارسی سے معرب کیا گیا ہے، یہ اس لیے کہ عربوں کا تمدن بہت سادہ تھا اور وہ کھلے میدانوں اور خیموں میں رہتے تھے اور روشنی کے لیے وہ آگ کو کافی سمجھتے تھے، مگر قرآن ایک ایسی تیز اور صاف روشنی کا تخیّل پیش کر رہا ہے جو شیشے میں ہے اور سب طرف برابر نور پھینک رہی ہے۔ نہ شرقی ہے، نہ غربی۔ جس میں ایسا تیل ہے جو بغیر آگ دکھائے کے جلتا ہے۔ غور کیجیے کیا یہ بجلی اور قمقمے کا اوّلین تصور نہیں؟ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ علم اور بالغ نظری کیا کسی انسانی کلام میں ہو سکتی ہے؟

یہ آیتِ کریمہ قرآن عزیز کی مشکل ترین آیات میں شمار ہوتی ہے، لیکن مولانا نے اسے جس طرح خوب صورت انداز میں حل کیا ہے وہ انھی کا کام ہے۔ ص ۶۳۵ پر ایک عنوان ہے "حضور کی سیرت کے دو پہلو"۔

سورۃ الحجر کی آیت ۸۸ ہے، جس کا ترجمہ ہے۔

"ان کافروں کو جن کو کئی طرح کی نعمتوں کے ساتھ ہم نے بہرہ مند کیا ہے، تو (اے محمدؐ) اپنی آنکھیں ان نعمتوں کی طرف نہ پسار اور ان پر غم نہ کر اور اپنے بازو مومنین کے لیے جھکا۔"

اب اس آیت پر مولانا ندوی کا نوٹ دیکھیے اور خاص طور پر ابتدائی خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمایئے ـــــ مولانا لکھتے ہیں:

"قرآن حکیم کے جس قدر احکام میں حضورؐ کو مخاطب کیا گیا ہے، اس کے معنے یہ ہیں کہ حضورؐ

کے عمل کی یہ تصویر ہے اور اُمت کو ان کے اسوہ کی تلقین کی گئی ہے۔

اس آیت میں حضورؐ کی سیرت کے دو پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ دنیا کے تکلفات پر ریجھے ہوئے نہیں، طبیعت میں انتہا درجے کا استغنا ہے، اور یہ کہ آپ مسلمانوں کے لیے آیۂ رحمت ہیں، آپ کے دل میں اُمت کے لیے شفقت کا بے پناہ جذبہ موجزن ہے۔

غور فرمایئے۔ حضور دعوتِ عام دے چکے ہیں، مخالفت کی آگ بھڑک چکی ہے۔ لوگوں نے ابوطالب سے کہا، اپنے بھتیجے کو سمجھالو، ورنہ ہم تم سے بھی تعرض کریں گے۔ ابوطالب نے آکر حضور کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ آپ نے فرمایا۔ چچا! اگر وہ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب رکھ دیں، جب بھی میں دعوتِ توحید سے نہیں رُک سکتا۔ کس قدر استغنا ہے۔ قوم سونے چاندی کے ڈھیر نذر کرتی ہے، حسین وجمیل رشتے پیش کیے جاتے ہیں، مگر حضورؐ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ رحمت ورافت کا یہ عالم ہے کہ وہ لوگ جو منافق ہیں، آپ کو تکلیفیں پہنچاتے ہیں، اُن سے ہر طرح اغماض وچشم پوشی کرتے ہیں۔ عبداللہ ابن ابیؓ مرتا ہے تو آپ پیراہنِ مبارک تبرک کے لیے بھیج دیتے ہیں۔"

غور فرمایئے قرآن کی روشنی میں سیرت طیبہ کی اتنی دل نشیں اور جامع تشریح کہاں نظر آئے گی ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے رسول علیہ السلام کی سیرت کا اصل ماخذ قرآن ہی ہے ـــــ اسی لیے مولانا ابو الکلام نے مولانا شبلی مرحوم کو اس طرف توجہ دلائی اور جب شبلی کی حیاتِ مستعار نے ایسا موقع فراہم نہ کیا تو مولانا خود متوجہ ہوئے، وہ مربوط انداز سے یہ کام نہ کرسکے۔ لیکن ان کے مقالات اور نوٹس مولانا غلام رسول مہر نے مرتب کرکے قرآن کے نقطۂ نظر سے نبی کریم علیہ السلام کی مبسوط سیرت پیش کردی ـــــ یا پھر مولانا عبدالماجد کے وہ لکچر ہیں جو مدراس میں دیے گئے۔ "سیرتِ نبوی قرآنی" ان کا عنوان ہے۔ مولانا آزاد کے سیکرٹری اجمل خان کی مبسوط کتاب اس عنوان پر "سیرت از روئے قرآن" پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے پاس میں نے دیکھی۔ محمد اسحاق بھٹی صاحب کا بیان ہے کہ ساٹھ سے زائد اقساط میں مولانا ندوی کا مفصل مقالہ "چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں" "الاعتصام" میں چھپا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب بھٹی صاحب "الاعتصام" کے ایڈیٹر تھے۔ اللہ کرے کہ وہ کتابی شکل میں سامنے آجائے۔

اس موقعے پر سورۂ الکہف کا وہ نوٹ بھی دیکھیں جو آیت ۲۸ کے ضمن میں لکھا گیا ہے ——
اس آیت میں اللہ رب العزت نے اپنے رسول کو ان مظلوم صحابہ کے ساتھ وابستہ رہنے کی تلقین و تاکید کی ہے جو صبح و مسا حمد باری بیان کرتے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں —— کفار کا مطالبہ کہ ہماری بات سننے اور اپنی بات ہمیں سنانے کی غرض سے ان صحابہ سے کچھ وقت علیحدگی ضروری ہے —— قرآن کی بات اپنی ہے، وہ جہاں فدایانِ رسالت کی فداکاری و جاں سپاری کو آیت کے بین السطور میں پیش کرتا ہے، وہاں بقول مولانا ندوی اس "پیغمبر مساکین" کا کردار بھی سامنے آتا ہے کہ اس کی صبحیں اور شامیں گزرتی ہیں تو انھی کے ساتھ جو دنیوی اعتبار سے مفلوک الحال سہی لیکن ہیں تو "لو اقسم علی اللہ لابرہ" کے مصداق —— "پیغمبرِ مساکین" مولانا کا قائم کردہ عنوان ہے۔ ملاحظہ فرمایے (ص ۷۰۹)

" قرآن حکیم میں بعض باتیں بصیغۂ امر ادا کی گئی ہیں، مگر اس سے مراد خبر ہے اور ایک واقعہ کا اظہار ہے، اور اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہاں بھی بالکل یہی انداز بیان ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ شاید ان عام لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا پسند نہ فرماتے تھے جو غریب اور مفلس تھے۔ اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، آپ ان لوگوں کے ساتھ رہنے میں کوئی عار محسوس نہ کریں، حالانکہ واقعہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ حضورؐ ہمیشہ ابوذر، سلمان فارسی اور اس قسم کے غریب اور مخلص عقیدت مندوں میں بے تکلفی سے بیٹھتے اور ان میں صبح و شام گزارتے۔ امرا کو ناگوار تھا کہ وہ اس حالت میں آپ سے ملیں چنانچہ وہ کہتے کہ جناب ہم اس حلقے میں بیٹھ کر آپ سے گفتگو نہیں کر سکتے، ان کے کپڑوں سے بو آتی ہے اور ہماری طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے، آپ بھی ان سے الگ ہو جائیے۔ مگر وہ پیغمبر جو افلاس و فقر کو اعزاز بخشنے کے لیے آیا تھا کیونکر ان کی باتوں کو مان لیتا۔ قرآن کی زبان میں اُن کو بتایا گیا کہ گو یہ مفلس ہیں، مگر دولت ایمان سے ان کے دل مالامال ہیں۔ ان کے کپڑوں سے گو تمھیں بُو آتی ہے، مگر دل ذکرِ خدا سے مہک رہے ہیں۔ یہ مخلص ہیں، خدا پرست ہیں، تم انھیں حقیر سمجھو، تمھیں اختیار ہے۔ مگر قدرت کی جانب سے یہ طے شدہ امر ہے کہ یہی لوگ دنیا میں انقلاب پیدا کریں گے۔ تم حرص و ہوا کے بندے ہو، تمھارے دلوں پر غفلت کے حجاب

پڑے ہوئے ہیں۔ تم اسلام کی برکات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ تم جب تک دنیا کی ان کثافتوں میں پڑے ہوئے ہو، صحبتِ نبوی سے فیض یاب نہیں ہو سکتے، اور تم ہرگز اس قابل نہیں ہو کہ پیغمبر مخلص مساکین کو چھوڑ کر تم مغرور اور متکبر انسانوں کے ساتھ اٹھے بیٹھے۔"

اور ان اصحاب تقویٰ و ایمان صحابہ کرام کا تذکرہ اور ان کے حق میں غیرتِ الٰہی کا ظہور اسی پر بس نہیں، سورۂ نور کی مشہور آیت استخلاف کا مطالعہ بھی مفید ہوگا جس میں ایسے وقت میں ان حضرات کو حکومت و اقتدار بخشنے کا وعدہ ہوا جب ان کے متعلق عام سے سکون کا تصور تک نہ تھا۔ کفر زیرِ لب خنداں تھا لیکن غیرتِ الٰہی کا اعلان اپنی جگہ اٹل تھا ——— اس تاریخی صداقت میں چھپی ہوئی روح اب بھی قائم اور زندہ ہے اور ہر وہ شخص اور طبقہ جو اپنی زبوں حالی پر پریشان ہے اسے "استنفت تلبلث" کہہ کر جھنجھوڑ رہا ہے کہ یہ تو بتاؤ، تمھیں اپنی پریشانیوں، اقتدار و استحکام سے محرومی اور باطل قوتوں کے عروج کا بڑا صدمہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ متاعِ ایمان اور دولتِ ایقان جس پر اس الٰہی انعام کا وعدہ ہے، اس کی صورت کیا ہے؟

آیت استخلاف کا نمبر ۵۶ ہے اور جیسا کہ عرض کیا یہ سورۂ نور میں ہے ——— اس سے قبل کی آیت ۵۵ میں اطاعتِ رسول کا ذکر ہے ——— حقیقت یہ ہے کہ دارین کی سعادتوں جن میں استخلاف فی الارض بھی شامل ہے کا انحصار اطاعتِ رسول پر ہے۔ اس پر مولانا کا نوٹ پہلے ملاحظہ فرما کر پھر اس سے متصل اگلا نوٹ بعنوان "استخلاف فی الارض کا وعدہ" ملاحظہ فرمائیں۔

اطاعتِ رسولؐ

"قرآن حکیم نے بار بار اطاعت رسول کو بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس اسوۂ کامل کی تقلید کرے اور اپنی زندگی کے لیے مشکوٰۃِ نبوت سے کسبِ انوار کرے، کیونکہ پیغمبر ہی دنیا میں محاسن اور کمالات کا پیکر ہوتا ہے اور اس سے بے نیازی اللہ کے دین سے کفر کے مترادف ہے۔ چنانچہ اِنْ تُطِیْعُوْہُ تَهْتَدُوْا کہہ کر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا میں اللہ کی فرماں برداری اور اس کی اطاعت شعاری کے معنے بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عظمتِ رسول کو سمجھو اور اس کے مقامِ رفیع سے واقف ہو تاکہ تم ہدایت

حاصل کر سکو۔"

استخلاف فی الارض کا وعدہ

" دین کے معنے اسلامی نقطۂ نگاہ سے کامیابی کے کامل پروگرام کے ہیں، اس لیے جو لوگ صحیح معنوں میں مومن ہوں گے اور ان کے اعمال اللہ کے تجویز کردہ پروگرام کے ماتحت ہوں گے، ان کا دنیا و آخرت میں کامیاب ہونا یقینی اور حتمی ہے۔ اس آیت میں قرآن نے اسی اصول کی جانب رہنمائی فرمائی ہے۔ ارشاد ہے کہ مومنین سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں خلیفہ فی الارض یعنی ملک کا حاکم بنایا جائے گا، انھیں دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازا جائے گا اور ان کے سر پر تاج خسروی رکھا جائے گا، اور ان کے لیے یہ مقدرات میں سے ہے کہ جب تک اسلام کی پوری پابندی کرتے رہیں، اس وقت تک دنیا کی قیادت کریں، سب سے بلند رہیں اور اللہ کے فضل سے ساری کائنات پر حکومت کریں۔

کیونکہ اسلام کے لائحہ عمل میں ایسے رفعت آگین اور تفوق آفرین اصول داخل ہیں کہ ان پر عمل پیرا ہونے کا یہی قطعی اور منطقی نتیجہ ہے جو مذکور ہوا، اور یہ صرف نظریہ ہی نہیں، بلکہ اسلام کی ساری تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔ دیکھ لیجیے جب تک مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان رہے، ان کے دلوں میں احساسِ عزت کا جذبہ موج زن رہا، اسلام کے حاکمانہ اصول ان کی زندگی میں کارفرما رہے، اور جب تک انھوں نے قیادت و رہنمائی کے منصبِ جلیل پر اپنے کو فائز رہنے کا حق دار سمجھا، تب تک حاکم رہے، عزت و اقتدار کے مالک رہے اور رونق اور رنگ و تاج رہے، اور جب سے مذہب کے معنی ان کے ہاں خشک قیود اور بے روح رسوم کے اور محض انتساب کو باعث فخر و مباہات سمجھا گیا تو اُس وقت سے ذلت وادبار کا دورِ مشئوم شروع ہوا۔ ورنہ مسلمان اور غلامی، مسلمان اور افلاس، مسلمان اور ذلت و تحقیر۔ شیئان یستفرقان ای تفرق۔ یہی نسخۂ کیمیا تو تھا جس نے مریض عربوں کو صحت و توانائی بخشی، جس نے زیردستوں کو زبردست بنا دیا، جس کی وجہ سے جہالت تعلیم سے بدل گئی اور بداخلاق قوم سرخیلِ روحانیات ٹھہری۔ یہی تو وہ اسلام ہے جس کی وجہ سے مٹھی بھر مسلمان کائنات پر چھا گئے اور لوگوں کی راہ نمائی کرنے لگے۔ پھر آج اگر ہم میں ذہنی افلاس موجود ہے تو اسلام

اور قرآن اس کا ذمے دار نہیں۔ بلکہ اس کی ساری ذمے داری ہمارے اپنے اعمال اور کردار پر عائد ہوتی ہے۔

وعدۂ استخلاف کے بعد اس آیت میں نہایت جامعیت کے ساتھ وہ پروگرام بتلایا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے خلافت و نیابتِ الٰہیہ کا منصب حاصل ہو سکتا ہے، اور وہ پروگرام نماز اور زکوٰۃ کی تنظیم ہے۔ رسول کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ مسلمان اگر نماز کی روحانی و اجتماعی برکات سے آگاہ ہو جائیں اور زکوٰۃ کی تنظیم کر لیں، اور یہ طے کر لیں کہ ان کی زندگی اسوۂ رسول کے مطابق ہو گی تو یقین جانیے، آج ہی ان کی ہر قسم کی ذلتیں اور نحوستیں، عزتوں اور سعادتوں سے بدل سکتی ہیں۔"

استخلاف فی الارض والی آیت کے ساتھ ہی اگلی آیت میں وہ پروگرام ہے جس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ خلافت و نیابتِ الٰہیہ کا حصول ہے —— اسے ہی بعنوان دیگر "اسلامی حکومت" کہا جاتا ہے۔

آج جو صورتِ حال رونما ہے وہ بڑی المناک ہے، خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کا کوئی اجتماعی پلیٹ فارم نہیں۔ پوری قوم ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ انتشار و افتراق اس کا مقدر ہے اور اسلامی روایات سے انحراف کا تماشہ عام —— جہاں کہیں اسلامی حکومت و نظام کی بات ہے وہ اور زیادہ المناک ہے، مزید ستم یہ ہے کہ بیگانوں اور ان کے ساتھ احساس کہتری کا شکار اور مرعوبیت کے دلدل میں پھنسے ہوئے اپنے "اسلامی حکومت" کے عنوان سے اس درجہ خائف ہیں کہ توبہ بھلی —— ان کا اس ضمن میں عجیب پروپیگنڈا ہے۔ وہ کہتے ہیں اس سے آزادئ رائے و ضمیر ختم ہو گی، ہاتھ کٹ جائیں گے، کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے، گلی گلی درّے لوگوں کو پڑتے ہوں گے۔ حالاں کہ اسلامی حکومت نام ہے عدل و انصاف کے قیام، نیکی کے عروج اور بدی کے زوال کا، اور یہ مسلمان ہی نہیں ہر انسان کی ضرورت ہے۔

الحج کی آیت ۴۱ اس ضمن میں قابلِ توجہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ

وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

وہ لوگ کہ اگر ہم زمین میں انھیں مقدور (یعنی طاقت) دیں تو نماز پڑھیں، اور زکوٰۃ دیں اور بھلائی کا حکم کریں، اور بری بات سے منع کریں، اور سب معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس پر مولانا کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں —— کتنی خوب صورتی سے بات سمجھائی کہ بھائی اس نظام سے ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ تو عدل و دین داری کی معراج ہے اور اس میں سب کا بھلا ہے۔

" جو لوگ اسلامی حکومت کے تخیل سے خائف ہیں، ان کو اس آیت پر غور کرنا چاہیے۔ ارشاد ہے کہ ہم مسلمانوں کو جب تمکّن فی الارض کی نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ دنیا میں عیّاشیاں نہیں پھیلاتے اور حرص و آز میں گرفتار ہو کر لوگوں کے مال و دولت پر ڈاکہ نہیں ڈالتے۔ وہ نہایت پاک باز اور خدا پرست ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عبادتِ الٰہی کے جذبے کو عام کریں، اللہ کے سامنے جھکیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تاکہ تمام غربا اور مساکین کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ وہ ہر نیکی کو پھیلاتے ہیں اور ہر برائی کے خلاف جہاد کرتے ہیں، ان کا طرزِ حکومت نہایت عادلانہ اور دین دارانہ ہوتا ہے۔"

اسلام اور اسلامی روایات میں "جہاد" کا اطلاق ہر اس محنت و کاوش پر ہوتا ہے جو خیر کے غلبے اور بلندی کے لیے کی جائے۔ برا ہو حسد و عناد کا کہ اس کے بل بوتے پر یاروں نے خوں ریزی کا نام "جہاد" رکھ کر اسلام کو بدنام کرنا چاہا۔ اس کے ردّ عمل کے طور پر مسلمانوں میں بدقسمتی سے ایک طبقہ سرے سے اس کا انکار کر کے حدودِ اسلام سے خارج ہو گیا۔ ایک نے من مانی تعبیرات کر کے اس کی روح مسخ کر دی اور ایک نے ہر اس شخص کو بدنام کر کے غیروں کی خوشنودی کا سامان فراہم کیا جو جہاد کے میدان میں تھا۔

قرآنِ عزیز نے سورہ الحج میں جہاد و قتال کی ابتدائی آیت میں اس کی اصل غرض نامِ خدا کی بلندی اور مظلوم کی دادرسی بتلائی ہے، نامِ خدا مسجد میں ہو یا کہیں اور —— ہر جگہ اس کا احترام ہے —— یہ آیت ۳۹، ۴۰ میں ہے۔ اس سے قبل اس قربانی کا ذکر ہے جو حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق " سنۃ ابیکم ابراھیم " ہے —— اس میں بظاہر جانور ذبح ہوتا ہے لیکن اس کی اصل روح دلوں کی حرارت و حدّت اور اپنے آپ کو من کل الوجوہ

اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔

مولانا ندوی قربانی و جہاد کا جوڑ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ گویا دونوں لازم و ملزوم ہیں اور پھر اسلامی جہاد کی حقیقی غرض بیان کر کے مخالفین اور مستشرقین کا منہ بند کرتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

(ص ۸۵۵-۸۵۶)

قربانی اور جہاد

"یعنی قربانی کے عملی معنے یہ ہیں کہ دلوں میں جذبہ جہاد موجزن ہو۔ اگر ہم ہر سال لاکھوں اور کروڑوں حیوانات کا خون بہائیں اور قلوب میں کوئی حرارت اور کوئی جذبہ جہاد پیدا نہ ہو تو پھر یہ عبادت سراسر بے روح اور بے کیف ہوگی۔

آیت میں اذنِ جہاد ہے، کیونکہ مسلمانوں کی مظلومیت حد سے بڑھ گئی، اب یہ ناممکن ہے کہ ان مظالم کو زیادہ دیر تک برداشت کیا جائے۔

ارشاد ہے کہ اللہ نے طے کر لیا ہے کہ مسلمانوں کی اعانت کی جائے اور مشرکین کے غلبہ و استیلا کو دور کیا جائے۔ کیونکہ مسلمان مظلوم ہیں اور اسلام کو مظلومیت پسند نہیں جس طرح ظلم بری چیز ہے اور اسلام اس کو جائز قرار نہیں دیتا ہے، اسی طرح مظلومیت بھی ناقابلِ برداشت ہے اور جرم ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جہاد کی نوعیت کیا تھی۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، ان کو ان آیات پر غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کب اور کس وقت مسلمانوں کو جہاد کا اذنِ عام دیا۔ بے شک اس وقت اجازت دی، جب مظالم حد سے بڑھ گئے اور مکہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی۔"

اسلامی جہاد کی غرض قیام عبادت ہے

"اس آیت میں بڑے واضح الفاظ میں قرآن حکیم نے بتا دیا ہے کہ اسلامی جہاد سے غرض معابدِ الٰہیہ کی حفاظت ہے۔ مسلمان اس لیے میدانِ جہاد میں قوت آزما ہوتا ہے کہ خدا پرستی کے تمام مرکزوں کو مشرکین کے قبضہ و استیلا سے پاک کر دے۔ وہ جہاد و قتال سے مادی نفع کا طالب نہیں ہوتا بلکہ اس کے سامنے اعلاء کلمۃ اللہ کا بلند مقصد ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے لیے لڑتا ہے اور

اللہ کے لیے صلح کرتا ہے۔ اگر مسلمان حق وصداقت کی تائید میں تلوار نہ اٹھائے تو پھر ساری دنیا میں باطل کی حکومت ہو جائے اور تمام مرکزوں میں جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہے، دیوتاؤں اور معبودانِ باطل کی عبادت ہونے لگے۔ مسلمان امنِ عالم کا کفیل ہے۔ اس کا جہاد دوسرے مذاہب کی آزادی کے لیے بھی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سب عبادت گاہوں کی حفاظت ہو اور سب لوگوں کو آزادی حاصل ہو کہ وہ آزادانہ طور پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرسکیں اور اس کے نام کو بلند کرسکیں۔ البتہ اسے یہ ناپسند ہے کہ لوگ غیر اللہ کی پرستش کریں اور بُتوں اور دیوتاؤں کے نام پر معابد تعمیر کریں۔ کیونکہ ایسے مراکزِ عبادت درحقیقت جہالت وتاریک خیالی کے مدرسے ہوتے ہیں۔ جہاں انسانوں کو ذلت ونکبت کا درس دیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا کے سوا اور ہستیاں بھی احترام وعبادت کے لائق ہیں، حالانکہ یہ بہت بڑی گمراہی اور بہت بڑا جرم ہے۔ اس سے نفسِ انسانیت تباہ وبرباد ہو جاتی ہے اور پھر کبھی اُبھرنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔"

آج ہمارے یہاں "رجم" کا مسئلہ بلاوجہ باعثِ نزاع بنا دیا گیا ہے۔ اچھے بھلے لوگ ساری عمر قرآن کی خدمت میں کھپانے کے بعد یہاں آکر ٹھوکر کھاتے ہیں ـــــ یہاں اُن کے بقول سورۂ نور میں زانی کے لیے کوڑوں کی سزا تو ہے رجم کی نہیں۔

مولانا ندوی کا گہر بار، محتاط اور ذمہ دار قلم یہاں جوئے رواں کی طرح بہتا ہے اور سورۂ نور جس اسلوب کے ساتھ نازل ہوئی، مولانا پہلے اس پر ایک بھرپور تبصرہ کر کے پھر سزائے رجم پر گفتگو فرماتے ہیں ـــــ یقین جانیے انداز اتنا دل نشین ہے کہ دل ودماغ میں اُبھرنے والے خیالات اور وساوس ایک دم ختم ہو جاتے ہیں۔

ص ۸۳۶ پر اس سورت کے معاملے میں اہتمام ربانی کی بات پہلے ملاحظہ فرمائیں۔

"قرآن حکیم کی یہ پہلی سورت ہے، جسے اس اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، گو پورا قرآن اللہ کی جانب سے ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کا ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے، نیز قرآن کی ہر سورت میں آیات بیّنات کا ذخیرہ ہے، مگر اس سورت کو ان خصوصیات کے ساتھ مختص کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمدن اور کلچر کے مسائلِ مہمّہ کو بیان کیا گیا ہے اور ان

معاشرتی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے جن کی وجہ سے قومیں ترقی اور برتری کی منزلیں طے کرتی ہیں، اور انھیں فراموش کر دینے کا نتیجہ لازماً ذلت اور ہلاکت ہوتا ہے۔"

اس کے بعد سزائے رجم پر گفتگو ملاحظہ فرمائیں اور پھر دل پہ ہاتھ رکھ کر بتائیں کوئی اشکال باقی رہتا ہے؟ (ص ۸۳۷)

"تمام مذاہب نے زنا کو انسانیت کے لیے بہت بڑی لعنت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا وجود قوموں کے لیے اخلاقی تباہی کے مترادف ہے۔ قرآن حکیم نے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلے کی متعلقہ تفصیلات بیان کی ہیں اور اس کے ذرائع و وسائل تک کا استقصاء و احتوا کیا ہے۔ قرآن کی نگاہیں دوسری مذہبی کتابوں سے کہیں زیادہ عمیق ہیں، اس نے تمام انسانی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر ایسے قوانین اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں کہ ان کو ملحوظ رکھنے کے بعد زنا کا احتمال قطعاً پیدا نہیں ہوتا۔

اس آیت میں زنا کی حدِ شرعی سے بحث فرمائی ہے۔ ارشاد ہے کہ زانی کے سو درّے لگائے جائیں، اور اس معاملے میں سوسائٹی جذباتِ رحم و رافت سے بالکل متاثر نہ ہو۔ یہ سو درّے مجمع عام میں لگائے جائیں تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت و تذکیر حاصل ہو۔

زانی سے مراد یہاں وہ شخص ہے جو کنوارا زانی ہو، بیاہے ہوئے کے لیے اسلامی سزا رجم ہے۔

خوارج نے رجم کا انکار کیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ یہ سزا ہر دو قسم کے زانیوں کے لیے ہے۔ ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ الزانیۃ والزانی میں کوئی تخصیص نہیں بلکہ عموم و استغراق مراد ہے۔

۲۔ اگر رجم کی سزا مقرر و متعین ہوتی تو اس کو قرآنِ حکیم میں موجود ہونا چاہیے تھا۔

۳۔ رجم کو ماننے کی شکل میں یہ لازم آئے گا کہ نص میں خبرِ واحد کی تخصیص کی جائے جو درست نہیں۔

بعض موجودہ زمانے کے روشن خیال مفسّرین کے دلائل بھی تقریباً یہی ہیں۔ جوابات یہ ہیں:

۱۔ قرآن حکیم نے یہاں بے شک صرف الزانیۃ اور الزانی کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر سنت،

تواتر اور اسلامی فیصلوں سے جو کتبِ فقہ اور تاریخ میں مذکور رہیں، یہ ثابت ہے کہ رجم اسلامی سزا ہے۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ محض اس بنا پر کہ قرآن میں واضح الفاظ میں رجم کا ذکر نہیں، ہم پوری اسلامی تاریخ کو جھٹلا دیں، صحابہ کے فیصلوں کو غلط قرار دیا کریں، رسول کے احکام کو ٹھکرائیں اور علمی و عملی تواتر کا انکار کر دیں۔

۲ــــ رجم کی سزا یقیناً قرآن میں موجود ہے، مگر اس نہج پر نہیں، جس طرح خوارج یا اِس زمانے کے متنوّرین دیکھنا چاہتے ہیں، بلکہ اشارۃً اور بر سبیل استطراد قرآن میں رجم کی سزا موجود ہے۔ کیا ان کو معلوم ہے کہ عہدِ رسالت میں اہل کتاب سے اس معاملے میں بحث ہوئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ تورات لاؤ اور پڑھو، اگر تم میں صداقت ہے تو تسلیم کر لو گے کہ اس میں رجم کی سزا کا حکم موجود ہے۔ مگر انھوں نے آیاتِ رجم کو چھپایا، اور جب حضرت عبداللہ بن سلام نے بڑھ کر ان کی چالاکی کا بھانڈا پھوڑ دیا تو وہ نادم ہوئے، اس پر اُن کے جذبۂ کتمانِ حق کے متعلق آیات کا نزول ہوا۔ کیا یہ آیتیں رجم کی تائید میں نہیں؟ مگر سوال اپنی جگہ پر ہنوز باقی ہے کہ اس قدر ضروری حکم کو قرآن نے بالتصریح کیوں ذکر نہیں کیا؟ اور صرف کنواروں کے متعلق حدِ شرعی کے اعلان کرنے میں کیا مصلحت ہے؟

بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کا اندازِ بیان کچھ دوسری کتابوں سے مختلف ہے اور وہ لوگ جو اس کی خصوصیات سے آگاہ نہیں ہوتے، اس قبیل کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

قرآن میں اکثر ان باتوں کا ذکر ہے جو گو اپنی جگہ پر اہم نہ ہوں مگر اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں کہ وہ نئی اور جدید ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ نماز بہت اہم مسئلہ ہے اور اس کے قیام پر قرآن نے بہت زور دیا ہے۔ مگر سارے قرآن میں اس کی ترتیب اور تفصیل موجود نہیں۔ وضو اس سے کہیں کم مرتبے کی چیز ہے، مگر اس کی ترتیب بیان کر دی ہے۔ کیونکہ نماز کے متعلق اسلام نے بہت زیادہ جدّتوں سے کام نہیں لیا۔ اس کا تخیل اسلام سے قبل صابیوں میں اور خدا پرستوں میں موجود تھا، مجوسی بھی تقریباً اسی قسم کی نماز کے قائل تھے۔ اس لیے اللہ نے اس کی تفصیلات کو اسوۂ رسول پر چھوڑ دیا، اور وضو جو کسی شریعت میں موجود نہ تھا، اس کی تفصیلات بیان

فرمادیں۔ اسی طرح رجم کی سزا میں چند شرائع کا قریباً اتفاق تھا، اس لیے قرآن نے بالتخصیص اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ البتہ کنوارے کی سزا کی تخصیص چونکہ قرآن کو مقصود تھی۔ اس لیے اس کا اظہار کر دیا۔

۳۔۔۔ جواب کی اس نوعیت کے بعد تیسرا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

عفیفہ عورت کو متہم کرنے کی سزا

"ایک طرف قرآن نے زانی کی سزا اس قدر کڑی رکھی ہے کہ موجودہ مذاق کے لوگ اس کو تکلیف مالا یطاق قرار دیتے ہیں، اور دوسری طرف چار گواہوں کی شہادت ضروری بتائی ہے، جن کا مہیّا ہونا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ یہ ایک سوال ہے جو طبعاً پیدا ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ سزا اس لیے کڑی رکھی ہے تاکہ اس خبیث مرض کا کلیتہً انسداد ہو جائے۔ چنانچہ آپ عہدِ نبوی میں دیکھیے گا کہ زنا کے واقعات دو تین سے زیادہ نہیں ملیں گے اور اس دورِ جدید میں شاید ہی چند آدمی ایسے مل سکیں جنھیں صحیح معنوں میں عفیف کہا جا سکتا ہے۔ ع

بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

چار شاہدوں کا ہونا اثباتِ واقعہ کے لیے اس لیے لازم ہے کہ معاملہ ایک جان کا ہے، ایک کی زندگی ختم ہونے کا ہے۔ چنانچہ اس اہم واقعہ کے لیے معمولی شہادت ناکافی اور نامنصفانہ ہے۔ اس آیت میں معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر گواہوں کو تنبیہ کرنی ہے کہ اگر تم نے عفیف اور پاک باز عورتوں کو یوں ہی متہم کیا اور ثبوت میں عینی گواہ پیش نہ کر سکے تو حدِ قذف کے لیے تیار رہو۔ تمھاری پشت پر اسّی دُرّے لگائے جائیں گے۔ اس حدِ شرعی کے تقرر سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک عورت کی عزت اور اس کا وقار کس درجہ قیمتی ہے۔ ارشاد ہے کہ پرہیزگار عورتوں کو متہم کرنے والے لوگ فاسق و بدکردار ہیں۔ انھیں سزا دو اور آئندہ کے لیے ان کی شہادت بھی قبول نہ کرو۔"

سزائے رجم بلاشبہ سخت ہے، لیکن یہ جرم بھی تو کم سخت نہیں۔ معاشرتی اعتبار سے سب سے ظالمانہ اقدام یہی ہے کہ انسان دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالے ۔۔۔ لیکن اس جرم

کی سنگینی کے اعتبار سے اس کی صحت کا معاملہ بھی اتنا ہی سخت کیا گیا تاکہ کوئی اُٹھ کر آسانی سے کسی پر تہمت طرازی نہ کر سکے ـــــ کرے تو اس کی سزا غایت درجہ سخت ہے تاکہ باقیوں کو عبرت ہو۔ "عفیفہ عورت کو متہم کرنے کی سزا" کے عنوان میں اسی کا ذکر ہے ـــــ اور ربطِ آیات کا مسئلہ اگر بہت اہم ہے تو اس ترتیب سے اس فن میں بھی مولانا کے کمال کا پتا چلتا ہے۔ حوالوں کا معاملہ دراز ہوتا جا رہا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ حکایت اتنی لذیذ و شیریں ہے کہ اختتام کو جی نہیں چاہتا، تاہم اب زیادہ طوالت اختیار کیے بغیر محض چند باتوں پر اکتفا کروں گا۔

تین باتیں سورۃ الفرقان کے حوالے سے ہیں اور بالکل ابتدائی آیات کے ضمن ہیں ـــــ تفسیر کا ص $\frac{۸۶۰}{۸۶۱}$ قابلِ غور ہے:

"بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا کہ اہلِ جہان کے لیے ڈرانے والا ہو ـــــ" (آیت: ۱)

اس پر مولانا کا نوٹ جہاں قرآن کی عظمت کا آئینہ دار ہے وہاں ختم نبوت و رسالت کی ایک اچھوتی تعبیر اس سے پیدا کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں، پھر مولانا نے آیت ۲ کے ضمن میں ایک عنوان قائم کیا:

اشتراکیت اور اسلامی تخیّلِ مِلک

یعنی اندھی بہری سرمایہ داری کے ردِّ عمل میں ابھرنے والی تحریکِ اشتراکیت کا ردّ ـــــ کیونکہ جس طرح سرمایہ داری اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور مبغوض ہے، اسی طرح کا حال اس کا ہے ـــــ نہ وہ پسند نہ یہ ـــــ لیکن اصل سوچنے کا مقام یہ ہے کہ نکتہ رس اور دقیقہ سنج طبیعت نے بات کہاں سے پیدا کی ـــــ سبحان اللہ و بحمدہٖ

اور پھر آیت ۶ کے حوالے سے "قرآن خدا کا کلام ہے" کا عنوان قائم کر کے اس تخیل کو پارہ پارہ کیا جس کی رو سے قرآن نبیِّ اُمّیؐ کا کلام قرار پاتا ہے یا اس میں آمیزش کا ذہن ابھرتا ہے ـــــ دونوں صفحات تسلسل سے پڑھیں، ایک عجیب کیف محسوس ہوگا۔

مسلمان قرآن کے بعد کسی دوسرے صحیفے کا منتظر نہیں

اللہ کی ذات ہمہ خیر اور ہمہ برکت ہے، اور یہ اُس کے فیوضِ عالیہ میں سے ہے کہ اس

نے گمراہ انسانوں کے لیے ایک راہ نما بھیجا، اور ایک نہایت ہی شاندار کتاب عنایت فرمائی جو حق و باطل کے درمیان فارق ہے اور وہ راہ نما ایسا ہے کہ اس کی نبوت تمام کائنات انسانی کے لیے ہے۔ اس کا پیغام زمان و مکان کی قیود سے بالا ہے۔ وہ ہر قوم اور ہر قرن کے لیے پیغمبر ہے۔ اس کی تعلیمات کا فیض عام ہے۔ وہ ایک ایسا آفتابِ رشد و ہدایت ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا، یعنی قیامت تک مسلمانوں کو کسی نبوت اور کسی رسالت کی ضرورت نہیں، کسی کتاب اور کسی صحیفے کی حاجت نہیں۔ جہاں تک رشد و ہدایت کے پروگرام کا تعلق ہے مسلمان قرآن کے بعد ہر چیز سے بے نیاز ہے۔

عَلٰی عَبْدِہٖ سے مراد ہے کہ بڑے سے بڑا رتبہ اور مقام عبودیت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم باوجود ان مراتب اور درجات کے، باوجود اس قرب و اختصاص کے، کہ دنیا کا کوئی شخص فضائل میں ان کا ہمسر نہیں ہے اور وہ اقلیم مکارم کے تنہا تاجدار ہیں، اللہ کے بندے ہیں اور ان کے تعلقات اپنے خالق سے نیازمندانہ ہیں۔

نَذِیْرًا۔ سے مراد "آگاہ کرنے والا ہے، ڈرانے والا نہیں"۔

اشتراکیت اور اسلامی تخیّلِ ملک

"شرک اور بت پرستی کی تردید ہے۔ ارشاد ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر اس کو بیٹوں کی کیا ضرورت ہے؟ اور کون ہے جو اس کے اختیارات میں دخل اندازی کر سکے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

اشتراکیت کا موجودہ تخیل اگر غور کیا جائے تو اس آیت کی رُو سے درست نہیں۔ کیونکہ اشتراکیت کے معنے یہ ہیں کہ تمام املاک کو حکومت کا مِلک قرار دیا جائے۔ حالانکہ ہر چیز کا مالک خدا ہے۔ اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اسی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ان کو مناسب اور موزوں طریقوں سے اپنے بندوں میں تقسیم کر دے۔ یہ خُدا کی مِلک اور اس کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ مداخلت کرنے والے کون ہیں؟ اصل میں یہی وہ مقام ہے جہاں سے اشتراکیت اور اسلام کی دو جُدا جُدا راہیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس باب میں دونوں متفق ہیں کہ کوئی شخص تنہا کسی چیز کا مالک نہیں۔ اشتراکیت کے نزدیک کوئی فرد اس کا مالک نہیں ہو سکتا، جمہوریت یا حکومت اس

کی مالک ہے۔ اور اسلام کہتا ہے کہ صرف اللہ مالک ہے۔ لَہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ہماری حیثیت محض امین کی سی ہے۔ ہم براہِ راست مجاز نہیں کہ اپنے اختیارات کو بروئے کار لا سکیں۔ ہم اللہ کی ہدایات کے منتظر ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے، اپنی دولت کو تقسیم کرتا ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم نے دولت اور املاک کی اتنی بہتر تقسیم فرمائی ہے کہ اس کے بعد اشتراکیت کے لیے مسلمان کے قلب میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔"

قرآن خدا کا کلام ہے

"نصر بن حرث اور اس قماش کے دوسرے لوگ جب یہ دیکھتے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا جواب بن نہیں آتا تو وہ کہتے کہ یہ خدا کا کلام تھوڑا ہی ہے، یہ تو افترا ہے۔ وہ لوگ جو اہلِ کتاب تھے اور اب مسلمان ہو گئے ہیں، اس کی ترتیب و تدوین ہیں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ نیز کہتے کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں اور قصے ہیں، جس کو اس نے لکھوا لیا ہے اور اب قرآن کے نام سے ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور خدا کی جانب سے فرستادہ ہیں۔ ان کا پیش کردہ کلام، خدا کا کلام ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس میں ایسا علم اور ایسی وسعتِ معارف ہے جو اللہ کے ساتھ مختص ہے۔

جس طرح آسمانوں اور زمین کے بھیدوں اور اسرارِ کائنات کو بجز خالقِ کون و مکان کوئی نہیں جانتا، اسی طرح ان علوم و معارف سے کوئی شخص آگاہ نہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے پر سب سے بڑی دلیل اس کی وسعتِ معانی اور ذخارتِ معلومات ہے۔

کیا کوئی انسان اتنا بلیغ، اتنا جامع اور جملہ ضروریاتِ انسانی کو پورا کرنے والا کلام پیش کر سکتا ہے؟ ایک ایسا کلام جس میں عقائد بھی ہوں، اخلاق کی تفصیل بھی ہو اور معاشرت کی گتھیاں بھی سلجھائی گئی ہوں، جس میں اقوام و ملل کے حالات اور نفسیات عروج و زوال کی داستان بھی ہو، جس میں حیرت انگیز پیش گوئیاں ہوں، اور غیوب کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہو، جس کا اندازِ بیان بالکل فطری، جاذب اور حیران کن طور پر معجزانہ ہو، جس کے متعلق ساری دنیا کو مقابلے

کی دعوت دی جائے، جس کو سُن کر بڑے بڑے فصحا لکھنا چھوڑ دیں، قوم میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دے جو مُردوں میں جان ڈال دے اور زندوں کو عروج و ارتقا کے بام بلند تک پہنچا دے۔ ایسا عظیم المرتبت کلام یقیناً انسان کی وسعت سے باہر ہے۔"

اسلام دینِ تبلیغ ہے، تبلیغ اور مبلّغ کے ضمن میں قرآن کی جو ہدایات ہیں ان سے قطع نظر کر کے محض ایک مقام قابل غور ہے۔ سورہ طٰہٰ کی آیت ۴۴ ــــ موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی فرعون کے پاس جا رہے ہیں تو انھیں شیریں بیانی کی ہدایت ہے۔ متعلقہ آیت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ کرنے کے بعد مولانا کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے سر اٹھا رکھا ہے۔ سو اُس سے نرمی سے بات کرو، شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔

شیریں گفتار ہونا مبلّغ کے لیے ضروری ہے۔

" فرعون کے پاس بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو جو نصیحتیں ارشاد فرمائی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ آج کل کے علما کو آبِ زر سے لکھ لینا چاہیے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ دیکھنا میری یاد سے غافل نہ ہو جانا اور ہر وقت عبودیت اور نیازمندی کے تعلقات کو قائم رکھنا۔ کیونکہ یہی چیز ہے جس سے دلوں میں پاکیزگی موجود رہتی ہے اور انسان دنیا کی تمام لذتوں کو آخرت کے مقابلے میں حقیر سمجھتا ہے۔ ذکر و شغل کی برکات سے روح میں نزہت و توانائی پیدا ہوتی ہے اور دل و دماغ مجلّے اور روشن ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ اکسیر ہے جس کے باعث چہروں پر نور اور قلب میں سرور موج زن ہوتا ہے اور یہی وہ کبریتِ احمر ہے جس سے بہرہ ور ہونے والا انسان حقیقتاً نہایت خوش قسمت انسان ہے۔

موسیٰ اور ہارون چوں کہ ایک بہت بڑی مادی قوت سے نبرد آزما ہونے کے لیے جا رہے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان میں اسی تناسب سے روحانیت ہو اور فرعون کے عساکر کے مقابلے میں ان کے پاس بھی اللہ کی زبردست اعانت موجود ہو۔

علما اور راہنمایانِ دین کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ بھی اللہ کے اس ارشاد کو نہ بھولیں اور مقامِ اصلاح پر جلوہ فرما ہونے سے پہلے صالح، نیک اور خدا پرست انسان بننے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جب کبر و غرور کے اس مجسمے کے پاس جاؤ جس کا نام فرعون ہے تو نہایت رفق و ملاطفت سے پیش آنا۔ حلاوت و شیرینی سے باتیں کرنا تاکہ اُس کے دل میں اثر پیدا ہو سکے اور اس کی قساوتِ قلبی پر خشیتِ الٰہی غالب ہو جائے۔ یہاں ذرا ملاحظہ کیجیے۔ فرعون کے مقابلے میں جو جابر ہے، ظالم ہے اور بدرجہ اتم سرکش ہے، اپنے پیغمبر کو اخوت اور ملاطفت کی تلقین کی جا رہی ہے۔ سوچیے اور بتائیے، ہمارے علما اور قدسیانِ طریقت کا رویہ عام مسلمانوں کے مقابلے میں کیا ایسا ہی ہے؟ وہ مسلمان جو کلمہ گو ہیں، خدا کو ایک مانتے ہیں اور فروتنی و انکسار سے رہنا اپنے لیے فخر جانتے ہیں، ان کی ادنےٰ کوتاہیوں اور لغزشوں پر ہمارے علما اور مرشدین کس خشونت اور درشتی سے پیش آتے ہیں؟"

مولانا ندوی کی تفسیر کا یہ حصہ نہایت شاندار ہے۔ غور فرمایے آج کا اندازِ تبلیغ اس حکم و ہدایتِ ربانی سے کوئی مناسبت رکھتا ہے؟ حضرت مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ کاندھلوی ثم دہلوی کی تبلیغی تحریک کے علاوہ باقی دعاۃ و مبلّغین کا بالعموم حال "مصیطر" ہو کر رہ گیا ہے۔ حالاں کہ قرآن نے تذکیر، تبلیغ، دعوت اور ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جو بذاتِ خود نرم روی، اسلوب و بیان کی شیرینی اور الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں۔

آخر میں "یاجوج ماجوج" کے عنوان سے ایک مختصر نوٹ ــــ یاجوج ماجوج اس دنیائے دوں کے دورِ آخر کا ایک ہنگامہ ہے ــــ طول طویل بحثیں اس ضمن میں ہوئی ہیں، جن سے عام قاری پریشان ہو جاتے ہیں ــــ اس باب میں مولانا ندوی کا نوٹ مختصر ہے اور واضح ــــ کہ دین داری کے خلاف جنگ کی صورت و کیفیت پیدا ہو جائے گی تو خدائی انتقام کا ایک مظہر یہ بھی ہو گا۔ اتنی ہی حقیقت سمجھنا ہماری ضرورت ہے ــــ اس قوم کا تعیّن اور اس کے خروج کا وقت اور تفصیلات ہماری ضرورت نہیں۔ ہماری ضرورت اپنے اجتماعی کردار کا جائزہ لینا ہے، اس میں نقص اور جھول نہیں تو یاجوج ماجوج سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر اس کی چولیں ہل چکی ہیں تو پھر یہ خطرہ ٹل نہیں سکتا۔ (ص ۷۸۸ سورۂ انبیاء آیت ۹۶)

"یاجوج وماجوج کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں، مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ قوموں کی بدعقیدگی اور مظالم کا ایک طوفان اُٹھے گا جو نظامِ عالم کو تہ و بالا کر دے گا، اور یہ اُس وقت ہوگا جب کہ مذہب کی وقعت دلوں سے اُٹھ جائے گی۔ دین داری کے خلاف جنگ کی جائے گی اور نظامِ کائنات کی بنیادیں محض ہوس و جُوع پر رکھی جائیں گی۔ جب انسانوں میں شریر اور بدباطن لوگ رہ جائیں گے اور صرف مادیّت کی حکومت ہوگی۔

ان حالات میں بطور انتقام اللہ تعالیٰ ایک قوم کو تباہی و غارت گری کے لیے انسانوں پر مسلّط کر دیں گے تاکہ یہ بات ثابت ہو کہ انتہائے مادیّت کے معنی آخری تباہی کے ہیں۔"

یہ ہے مولانا محمد حنیف ندوی کی تفسیر "سراج البیان" کا تعارف۔ اسے مختصر سمجھیے یا مفصّل، یہ آپ کی مرضی ——! میں اپنے طور پر یہی سمجھتا ہوں کہ میں اس کے تعارف کا پورا حق ادا نہیں کر سکا۔ اس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مزید لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ مکمل کتاب انتہائی بھاگ دوڑ اور کوشش کے باوجود مجھے میسّر نہ ہو سکی۔ جو حصہ ملا، اس پر اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کر دیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ مولانا کو قرآنِ مجید سے بے پناہ محبت ہے، تفسیر سراج البیان کے علاوہ ان کی کتابوں —— مطالعۂ قرآن اور لسان القرآن کی جلد اوّل اور جلد دوم —— سے بھی اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ لسان القرآن کی ابھی دو جلدیں چھپی ہیں اور تیسری جلد کا مسودہ تقریباً سو صفحات تک پہنچا تھا کہ مولانا بیمار ہو گئے۔ خدا انھیں صحتِ کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے اور کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مولانا محمد حنیف ندوی

اور ان کی خدماتِ گوناگوں

محمد اسحاق بھٹی

قدرے چھوٹا قد، گورا اور سُرخ رنگ، سفید معتدل داڑھی، کشادہ پیشانی، چمک دار آنکھیں جن پر نظر کی عینک چڑھی رہتی ہے، مُسکراتا ہوا باوقار چہرہ، گرمیوں میں سفید لٹھے کا پاجامہ اور سفید رنگ کا کُرتہ، سردیوں میں گرم کپڑے کا پاجامہ، شیروانی یا واسکٹ زیب تن، سر پر قراقلی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی جو مدتِ مدید سے اُن کا امتیازی نشان ہے۔ گھٹنوں میں درد کی وجہ سے چلنے میں کچھ دشواری کا احساس، چائے کے رسیا، خوش مزاج، خوش کلام، لطیفہ سننے کے عادی اور سنانے کے لیے بے تاب، حاضر جواب، نازک اندام، دوستوں کے دوست، ہر ایک کے بہی خواہ، متعدد کتابوں کے مصنف، مفسرِ قرآن، کتاب و سنت کے شیدائی، بے نظیر مترجم، بہت بڑے نقّاد، بہترین تجزیہ نگار، عربی کے ادیب، اُردو کے خطیب، فلسفے کے دل دادہ، بلند پایہ عالمِ دین، منقول و معقول میں یکساں ماہر، ہر حلقے میں مقبول، علما کے قدردان، اصحابِ فکر کے مداح، ذاتی تعریف و تنقیص سے بے نیاز، متوکل علی اللہ، صوفیانہ اطوار کے حامل، درویش منش، خوددار، مگر انانیت سے نفور، بقولِ خود لکھنے میں سُست، بقول میرے باتوں میں چُست —— یہ ہیں مولانا محمد حنیف ندوی۔

مولد و منشا

مولانا محمد حنیف ندوی ۱۰۔ جون ۱۹۰۸ء کو پنجاب کے مردم خیز شہر گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ والد کا اسمِ گرامی نورالدین تھا جو زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے، لیکن نہایت متدیّن اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ بیٹے نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو باپ نے سرکاری سکول میں داخل کرا دیا، جہاں چار جماعتوں تک تعلیم پائی، جسے اس زمانے میں پرائمری کہا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ناظرہ قرآنِ مجید پڑھ لیا۔

دینی تعلیم کا حصول

گوجرانوالہ کے "نسیائیں محلہ" میں جماعت اہل حدیث کی ایک جامع مسجد ہے جو اس دَور میں زیادہ وسیع نہ تھی۔ اس مسجد میں مولوی علاءالدین مرحوم امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، جو مشہور عالم و صوفی مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ والا، ضلع گوجرانوالہ۔ وفات ۱۲۹۱ھ) کے شاگرد اور مرید تھے۔ اس مسجد کو "مولوی علاءالدین کی مسجد" کہا جاتا تھا۔

۱۹۲۱ء میں گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث نے مولانا محمد اسماعیل صاحب کی خدمات حاصل کر لیں جو اسی ضلع کے رہنے والے تھے اور وزیرآباد کے قریب ایک گاؤں "دھونیکے" سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں کے ایک علمی خاندان کے فردِ

فرید تھے۔ جلیل القدر عالم، معقولات و منقولات کے ماہرِ کامل اور بہت بڑے مقرر اور خطیب تھے۔ انھوں نے اس مسجد میں خطابت و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا اور اس کو بہت وسعت دی۔ اب اسے "مولانا اسماعیل کی مسجد" کہا جانے لگا۔ مولانا نے اس میں جو مدرسہ قائم کیا، اس کا نام "مدرسہ محمدیہ" رکھا۔ ان کے علم و ادراک، فضل و کمال اور تقریر و خطابت کا شہرہ تھوڑے ہی عرصے میں دور دور تک پہنچ گیا اور مختلف علاقوں سے طالبانِ علم ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔

نوعمر محمد حنیف کے والدِ محترم کے دل میں بھی بیٹے کو دینی تعلیم دلانے کا شوق پیدا ہوا اور اُسے مولانا محمد اسماعیل صاحب کے حلقۂ درس میں شامل کر دیا گیا۔ یہ نہایت ذہین اور ہونہار طالب علم تھے، خوب محنت اور لگن سے پڑھتے تھے، اس لیے مولانا اسماعیل صاحب بھی ان سے بہت خوش رہتے اور ان پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۵ء میں جب کہ ان کی عمر صرف سترہ اٹھارہ سال کی تھی، مروجہ علوم کے حصول سے فارغ ہو گئے۔ گوجرانوالہ میں محمد حنیف پہلے طالب علم تھے، جنھوں نے مولانا محمد اسماعیل صاحب سے علومِ متداولہ کی تحصیل کی اور ان کی شاگردی سے مفتخر ہوئے۔ انھوں نے اپنے اس لائق شاگرد کی بہترین طریقے سے علمی تربیت کی۔ اس پائے کا ذہین شاگرد انھیں بعد میں نہیں ملا۔ لائق شاگرد اب بھی عالی قدر استاد کی گوناگوں کرم فرمائیوں اور ان کے اندازِ تعلیم اور اسلوبِ تربیت کی خصوصیات کا ذکر انتہائی فخر سے کرتے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل نے ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کو وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔

ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخلہ

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا اسماعیل صاحب نے مونہار شاگرد کو لکھنؤ جانے اور دارالعلوم ندوۃ العلما میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ان کے داخلے کے لیے سفارشی خط لکھا۔ مولانا

حنیف ۱۹۲۵ء کے آخر میں لکھنؤ پہنچے اور دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا۔ اس وقت برصغیر میں ندوہ کو مہدِ علم اور مرکزِ علما کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے فارغ التحصیل حضرات کو ہر حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس دور کے ندوہ کے نامور اساتذہ کی فہرست میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا حیدر حسن محدث ٹونکی اور شمس العلما مولانا حفیظ اللہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی انتہائی صاف ستھرے ذہن کے عالم دین تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اصحابِ عقیدت میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولانا آزاد نے ترکِ موالات کے عہدِ شباب میں کلکتے کی جامع مسجد میں جب مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو اس کی صدر مدرسی کے عہدے پر انہی کو فائز کیا گیا تھا۔ اس کے بعد انھیں ندوہ میں استادِ ادب مقرر کیا گیا۔ اس سراپا عمل عالم نے ۶ مارچ ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ میں وفات پائی — مولانا حنیف ان سے زیادہ استفادہ تو نہیں کر سکے، البتہ ان کے عمل و کردار کی رفعتوں سے متاثر بہت ہوئے۔

مولانا حیدر حسن ٹونکی دارالعلوم ندوۃ العلما میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر متمکن تھے، علومِ نقلیہ و عقلیہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ رجالِ حدیث پر گہری نظر تھی اور علمِ حدیث بطرزِ حنفیہ پڑھانے میں یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ (جون ۱۹۴۲) کو اپنے آبائی وطن ٹونک میں فوت ہوئے — مولانا حنیف ندوی نے ان سے بہت استفادہ کیا۔

شمس العلما مولانا حفیظ اللہ صاحب ۱۸۵۶ء کے آخر میں ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک گاؤں "بندی" میں پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی (متوفی ۲۹۔ ربیع الاوّل ۱۳۰۴ھ) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ منقولات و معقولات دونوں سے برابر کا تعلق تھا اور تمام اصنافِ علم میں درجۂ امامت پر فائز تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کے معاصر تھے۔ جب دونوں کسی مجلس میں یک جا

ہو جاتے تو خوب علمی بحثیں چلتیں۔ دار العلوم ندوۃ العلما کے وقتِ افتتاح میں اس کے مہتمم اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء تک اس مسند پر متمکن رہے، اسی زمانے میں سید سلیمان ندوی ان کے دائرۂ شاگردی میں شامل ہوئے اور اُن سے منقولات و معقولات کی کتابیں پڑھیں۔

۱۹۰۸ء میں وہ دار العلوم ندوۃ العلما سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تو حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ حج سے واپس آئے تو ندوہ کے اربابِ انتظام کے اصرار پر دوبارہ ندوہ کی صدر مدرسی قبول فرمائی اور کئی سال یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں ندوہ سے الگ ہو کر واپس اپنے گاؤں بندی (ضلع اعظم گڑھ) چلے گئے۔ یہیں ۷۔ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ (فروری ۱۹۴۴ء) کو راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ مسلکاً اہلِ حدیث تھے ـــــ مولانا حنیف ندوی ان کے علم و عرفان کی فراوانیوں سے بہت مستفید ہوئے۔

ندوہ کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا نے ایک افسانہ لکھا، جس کا عنوان تھا، "ماں"۔ یہ ایک اصلاحی اور معاشرتی افسانہ تھا جو لکھنؤ کے ایک ماہانہ رسالے میں ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا اور پھر اس رسالے سے وہاں کے بعض اور رسالوں نے نقل کیا۔ مولانا کی یہ پہلی تحریر تھی جو کسی ماہانہ رسالے میں شائع ہوئی۔

مولانا کو عربی ادب سے ہمیشہ شغف رہا اور اس میں مہارت پیدا کی۔ یہ بات ایک مرتبہ ہندوستان کے مشہور مورّخ و محقق سید صباح الدین عبدالرحمٰن (ناظم دار المصنفین و ایڈیٹر ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ) نے بھی لکھی تھی۔ آٹھ نو سال پہلے جب وہ پاکستان آئے تو ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں بھی تشریف لائے اور ارکانِ ادارہ سے ملاقات کی۔ ہندوستان واپس جا کر انھوں نے سفرِ پاکستان سے متعلق "معارف" میں اپنے تاثرات لکھے تو مولانا حنیف ندوی کے بارے میں لکھا تھا کہ ندوہ کے قدیم طلبا کی روددادوں میں مولانا حنیف ندوی کا ذکر بہترین الفاظ میں کیا گیا ہے اور یہ بات خاص طور سے بیان کی گئی ہے کہ عربی ادبیات پر اس طالب علم کی

نہایت گہری نظر ہے اور ذہانت و فطانت میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔

یہ تو سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی ایک تحریر کا حوالہ ہے۔ اب مولانا کی سنیے۔ ایک دفعہ ان کو عربی میں شاعری فرمانے کا شوق چرایا۔ دو تین دن کی محنتِ شاقہ سے ایک طویل نظم لکھی اور اپنے جی میں بہت خوش ہوئے۔ نظم لے کر عربی ادب کے استاد کی خدمت میں گئے اور انھیں نظم دکھائی۔ استاد نے غور سے نظم پڑھی۔ مسکرا کر فرمایا "عزیزم! نہایت عمدہ نثر ہے"۔ استاد کے یہ الفاظ سن کر ہمیشہ کے لیے اس سے توبہ کر لی اور یہ وہم دل سے نکال دیا کہ وہ عربی میں شاعری بھی کر سکتے ہیں۔

ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ مولانا کے زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ لکھنؤ میں ہوا، جس میں پنجاب سے قاضی سلیمان منصور پوری (مصنف رحمۃ للعالمین) اور مولانا ظفر علی خاں تشریف لے گئے تھے۔ سیّد سلیمان ندوی نے ان دونوں سے حنیف ندوی کا تعارف کرایا اور فرمایا یہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں اور ذہین طالب علم ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کو بتایا کہ یہ آپ کے وطن گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں اور قاضی صاحب سے فرمایا، آپ کے ہم مسلک ہیں۔ حنیف ندوی نے سیّد صاحب کے حکم کے مطابق طالب علم کی حیثیت سے جلسۂ عام میں عربی میں تقریر کی۔ علما اور اساتذہ نے بہت داد دی۔ مولانا ظفر علی خاں اور قاضی صاحب نے بالخصوص مسرت کا اظہار کیا اور ساتھ ہی قاضی صاحب نے آہستہ سے فرمایا: "میاں عمامہ باندھا کرو"۔

قاضی صاحب نے ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء کو اور مولانا ظفر علی خاں نے ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔

تقریباً پانچ سال مولانا حنیف دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں اقامت گزیں رہے۔ ابتدائی تین سال میں وہاں کی نصابی کتابیں مکمل کیں اور آخری دو سال میں تفسیرِ قرآن میں درجۂ تخصص کیا۔

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) میں رہے۔

وہاں ان کا ارادہ تصنیفی و تالیفی کام کرنے کا تھا۔ لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمایا کہ ندوہ کے فارغ علما و طلبا تقریر کے میدان میں پیچھے ہیں، حالانکہ یہ نہایت ضروری اور بنیادی کام ہے۔ آپ تقریر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ یہ میدان آپ کو سنبھال لینا چاہیے۔ چنانچہ مولانا ۱۹۳۰ء کے آغاز میں واپس اپنے وطن گوجرانوالہ آ گئے۔

دار المصنفین کا ماحول مولانا کے لیے بڑا پُرکشش تھا اور وہاں کے اہلِ علم اور اُن کے طریقِ عمل سے وہ بے حد متاثر تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ دوپہر کا کھانا تمام مصنفین کے گھروں سے آجاتا اور سب حضرات اکٹھے کھانا کھاتے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے علم و تحقیق کے مولانا حنیف ندوی بہت مداح ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا عبدالسلام لمبا سا کوٹ پہنتے تھے۔ گرمیوں میں بھی اور سردیوں میں بھی لمبا کوٹ ان کے زیب تن رہتا اور وہ شدید گرمی کے موسم میں کمرے میں بیٹھے تصنیفی کام کرتے رہتے۔ عام طور پر دوپہر کے کھانے میں ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ (مولانا حنیف ندوی کو وہ "خاں صاحب" کہتے تھے) ہر روز پوچھتے۔ "خاں صاحب آپ کب تشریف لائے؟" انھیں بتایا جاتا اور باتیں کی جاتیں، لیکن دوسرے دن پھر وہی سوال۔ "خاں صاحب آپ کب تشریف لائے؟"

بہرحال شوق اور کوشش کے باوجود مولانا حنیف ندوی کو دار المصنفین میں زیادہ قیام کا موقع نہ ملا۔ البتہ تقسیم ملک تک وہاں آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔

ملکی سیاست میں حصہ اور گرفتاری

وہ ہندوستان میں سیاسیات کا ہنگامہ خیز دور تھا، انگریزی حکومت کی مخالفت میں اور آزادیٔ وطن کے لیے ملک میں کئی قسم کی تحریکیں جاری تھیں۔ پنجاب کے جن علاقوں اور شہروں کے لوگ ان تحریکوں میں زیادہ سرگرمِ عمل تھے، ان میں گوجرانوالہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ وہاں نوجوانوں کی ایک سیاسی جماعت "نوجوان بھارت سبھا" کا بہت زور تھا۔ مولانا حنیف ندوی اس میں شامل ہو گئے اور

انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گرفتار کر لیے گئے۔ گوجرانوالہ کی ایک عدالت میں مقدمہ چلا اور چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ سزا کے بعد قصور جیل میں بھیج دیے گئے۔ قید کی یہ مدت وہیں گزری۔ گوجرانوالہ کے مشہور دیوبندی عالم مولانا محمد چراغ کو بھی اسی جرم اور اسی دور میں گرفتار کیا گیا تھا، انھیں نو مہینے کی سزا ہوئی تھی، وہ بھی قصور جیل میں تھے۔ دونوں نے ایک ہی جیل میں مدتِ قید پوری کی۔

مسجد مبارک کی خطابت

پہلی جنگِ عظیم کے بعد اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کے متصل لاہور کی جماعت اہل حدیث نے ایک مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام "مسجد مبارک" رکھا گیا۔ اس میں متعدد حضرات خطباتِ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ ۱۹۳۰ء کے آخر میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم (وفات ۱۵۔ مارچ ۱۹۴۸ء) کے مشورے سے مولانا حنیف ندوی کو (قید سے رہائی کے بعد) اس مسجد کا خطیب مقرر کیا گیا۔ خطابت کے علاوہ روزانہ نمازِ مغرب کے بعد درسِ قرآنِ مجید بھی ان کے فرائض میں شامل تھا۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف بائیس برس کی تھی اور درس و خطابت کی یہ پہلی اہم ذمے داری تھی جو لاہور میں ان کے سپرد ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس ذمے داری کو انھوں نے نہایت حسن و خوبی سے نبھایا۔

اس زمانے میں اسلامیہ کالج کے اکثر اساتذہ و طلبا اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ یہ حضرات مولانا کے خطبۂ جمعہ میں بھی شریک ہوتے تھے اور مغرب کے بعد درسِ قرآن میں بھی باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔ تفسیر مولانا کا خاص اور دل پسند موضوع تھا اور اب بھی ان کی دلچسپیوں کا اصل محور یہی ہے۔ عربی کی قدیم و جدید تفاسیر کھنگال ڈالی تھیں اور قرآن کے مطالب و معانی اور رموز و نکات ان کے خزانۂ ذہن میں محفوظ تھے۔ پھر نئے نئے لکھنؤ سے آئے تھے، زبان و ادب کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ تھے، کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان بولتے، جس میں گنگ و جمن

کی سی روانی تھی۔ ان اوصاف کی وجہ سے لاہور کے تمام پڑھے لکھے مسلمان حلقوں میں ان کی دھوم مچ گئی اور کثیر تعداد میں لوگ خطبے اور درس میں آنے لگے۔ مولانا ظفر علی خاں جیسے بلند پایہ خطیب و ادیب بھی ان کے سامعین میں شامل تھے اور انہماک و توجہ سے ان کی تقریر سنتے اور جھوم جھوم کر داد دیتے تھے۔

مولانا ندوی نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۹ء تک اٹھارہ سال یہ خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں انھوں نے تین مرتبہ روزانہ کے درس میں قرآن ختم کیا، اور شروع سے آخر تک دو مرتبہ خطباتِ جمعہ میں قرآن ختم کر کے تیسری مرتبہ تیسویں پارے کی سورہ والتین تک پہنچے تھے کہ یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے اختتام کو پہنچ گیا اور مسجدِ مبارک میں آنے والے لوگ ان کے افکارِ عالیہ کی سماعت سے محروم ہو گئے۔

اٹھارہ سال کی اس مدت میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ، لاہور) کے بہت سے اساتذہ اور طلبا نے ان سے استفادہ کیا، قرآنِ مجید کے مطالب کو سمجھا، اسلامی احکام کے نازک ترین پہلوؤں کو فہم کی گرفت میں لائے اور عربی ادبیات کی تعلیم حاصل کی۔ اُس عہد کے طلبا، جن میں کئی حضرات، بعد میں اونچے مناصب پر فائز ہوئے، اب بھی مولانا کی خدمت میں آتے ہیں اور ان سے اپنی نسبتِ تلمذ اور کثرتِ استفادہ کا پُر افتخار الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

اس زمانے کے بعض اساتذہ کو میں نے دیکھا کہ وہ متعدد ایسے مشکل مسائل کا ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے مولانا سے سمجھے اور راہِ راست پر آئے۔ اس کالج کے اساتذہ و طلبا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہا کرتے ہیں کہ اگر مولانا حنیف ندوی وجودِ باری، وجودِ ملائکہ، حیات بعد الممات، جنت و دوزخ اور تقدیر وغیرہ کے مسائل میں ان کی رہنمائی نہ کرتے تو وہ الحاد و انکار کی راہوں پر گامزن ہو چکے ہوتے۔ مولانا نے ان کو ان مسائل کی حقیقت اور اسلام کی حقانیت سے آگاہ کیا اور وہ ان کی ہدایت کا باعث بنے۔

مولانا ندوی کی خوبی یہ ہے کہ پورے غور سے دوسرے کی بات سنتے ہیں،

زیرِ بحث مسئلے سے متعلق اس کے شکوک و شبہات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کی نفسیات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اس کے فہم و فکر کے مطابق اس کے ذہن میں اُتر کر ایسے پیرایۂ بیان میں اس کو سمجھاتے ہیں کہ ہر بات آسانی سے اس کے فہم میں آتی اور ذہن میں پیوست ہوتی جاتی ہے، اور پھر وہ مطمئن ہو کر واپس جاتا ہے۔

مخاطب سے کوئی زائد بات کرنا، اس کے دائرۂ سوال سے جواب کے حدود کو آگے بڑھانا، یا کثرتِ تاویل سے اس کو ذہنی اور فکری پریشانی میں ڈالنا ہرگز ان کی فطرت میں داخل نہیں۔ قلم اور زبان دونوں ان کے قابو میں ہیں اور دونوں کو ان کی اطاعت گزاری پر فخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطباتِ جمعہ اور درسِ قرآن سے بھی بے شمار لوگ مستفید ہوئے اور تحریر سے بھی تعلیم یافتہ طبقے نے خوب استفادہ کیا۔

ایک دلچسپ انٹرویو

مسجد مبارک کے دورِ درس و خطابت (غالباً ۱۹۳۳ء) میں اسلامیہ کالج کے بعض متعلقین نے مولانا پر زور دیا کہ وہ کالج کی مجلسِ انتظامیہ سے درخواست کریں کہ انھیں کالج میں عربی پڑھانے کے لیے استاد مقرر کیا جائے۔ مولانا نے انکار کیا اور کہا کہ مسجد کے درس و خطابت کی ذمے داری ہی میرے لیے کافی ہے، اس سے زیادہ میں کوئی ذمے داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔ دوستوں نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا، میں درخواست نہیں دوں گا، البتہ اگر انتظامیہ اپنے طور پر میری خدمات حاصل کرنا چاہے تو غور کروں گا۔ بالآخر مولانا کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ انٹرویو بورڈ کے تین ممبر تھے، جن میں دو مولانا کے علم و ادراک اور ان کی قابلیت و صلاحیت سے باخبر تھے۔ ایک ممبر مولانا سے واقف نہ تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں ایک بڑے تعلیمی منصب پر فائز تھے اور کسی کو خاطر میں لانا انھیں گوارا نہ تھا۔ ان کے اور مولانا کے درمیان جو سوال و جواب ہوئے وہ ملاحظہ فرمایئے:

سوال: "آپ مولوی فاضل ہیں؟"

جواب : "نہیں"!

سوال : "کہاں کے فارغ التحصیل ہیں"؟

جواب : "ندوۃ العلما لکھنؤ کے"!

سوال : "عربی جانتے ہیں؟"

جواب : "جی ہاں! جانتا ہوں"!

سوال : "آپ میں اور پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل میں کیا فرق ہے"؟

جواب : "فرق یہ ہے کہ آپ کی پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل مجھ سے عربی پڑھتے ہیں!"

سوال : "آپ تقریر کر سکتے ہیں؟"

جواب : "تقریر کرنا تو میرا معمول ہے"!

سوال : "کسی موضوع پر پانچ منٹ تقریر کیجیے۔"

جواب : "میں مقرر ہوں، ایکٹر نہیں ہوں"۔

سوال : "کیا مطلب"؟

جواب : "مطلب واضح ہے۔ میں اس انٹرویو بورڈ کے سامنے بیٹھا ہوں، جسے اسلامیہ کالج میں عربی کا استاد مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، فلم سٹوڈیو میں کسی ہدایت کار کے سامنے نہیں کھڑا ہوں جو اپنی فلم کے کسی حصے کے لیے مجھ سے تقریر کرانا چاہتا ہو۔ اگر آپ میری تقریر سننا چاہتے ہیں تو نمازِ مغرب کے بعد مسجد مبارک میں میرے درسِ قرآن میں تشریف لائیے یا جمعے کے روز میرے خطبۂ جمعہ میں آیئے"۔

یہ الفاظ کہے اور السلام علیکم کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ ایک ممبر دوڑتے ہوئے آئے اور کمرے میں واپس جانے کی درخواست کی۔ فرمایا "میں نے دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اور آپ کی دعوت پر یہاں آکر سخت غلطی کی ہے اور اپنی خود داری کو مجروح کیا ہے۔ اب پھر واپس جا کر اپنی دینی اور علمی غیرت کی نفی نہیں کرنا چاہتا۔

میرے لیے مسجدِ مبارک کا درس اور خطابت ہی بہت ہے، اور یہی کام میرے ذوق اور مزاج کے مطابق ہے۔"

ملازمت کی پیش کشیں

مسجد مبارک کے زمانۂ خطابت میں مولانا ندوی کو ملازمت کی متعدد پیش کشیں ہوئیں۔ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار "زمیندار" اس زمانے میں بہت بڑا اخبار تھا، انھوں نے مولانا ندوی کو اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے بطریقِ احسن معذرت کر دی۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک ان کے مخلص اور بے تکلّف دوستوں میں سے تھے، انھوں نے بھی اخبار "انقلاب" کے لیے کہا، مگر مولانا نہیں مانے۔ مولانا چراغ حسن حسرت سے ان کے گہرے مراسم تھے اور وہ اِن کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ انھوں نے کئی دفعہ ان سے کہا کہ وہ کسی اخبار میں ان کے انسلاک کا انتظام کرنے کو تیار ہیں، لیکن مولانا رضامند نہ ہوئے۔

مولانا ندوی کسی اخبار سے تعلق نہ قائم کرنے کی تین وجوہ بیان کرتے ہیں:

۱۔ روزانہ اخبار میں لکھنے سے مزاج علمی اور تحقیقی نہیں رہتا، خالص صحافیانہ سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور ہر وقت یہی سوچ ذہن پر مسلّط رہتی ہے کہ آج یہ لکھنا ہے اور کل یہ لکھنا ہے۔

۲۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو بات کہنا مقصود ہو، وہ کہی نہیں جاسکتی اور جو کہنے کو جی نہ چاہے، وہ کہنا پڑتی ہے۔ قلب و ضمیر حالات کی مجبوریوں کی زنجیر میں جکڑے رہتے ہیں۔

۳۔ روزانہ لکھنے سے زبان و ادا کا معیار برقرار نہیں رہتا۔

مولانا کی یہ باتیں صحیح ہیں، لیکن مَیں چونکہ ان کے مزاج و طبیعت سے واقف ہوں، اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ دو وجہیں اور بھی ہیں جو ان کی کسی اخبار سے وابستگی اختیار کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی رہیں ___ ایک ان کی قناعت کہ جو کچھ تھوڑا ا بہت کہہ رہے ہیں، وہی کافی ہے اور اسی پر قانع ہیں ___ دوسرے ان کا روایتی

تکاسل اور طبعی تساہل، جس کی وجہ سے باقاعدہ روزانہ کسی خاص موضوع اور بروقت لکھنے کی ذمے داری کو نباہنا ان کے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ کوئی مضمون لکھوانے کے لیے انھیں بار بار کہنا پڑتا ہے اور وہ ہر وقت طرح دینے اور جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر لکھنے کے لیے مجبور ہو جائیں تو پہلے چائے پئیں گے، پھر ذہن کو تیار کریں گے اور بڑی مشکل سے لکھنا شروع کریں گے۔ لیکن جب لکھنے بیٹھ جائیں تو پھر ذہن میں الفاظ و افکار کا سیلاب اُمنڈ آتا ہے اور وہ الفاظ و افکار نہایت دلکش اور دلآویز جملوں کی شکل میں سطحِ قرطاس پر بکھرنے اور نمودار ہونے لگتے ہیں۔

مولانا سے عام طور پر ایک نشست میں مضمون مکمل نہیں ہو سکتا۔ اکثر دو یا تین نشستوں بلکہ بعض اوقات دو تین دن میں مضمون تکمیل کی منزل کو پہنچتا ہے۔ لکھنے کے بعد بسا اوقات اس کے بعض حصے سناتے ہیں اور داد طلب انداز سے پوچھتے ہیں، کیسا ہے؟ ٹھیک ہے نا، کوئی کمی تو نہیں رہی؟ پھر کہتے ہیں کاتب کو دے دو اور تاکید کر دو کہ صحیح صحیح لکھے، پروف ریڈنگ اچھی طرح کر لینا، کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ صحت کی ذمے داری آپ پر ہے۔

اب مولانا ندوی کی ان تصنیفی و تحریری کاوشوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے آزادئ ملک سے قبل یا اس کے بعد (ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے علاوہ) دیگر اداروں کے لیے کیں۔

تفسیر سراج البیان

۱۹۳۴ میں یا اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا نے "تفسیر سراج البیان" لکھی جو کشمیری بازار لاہور کے مشہور تاجرِ کتب ملک سراج الدین نے شائع کی۔ یہ تفسیر پانچ ضخیم جلدوں پر محیط ہے اور اپنے مشمولات و محتویات کے اعتبار سے نہایت عمدہ تفسیر ہے۔ کتابی شکل میں مولانا کا یہ پہلا علمی اور تحقیقی شاہکار ہے۔ اس کی قبولیتِ عامہ کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یہ چودہ پندرہ دفعہ چھپ چکی ہے۔ آخری

بار ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ناشر کے پاس اس کا ایک نسخہ بھی نہیں ہے۔ بیس سال کے بعد اب یہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

تیس بتیس سال میں کسی کتاب کا چودہ پندرہ مرتبہ چھپ جانا بہت بڑی بات ہے۔ میرا خیال ہے، اس قدر تھوڑی مدت میں اتنی مرتبہ قرآن مجید کی کوئی اردو تفسیر شائع نہیں ہوئی۔ یہ ریکارڈ اشاعت ہے۔

خیر، اس سے زیادہ اس تفسیر کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس پر مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی کا تفصیلی مضمون اس کتاب (ارمغانِ حنیف) میں چھپ چکا ہے۔ علوی صاحب نے یہ مضمون نہایت محنت اور عقیدت سے لکھا ہے اور تفسیر سراج البیان کا (دست یاب حصے کی روشنی میں) پورا تعارف کرا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اور کوئی شخص اس تفسیر سے متعلق اس درجے مفصل اور جامع مضمون نہیں لکھ سکتا تھا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نہ تو مولانا کے پاس اس تفسیر کا کوئی نسخہ موجود ہے اور نہ اس کا اصل نام ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ اس کا نام "سراج التفاسیر" بتاتے تھے۔ یہ تو اللہ بھلا کرے علوی صاحب کا کہ انھوں نے اس کا سراغ لگایا، اس کے صحیح نام اور بعض مندرجات کا پتا چلایا اور اس پر جامع مقالہ سپردِ قلم کیا۔

مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمۂ قرآن پر نظرِ ثانی

مولانا فتح محمد جالندھری کا ترجمۂ قرآن، تراجمِ قرآن میں مستند اور مشہور و متداول ترجمہ ہے۔ اس کی طباعت کا مرحلہ پیش آیا تو مولانا فتح محمد وفات پا چکے تھے۔ شاید یہ بات انکشاف کی حیثیت رکھتی ہو کہ اس کے ناشر نے ترجمے پر نظرِ ثانی کے لیے مولانا محمد حنیف ندوی سے رجوع کیا۔ مولانا نے نظرِ ثانی کا کام شروع کیا تو مولانا جالندھری کے ورثا کو اس کا پتا چل گیا۔ انھوں نے اسے برا مانا اور کہا کہ یہ ترجمہ اتنا عمدہ ہے کہ اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت نہیں۔ ان میں سے بعض حضرات نے خود مولانا ندوی سے بھی اس قسم کے الفاظ کہے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ اگر اس کی اصلاح ہوگی تو اس کا کریڈٹ مترجم کو ملے گا، مجھے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہرحال مولانا نے نظرِ ثانی کا سلسلہ

جاری رکھا اور اس کے اکثر مقامات میں ردّ و بدل کیا۔ اس کے بعد جب مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کے وارثوں نے اسے دیکھا اور تبدیل شدہ مقامات پر نگاہ ڈالی تو انتہائی خوش ہوئے، مولانا ندوی کا شکریہ ادا کیا اور اعتراف کیا کہ یہ مقامات واقعی اصلاح طلب تھے۔

مطالب القرآن فی ترجمۃ القرآن

قرآن مجید ہمیشہ مولانا ندوی کی دلچسپیوں کا محور رہا اور اس افشردۂ نور اور کتابِ ہدیٰ کو ہر لمحہ انھوں نے اپنا مرکزِ توجہ قرار دیے رکھا۔ کچھ عرصہ پیشتر ہم پر ان کی ایک اور قرآنی خدمت کا انکشاف ہوا۔

ہمارے کرم فرماؤں میں ایک بزرگ جناب شیر محمد سید ہیں، جنھیں قرآنِ مجید اور اس کے مضامین و مشمولات سے گہرا لگاؤ ہے۔ ایک دن راقم کے پاس تشریف لائے تو مولانا ندوی کی صحت کے بارے میں پوچھا اور پھر اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ میں تمھیں آج سے باون ترپن برس پیشتر کی قرآن سے متعلق مولانا کی ایک ایسی چیز دوں گا جو شاید اب تک تمھارے علم میں نہ آئی ہو گی۔ چنانچہ وہ دوسرے دن تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں "مطالب القرآن فی ترجمۃ القرآن" تھی جو لاہور کے ایک قدیم اشاعتی ادارے پیکو لمیٹڈ نے نہایت اہتمام سے خوب صورت انداز میں شائع کی تھی۔

یہ پیکو لمیٹڈ کے شائع کردہ عکسی قرآنِ مجید کی پہلی جلد ہے جو سورۂ فاتحہ سے پانچویں پارے کے اختتام تک ہے۔ اس میں دائیں جانب کے صفحے پر قرآنِ مجید کا متن ہے اور بائیں طرف اس کا ترجمہ اور حاشیے میں تفسیر ہے۔ ترجمہ سید محمد شاہ ایم اے (عربی) کا ہے اور اس پر نظرِ ثانی مجلسِ فکر و نظر نے کی ہے جو تین بزرگوں پر مشتمل ہے اور ان کے اسمائے گرامی علی الترتیب یہ ہیں! مولانا محمد حنیف صاحب ندوی خطیب جامع مبارک لاہور، مولانا شہاب الدین صاحب فاضل دیوبند، خطیب جامع مسجد چوبرجی لاہور اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی بریلوی بی، اے پرنسپل اشاعت اسلام کالج لاہور۔ نظرِ ثانی شدہ مسودے کی تصدیق کرنے والے تیرہ علمائے کرام کے نام بھی اس میں

درج ہیں، اور وہ ہیں: علامہ سید سلیمان صاحب ندوی دار المصنفین اعظم گڑھ۔ مولانا محمد قطب الدین عبد الوالی صاحب فرنگی محل، لکھنؤ۔ مولانا حیدر حسن صاحب پرنسپل دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی استاد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ، سابق نائب ناظم جمعیۃ علمائے ہند۔ مولانا عبد الرحمٰن صاحب کاشغری۔ مولانا علی محمد جان صاحب لاہوری فاضل جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ مولانا محمد خورشید علی صاحب سابق پروفیسر السنہ شرقیہ دار العلوم لاہور۔ مولانا محمد عبد العزیز صاحب جامع مسجد گوجرانوالہ۔ سید پیر ظہور شاہ صاحب قادری، سجادہ نشین جلال پوری۔ مولانا نجم الدین صاحب سابق ہیڈ مولوی اورینٹل کالج لاہور۔ مولانا محمد شبلی صاحب مدرس دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ خان بہادر شمس العلما ڈاکٹر محمد ہدایت حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی، پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ۔

"مطالب القرآن فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے پانچ پانچ پاروں میں یہ پورے قرآنِ مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ اس وقت اس کی پہلی جلد ہمارے پیشِ نگاہ ہے، اس پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ البتہ جناب شیر محمد سعید صاحب کے بقول یہ آج سے باون تریپن برس پہلے کا چھپا ہوا ہے۔ اس حساب سے اس کا سنِ اشاعت ۳۶-۱۹۳۵ بنتا ہے اور مولانا محمد حنیف ندوی کا یہ جوانی کا زمانہ ہے۔ ان کی عمر اس وقت ستائیس اٹھائیس برس کی تھی۔

صحیح بخاری کا اردو ترجمہ

۱۹۳۹ء میں مولانا ندوی کے مرحوم دوست ملک محمد رفیق نے مختلف علمی کتابوں کی نشر و اشاعت اور تراجم کے لیے لاہور میں "شرکتِ علمی لمیٹڈ" کے نام سے ایک کمپنی قائم کی۔ مولانا کا بھی اس کمپنی سے تعلق تھا۔ اس کمپنی کی طرف سے صحیح بخاری کے اردو ترجمے کا منصوبہ تیار کیا گیا اور یہ اہم کام مولانا ہی کے سپرد ہوا۔ مولانا نے "الاسوہ" کے نام سے صحیح بخاری کے ترجمے اور جامع اردو شرح کا کام شروع کیا، لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ مولانا سے تو پتا نہیں چل سکا کہ صحیح بخاری کا ترجمہ کہاں تک ہو پایا تھا، لیکن ملک رفیق

مرحوم کے بڑے لڑکے خالد ملک نے بتایا کہ فل سکیپ کے کم و بیش ایک سو صفحات پر مشتمل ترجمے کا مسودہ ان کے والد مرحوم کے پاس موجود تھا ــــ صحیح بخاری کے ترجمے اور شرح کا یہ کام غالباً پانچ پاروں تک ہوا تھا۔ یہ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔

صحیح بخاری کا ترجمہ اور جامع اردو شرح

صحیح بخاری کے اردو ترجمے اور اس کی جامع شرح کا یہ اہم سلسلہ مولانا محمد حنیف ندوی نے شرکت علمی لمیٹڈ (لاہور) کی طرف سے ۱۹۳۹ء میں شروع کیا تھا۔ یہ کمپنی غالباً ۱۹۵۰ء میں ختم ہوگئی تھی۔ کام کی ابتدا صحیح بخاری کے پہلے باب سے کی گئی تھی۔ یعنی "باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ ترجمے اور شرح کا نام "الاسوہ" رکھا گیا تھا اور طے پایا تھا کہ ترجمہ اور شرح کا ہر پارہ الگ الگ شائع ہوگا اور ہر تین ماہ بعد ایک پارہ ضرور خریداروں تک پہنچ جائے گا۔

اس ترجمہ و شرح کی پہلی حدیث جو بطور نمونہ شائع کی گئی تھی، اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے سرورق پر یہ الفاظ مرقوم ہیں:

شرکت علمی لمیٹڈ کا پہلا عظیم الشان کارنامہ

یعنی

صحیح بخاری کی جامع اردو شرح

اَلاُسْوَہ

از

مولانا محمد حنیف ندوی، خطیب جامع مبارک، لاہور

ناشر

شرکت علمی لمیٹڈ۔ ۹۹ سرکلر روڈ۔ لاہور

دوسرے صفحے پر "الاسوہ" کی خصوصیات شائع کی گئی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عربی اور اردو کی کتابت خوش نما، شگفتہ اور فنی حُسن کا بہترین نمونہ۔

۲۔ ترجمہ رواں دواں، نہ اتنا لفظی کہ اس میں ادبی محاسن کا اظہار نہ ہو سکے، نہ اتنا بامحاورہ کہ نفسِ مطلب ہی مفقود ہو۔

۳۔ اگر ایک لفظ مختلف معانی کا متحمل ہے تو کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ بھی اس اختلاف کا متحمل ہو۔

۴۔ امام بخاری کا خاص فن ترجمۃ الباب کی مناسبتیں ہیں۔ اس کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۵۔ رجال پر اس حیثیت سے بحث ہے کہ ان کے زہد و ورع یا عملی زندگی میں ہمارے لیے کیا درس پنہاں ہے۔

۶۔ مطالب میں تنوع کا خیال رکھا گیا ہے، یعنی صرف مسائل ہی نہیں بیان کیے گئے ہیں بلکہ حدیث جن جن ادبی، اخلاقی، نفسیاتی اور اصلاحی نکات پر مشتمل ہے، ان کی بھی تشریح کی گئی ہے۔

۷۔ شروحِ حدیث میں ابن حجر کی وسعتوں اور عینی کی نکتہ سنجیوں سے برابر استفادہ کیا گیا ہے۔

۸۔ فقہی مدارسِ فکر میں تطبیق و رفعِ نزاع کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے اور بغیر کسی تقید کے نفسِ حدیث کی اہمیت کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔

۹۔ مخالفینِ حدیث جہاں جہاں بھٹکتے ہیں، ان مقامات کی خصوصیت سے وضاحت کی گئی ہے۔

۱۰۔ امام بخاری کی اپنی تبویب کے علاوہ مطالب کی ایک الگ تبویب بھی قائم کی گئی ہے تاکہ خورشیدِ نبوت کی ضوفشانیاں پوری طرح جلوہ گر ہو سکیں۔

اس سے آگے حدیث اور ترجمہ و تشریح ملاحظہ ہو:

"بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بَدْءُ الْوَحْيِ — وحی کی ابتدا

بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ — باب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز

اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	کیونکر ہوا ؟
وَقَوْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ	نیز اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر کہ
اِنَّا اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ کَمَا اَوْحَیْنَا	اے پیغمبر! ہم نے تمھاری طرف وحی اسی طرح بھیجی
اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِہٖ (الآیۃ)	ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد آنے والے انبیا کی طرف بھیجی۔ (النساء ۱۶۳)
حَدَّثَنَا الْحُمَیْدِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا	ہم سے حمیدی نے بیان کیا، ان سے سفیان
سُفْیَانُ	نے بیان کیا،
قَالَ حَدَّثَنَا یَحْیٰی بْنُ سَعِیْدٍ الْاَنْصَارِیُّ	ان کو یحییٰ بن سعید انصاری نے کہا۔
قَالَ اَخْبَرَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرٰھِیْمَ التَّیْمِیُّ	ان کو محمد بن ابراہیم التیمی نے خبر دی۔
اَنَّہٗ سَمِعَ عَلْقَمَۃَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّیْثِیَّ	اور انھوں نے علقمہ بن وقاص لیثی سے سنا۔
یَقُوْلُ	وہ کہتے تھے۔
سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ	میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو
اللّٰہُ عَنْہُ عَلَی الْمِنْبَرِ یَقُوْلُ	منبر پر یہ کہتے سنا کہ
سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا
وَسَلَّمَ یَقُوْلُ	آپ نے فرمایا
اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ	اعمال کا تعلق تو نیتوں سے ہے۔
وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِءٍ مَّا نَوٰی	ہر شخص وہی کچھ پائے گا جو اس کے دل میں ہے۔
فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا	سو جس نے ہجرت دنیوی مقصد کے پیشِ نظر کی
یُصِیْبُھَا اَوْ اِلَی امْرَاَۃٍ یَّنْکِحُھَا	یا اس لیے مہاجر بنا کہ کسی عورت سے شادی کر لے۔
فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ	تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہوگی۔

رجال

حُمیدی المتوفی ۲۱۹ھ ابوبکر بن عبد اللہ بن زبیر بن عیسیٰ۔ بنی اسد کی ایک شاخ حمید بن اسامہ کی طرف منسوب۔

سفیان، ابنِ عیینہ ابن عمرو الہلالی۔ المتوفی ۲۱۹ھ، کوفی المولد، مکی الاصل، زہری، عمرو بن دینار اور شعبی ایسے ستر جلیل القدر تابعین سے شرفِ سماعت حاصل ہوا۔ ان سے سفیان ثوری، احمد بن حنبل، شافعی اور ابن المدینی جیسے ائمۂ حدیث نے روایت کی۔

امام شافعی کا قول ہے کہ علما میں جو شان ہونی چاہیے وہ صرف ابنِ عیینہ کا حصّہ ہے، یعنی فتوے میں بے حد احتیاط اور تفسیر و حدیث پر بے مثل عبور۔

احمد بن عبداللہ کہا کرتے تھے، ابن عیینہ علمائے اہل حدیث میں سے ہیں۔

یحییٰ القطان کا اعتراف یوں منقول ہے کہ برابر چالیس برس سے اقلیمِ علم میں انہی کا سکّہ رواں ہے۔ سفیان ثوری ان کی مجلس میں جب تک بیٹھتے فرطِ ادب سے حدیث بیان نہ کرتے۔

ابو یوسف غسولی ان کے زہد و ورع سے متعلق اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب ان کے ہاں گیا، کھانے کے وقت جَو کی دو ہلکی پھلکی روٹیاں ان کے سامنے رکھی ہوئی پائیں۔ فرماتے تھے برسوں سے یہی غذا ہے۔

یحییٰ بن سعید الانصاری المتوفی ۱۴۳ھ۔ بہت بڑے امام، مدینہ کے قاضی۔ منصور نے انھیں عراق بھیجا تو وہاں بھی زمامِ قضا انہی کے ہاتھ میں رہی۔ انس بن مالک، سائب بن یزید، عبداللہ بن عامر، محمد بن ابی بکر وغیرہ سے روایت کی۔ اوزاعی، ابن جریج، حُمید الطویل، مالک، سفیان، حماد، لیث، ابن المبارک اور یحییٰ بن سعید القطان نے ان کے حلقۂ درس سے استفادہ کیا۔

حدیث اعمال اور ترجمۃ الباب

امام بخاری مختلف ابواب و فصول کے ماتحت احادیث کے اندراج میں عجیب جودت و جدّت کا اظہار فرماتے ہیں۔ بسا اوقات ایسی احادیث لے آتے ہیں، بظاہر جن کا ترجمۃ الباب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یا ذہن آسانی سے اِدھر منتقل نہیں ہو پاتا۔ غور و فکر سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کوئی باریک اور جامع بات کہنا چاہتے ہیں۔

ان کے پیشِ نظر کچھ معارف و نکات ہیں، جن کو سمجھانا چاہتے ہیں۔ مگر وقت کا فقہی ذوق انھیں مجبور کرتا ہے کہ تبویب کا جو انداز متعارف ہے وہ قائم رہے۔ اس لیے ایسے نوادر و مصالحِ حکمیہ کے لیے بجائے الگ باب و عنوان قائم کرنے کے، سیاقِ حدیث ہی میں جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔ حدیثِ اعمال اسی قبیل سے ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد کی تمام احادیث کا تعلق وحی کی مختلف کیفیتوں سے ہے اور اس کے بعد پوری کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی بوقلموں جلوہ فرمائیوں کا تذکرہ ہے۔ دو باتیں یہاں ذہن میں آتی ہیں۔

ایک یہ کہ امام بخاری کا مطلب اس حدیث کے اندراج سے یہ ہے کہ طالبِ حدیث یہ جان لے کہ احادیثِ رسول کی یہ چمن آرائی و دل آویزی صرف انہی لوگوں کے مذاقِ حُسن کی تسکین کا سامان پیدا کر سکے گی، جو اس کا مطالعہ خلوص و عقیدت سے کریں گے اور ان احادیث کو اس لیے پڑھیں گے تاکہ اپنی زندگی کو ان سانچوں میں ڈھال سکیں۔ لٰہذا حدیث کے مطالعہ و درس سے پہلے طالبِ سنت کو اپنے مقصد و ارادہ کی تصحیح کر لینی چاہیے

دوسری بات یہ کہ حدیث کی یہ پوری کتاب دراصل ترجمانی ہے آنحضرت کے اسوۂ پاک کی، اور اسوۂ پاک کی ساری عظمت صرف اس حقیقت میں منحصر ہے کہ آپؐ کی زندگی کے کسی گوشے میں ریاکاری و تصنّع کا وجود نہیں۔ زہد و عبادت کے نازک مسائل سے لے کر عادات و اخلاق تک کی تمام باریکیوں تک، آپ کو کسی مقام پر یہ محسوس نہیں ہوگا کہ کوئی ادا یا کوئی بات ایسی ہے جس کو موقع و مقام کی مناسبتوں کے پیشِ نظر محض دکھاوے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ جو کچھ ہے واقعی حقیقی ہے۔ آپؐ کی زندگی میں کئی مواقع ایسے آئے ہیں جہاں اگر آپؐ چاہتے تو ایک خاص طرزِ عمل اختیار کر سکتے تھے اور شاید وقتی مصلحتوں کے اعتبار سے وہ موزوں بھی ہوتا۔ مگر آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی مثالیں اور تفصیلات آگے آئیں گی، جن سے آپ کو آنحضرت کی بلندیوں کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ امام بخاری کی غرض بھی یہی ہے۔ وہ اسی لیے اس حدیث کو اِس سیاق میں لائے ہیں تاکہ آنحضرت کی زندگی کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے

آپ کے ہاتھ میں ایک معیار اور کسوٹی ہو۔ آپ اس کسوٹی سے اسوۂ پاک کی تمام ان جزئیات کی صحت، کا جائزہ لے سکیں گے جن کا تذکرہ آیندہ سینکڑوں ابواب میں آئے گا

حدیثِ اعمال کی اخلاقی حیثیت

ان فقہی تفریعات و مسائل سے قطع نظر جو صرف اس ایک حدیث سے ترتیب پاتے ہیں، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس میں ایک اخلاقی اصول مضمر ہے، اس میں انسان کی عملی زندگی کے لیے ایک بلند تر معیار پیش کیا گیا ہے۔ عام طور پر مذاہب و اخلاق کے مختلف مدرسوں نے خیر و شر کی بحث کرتے ہوئے صرف اعمال کے ظواہر پر نظر رکھی ہے اور صرف قشر و جلد کو دیکھا ہے۔ اس لیے قدرتاً نیکی و برائی کے لیے انھوں نے اعمال کی ضخامت و حجم یا اُن کے نتائج و عواقب کو کسوٹی قرار دیا ہے، اس سے قطعی بحث نہیں کی کہ اعمال کے اس باطنی شعور کو ٹٹولا جائے اور انسان کے دریچۂ دل میں جھانک کر دیکھا جائے کہ خود اس کے نزدیک اعمال کن محرکات کا نتیجہ ہیں۔ اس نقطۂ نظر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاقیات کو عملی زندگی میں کوئی مضبوط اساس نہ مل سکی اور وہ محض ایک فن ہو کر رہ گئے۔

اس حدیث میں جس باطنی شعور اور بلند تر اخلاقی اساس و معیار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اخلاص ہے۔ یعنی یہ جذبہ پنہاں کہ آپ کے اعمال کا سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے قصد و ارادہ سے قائم ہے اور اس میں ریاکاری اور دکھاوے کو کوئی دخل نہیں۔ یہ حدیث ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اعمال کا ظاہری رنگ و روغن حُسن نہیں، اصل حسن اخلاص میں ہے۔ یہاں دل کی دنیا میں اگر اس کا دَور دَورہ ہے تو پوری عملی زندگی مرصّع ہے، ورنہ بڑے سے بڑا عمل محض بے کار۔

"الاعمال" کے مقابلے میں "نیّات" کو بصورت جمع کیوں لایا گیا ہے؟

اس میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ ہر ہر عمل کے لیے اس کے شایانِ شان نیّت کی ضرورت ہے، یعنی عمل جس قدر بڑا اور نصب العین جس نسبت سے عظیم ہوگا، اسی انداز سے نیّت و قصد میں عظمت و استواری پیدا کی جائے گی۔ اتنا ہی اسے ریا کے شائبوں

سے جُدا رکھا جائے گا اور اسی نسبت سے اُسے عزم وارادہ کی ضرورتوں سے بہرہ مند کیا جائے گا۔

ایک نفسیاتی شبہ اور اُس کا جواب

یہ مان لینے کے بعد بھی کہ عمل سے پہلے نیت کا تزکیہ اور ارادے کی تطہیر ضروری ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قلب و دماغ کے وساوس و خطرات کب ہمارے اختیار میں ہیں؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم قلب و دماغ کو پوری یکسوئی کے ساتھ ایک راستے پر ڈال دیں اور اسے ریا و سمعہ کی پگڈنڈیوں پر اِدھر اُدھر نہ بھٹکنے دیں۔ یہ تو البتہ ہمارے قابو کی بات ہے کہ ہم اخلاص و حُسنِ نیّت پیدا کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کریں اور ہر کام کے لیے صرف اللہ کی خوشنودی کو اپنے سامنے رکھیں۔ مگر یہ بات قطعی ہمارے بس میں نہیں کہ دل و دماغ کی فطرت کو بدل دیں اور اسے مجبور کریں کہ ایک وقت میں وہ صرف ایک ہی خیال و داعیہ سے متاثر ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام انسان کی اس بے چارگی و بے بسی کو پہچانتا ہے۔ حدیث کا یہ منشا نہیں کہ کوئی کام کرتے وقت آپ کا دل تجرید کی اُس کیفیت سے بہرہ مند ہو کہ ریا کاری و دنیا طلبی کا کوئی جذبہ کسی مقدار میں دل میں موجود نہ ہو، بلکہ صرف یہ ہے کہ عمل کا اصلی محرک، داعیۂ غالب، قصدِ راجح جس سے متاثر ہو کر اور مجبور ہو کر آپ کوئی قدم اٹھاتے ہیں، اس کی بنیاد اخلاص پر ہو۔ باقی رہی نفس کی کشاکش تو یہ قدرتی ہے، اس کے لیے آپ سے باز پرس نہیں۔“

یہ صحیح بخاری کی ایک حدیث کی شرح ہے جو مولانا نے کی اور ہمیں مل سکی۔ اس کے علاوہ افسوس ہے ہمیں کچھ نہیں ملا۔

گاندھی جی کی سیوا میں شردھا کے پھول

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ تھا جو مولانا نے مسجدِ مبارک کے زمانۂ درس و خطابت میں لکھا تھا اور مسجد کی انجمن نے شائع کیا تھا۔ یہ ہندی نما اُردو میں تھا۔ اس میں ان کے مخاطب گاندھی جی تھے، جنھیں بتایا گیا تھا کہ اسلام عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور اس کے احکام بدرجۂ غایت صاف ستھرے اور مزاجِ انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔ اس میں دل کش اسلوب میں گاندھی جی کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور ثابت کیا گیا تھا کہ انسانی آتما کو شانتی سے ہم کنار کرنے کا اصل ذریعہ اسلام ہے۔ اس سے دل لگانا اور اُسے من بسانا دنیا اور آخرت میں کامیابی کا باعث ہے۔

یہ رسالہ میں نے آزادی سے تھوڑا عرصہ پہلے دیکھا اور پڑھا تھا۔ بڑے ہی من موہنے انداز میں لکھا تھا ــــ مولانا کے پاس حسبِ عادت و معمول اس کی کوئی کاپی نہیں ہے، کسی دوسری جگہ سے بھی یہ مل نہیں سکا۔

مجبوریاں

پول ہرفیو فرانس کا کامیاب تمثیل نگار ہے۔ "مجبوریاں" اس کی مشہور کہانی ہے۔ اس میں بنیادی خیال یہ پیش کیا گیا ہے کہ زندگی کی کچھ ناگزیر تلخیاں ایسی ہیں، جنھیں کوئی خیال آرائی دور نہیں کر سکتی۔ اس کی رائے میں زندگی بسر کرنے کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ اسے بہر حال قبول کر لیا جائے۔ یعنی اپنی انفرادی عقل اور اجتماعی ضابطہ و قانون پر بھروسا کیے بغیر زندگی کے فطری بہاؤ کا ساتھ دیا جائے اور اس طرح کا متوازن اور معتدل طریقہ اختیار کیا جائے جو اذیت رساں نہ ہو ــــ زندگی سے متعلق اس کا نظریہ یہ ہے کہ کوئی انسانی یا غیر انسانی ضابطہ اس لائق نہیں ہے، جو اس کے پورے چوکھٹے کو خوش نما بنا دے۔ سوائے اس کے چارہ نہیں کہ انسان، حیاتِ انسانی کی تلخیوں کو ناگزیر سمجھ کر ان سے تعاون کا راستہ تلاش کرے اور تحمل و برداشت سے کام لے۔

"مجبوریاں" میں خصوصیت سے مسئلہ طلاق پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عیسائی معاشرے میں طلاق جن شرائط کے ساتھ مشروط ہے، وہ انتہائی تکلیف دِہ اور ضرر رساں ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ کسی سماجی مشکل کے حل پر قادر نہیں، بلکہ بجائے خود ایک مشکل ہے اور سخت قسم کے الجھاؤ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

کہانی دراصل ایک پیرایۂ بیان سے تعبیر ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے میں جو پیچیدگی پائی جاتی ہے، اسے منظرِ عام پر لایا جائے اور بتایا جائے کہ اس کا حل کیا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ ایک افسانہ نگار جس آسانی سے مشکل سے مشکل حقائق کو دل میں اتار دیتا ہے، بسا اوقات ایک بڑے سے بڑا حکیم اور مصلح

بھی اس سے عاجز رہتا ہے۔ پڑھنے والے کے احساسات یہ ہوتے ہیں کہ زندگی کے کئی باریک اور نازک گوشے ایک خاص ترتیب کے ساتھ خود بخود اس کے سامنے آرہے ہیں۔

پول ہرفیو کی کہانی — مجبوریاں — فرانسیسی زبان میں ہے۔ عربی کے ممتاز ادیب اور مصنف ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اسے فرانسیسی سے "لحظات" کے نام سے عربی میں منتقل کیا اور مولانا محمد حنیف ندوی نے اسے عربی سے اردو کا جامہ پہنایا۔ مولانا نے قیامِ پاکستان سے قبل اس کا آزاد ترجمہ کیا تھا، یہ ترجمہ انھوں نے سب سے پہلے جولائی ۱۹۵۰ء میں (جب کہ میں ان کے ساتھ ہفت روزہ "الاعتصام" میں بطور معاون مدیر کام کرتا تھا) مجھے دکھایا تھا۔ یہ صاف شدہ مسودہ فل سکیپ کے کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ مولانا نے بتایا تھا کہ بعض ناشروں نے اشاعت کے لیے ان سے یہ مسودہ بارہا مانگا، لیکن وہ نہیں چاہتے کہ ایک کہانی کے اردو مترجم کی حیثیت سے ان کا نام آئے۔ لاہور میں بھی ان کے گھر میں دو تین مرتبہ یہ مسودہ میں نے دیکھا۔ اب اس مضمون کے سلسلے میں اس کی ضرورت پڑی تو میری انتہائی ذاتی کوشش اور تلاش کے باوجود مل نہیں سکا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہوا — مطبوعہ شکل میں وہ کم سے کم تین سو صفحات کی کتاب ہو سکتی ہے۔

یہ ہیں مولانا ندوی کی وہ تصنیفی خدمات جو انھوں نے قیامِ پاکستان سے قبل انجام دیں۔ اب مندرجہ ذیل سطور میں یہ بتایا جائے گا کہ آزادیٔ ملک سے پہلے انھوں نے کن کن ماہانہ اور ہفت روزہ رسائل وجرائد میں فرائضِ ادارت سرانجام دیے۔

"حقیقتِ اسلام"، لاہور

لاہور میں "پیکو لمیٹڈ، موچی دروازہ" کی طرف سے "حقیقتِ اسلام" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ $\frac{20 \times 30}{4}$ کے چالیس صفحات پر مشتمل تھا۔ سرورق اور کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ اس میں قرآن اور اسلام سے متعلق تحقیقی اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے۔ مدیر مسئول "ماسٹر محمد احسان" تھے۔ مولانا ندوی کافی عرصہ اسے ایڈٹ کرتے رہے۔ تلاشِ بسیار کے بعد

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے عتیقی کلکشن سے اس کا صرف ایک شمارہ مل سکا ہے جو جنوری ۱۹۳۷ء کا ہے اور اس پر" جلد ۱۱۔ شمارہ ۱" لکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۷ء سے اس کی گیارھویں جلد شروع ہوئی اور اس جلد کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ اس میں مولانا ندوی کا ایک مضمون چھپا ہے، جس کا عنوان ہے،" اسلام، میزانِ عقل و فلسفہ میں"۔ مضمون نگار کی حیثیت سے مولانا کا نام لکھا ہے " از جناب علامہ محمد حنیف ندوی"۔ عنوان کے نیچے بریکٹ میں مرقوم ہے،" گزشتہ سے پیوستہ" مضمون کے آخر میں تحریر ہے۔ (باقی باقی) یعنی اس مضمون کی ایک یا ایک سے زائد قسطیں ۱۹۳۶ء کے "حقیقتِ اسلام" میں بھی چھپی ہیں اور جنوری ۱۹۳۷ء کے بعد بھی شائع ہوئی ہیں ـــــ یہ مضمون صفحہ ۱۸ سے ۲۳ تک چھ صفحات پر مشتمل ہے اور مسلسل مضمون ہے۔ زبان و انداز اور معلومات کے اعتبار سے نہایت عمدہ۔

ایک دن میں نے مولانا سے عرض کیا کہ "حقیقتِ اسلام" میں آپ کو "علامہ" لکھا گیا ہے۔ فرمایا معلوم نہیں اس زمانے میں لفظِ "علامہ" کو میں نے اپنے لیے کیونکر گوارا کر لیا۔

"حقیقتِ اسلام" کا مستقل ادارتی عنوان ہے " حال و قال"۔ اداریے کے آخر میں چوکھٹے میں لکھا گیا ہے کہ "۱۳۔ دسمبر ۱۹۳۶ء کو برکت علی محمڈن ہال (لاہور) میں مجلسِ اشاعتِ اسلام کا جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا نصراللہ خاں عزیز اور مولانا یوسف سلیم چشتی نے قرآن کے مختلف عنوانات پر تقریریں کیں۔ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا اور تقریریں نہایت غور اور دلچسپی سے سنی گئیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ مجلسِ اشاعتِ قرآن کی طرف سے جلسوں کا سلسلہ آئندہ جاری رہے گا۔"

ان بزرگوں میں سے ملک نصراللہ خاں عزیز نے ۲۔ جولائی ۱۹۷۶ کو اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ۱۱ــــ فروری ۱۹۸۴ کو لاہور میں وفات پائی۔

دیباچہ ـــــ مسلمان عورت

مولانا ابوالکلام آزاد نے پندرہ سال کی عمر میں، علامہ شبلی کے کہنے پر مصر کے مشہور عالم فرید وجدی کی عربی کتاب " المرأۃ المسلمہ" کا اردو ترجمہ "مسلمان عورت" کے

عنوان سے کیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے، یہ ترجمہ شدہ کتاب میں نے پہلی دفعہ ۱۹۳۹ء میں دیکھی اور خرید کر پڑھی تھی۔ یہ کتاب (مسلمان عورت) لاہور کے کئی اداروں نے شائع کی۔ اس وقت میرے سامنے "ایم ثناء اللہ خاں، ریلوے روڈ، لاہور" کی شائع شدہ کتاب ہے۔ اس پر مولانا محمد حنیف ندوی کا تین صفحات کا دیباچہ اور مولانا ابوالکلام (مترجم) کا مقدمہ ہے۔ کتاب پر سنِ طباعت مرقوم نہیں۔

"اسلامی زندگی"۔ لاہور

شرکت علمی لمیٹڈ، لاہور (جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے) کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا گیا تھا، اس کا نام خود مولانا ندوی نے تجویز کیا تھا، "اسلامی زندگی"۔ اس کے پرنٹر پبلشر ملک محمد رفیق (ادبستان لاہور) تھے۔ ادارت کے فرائض مولانا کے سپرد تھے۔ یہ ایک علمی اور تحقیقی رسالہ تھا۔ افسوس ہے یہ زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس کا کوئی شمارہ مولانا کے پاس تو نہیں ہے، البتہ ملک رفیق مرحوم کے صاحب زادوں (ملک خالد، ملک عبدالواحد اور ملک عبدالمتین) کے پاس اس کے بعض شمارے موجود ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا کے پاس رسالہ "حقیقتِ اسلام" اور "اسلامی زندگی" کا نہ صرف یہ کہ کوئی شمارہ نہیں ہے، ان رسالوں کے نام بھی ان کے ذہن میں محفوظ نہیں تھے۔ یہ نام میں نے یاد کرائے تو ان کے ذہن میں آئے۔

ہفت روزہ "مسلمان"۔ سوہدرہ

مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی جماعت اہل حدیث کے مشہور عالم اور مقرر تھے۔ مختلف موضوعات سے متعلق انھوں نے چھوٹی بڑی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی وفات ۶۔ نومبر ۱۹۵۹ء کو ہوئی۔

مولانا عبدالمجید ایک ہفت روزہ اخبار ــــ "مسلمان" ــــ اپنے وطن سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ) سے نکالتے تھے۔ آزادئ وطن سے کچھ عرصہ پیشتر انھوں نے مولانا حنیف ندوی سے کہا کہ وہ اس اخبار کی ترتیب و ادارت میں ان سے تعاون کریں۔ مولانا نے ہامی بھرلی اور ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ مولانا ندوی اس اخبار کو خاص

علمی خطوط پر چلانا چاہتے تھے ـــــ بہرحال دونوں میں اختلافِ ذوق و مزاج کی بنا پر یہ سلسلۂ اشتراک دو مہینے سے زیادہ نہیں چل سکا ـــــ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "مسلمان" کے جن شماروں میں مولانا ندوی کے مضامین اور اداریے شائع ہوئے، وہ ان کے پاس نہیں ہیں۔

ہفت روزہ "الاخوان" گوجرانوالہ

جون ۱۹۴۷ء میں گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث نے ایک ہفت روزہ اخبار ـــــ الاخوان ـــــ جاری کیا۔ مولانا حنیف ندوی کو اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ لیکن اس زمانے میں ملک کے سیاسی حالات اس درجے خراب ہو گئے تھے کہ "الاخوان" کا صرف ایک ہی شمارہ شائع ہو سکا۔ وہ شمارہ پہلا بھی تھا اور آخری بھی ـــــ!

ادارہ "اسلام کی تعمیرِ نو"

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جب نواب افتخار حسین (آف ممدوٹ) پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے، علامہ محمد اسد (جرمن) نے حکومت پنجاب کے کہنے سے اسلام کی تعمیرِ نو (ری کنسٹریکشن آف اسلام) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس کا دفتر لاہور میں اس مقام پر تھا جہاں اب پنجاب اسمبلی کے ارکان کی اقامت گاہ پیپلز ہاؤس ہے۔ یہ سرکاری ادارہ تھا۔ علامہ محمد اسد نے مولانا غلام رسول مہر کے مشورے سے مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات اس کے لیے حاصل کی تھیں۔ یہ ادارہ غالباً ایک سال ہی قائم رہا۔ اس زمانے میں پنجاب کا گورنر انگریز تھا، جس کا نام سر فرانسس موڈی تھا۔ اس نے یہ ادارہ توڑ دیا تھا۔ اس ادارے کو کسی قسم کا تصنیفی اور علمی کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ہفت روزہ "الاعتصام"

ہفت روزہ "الاعتصام" کا ڈیکلریشن قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ کے آخر یا ۱۹۴۸ کے شروع میں گوجرانوالہ سے جماعت اہل حدیث کے جیّد عالم مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے داخل کرایا تھا جو فیروز پور سے نقل مکانی کر کے ضلع گوجرانوالہ کے

ایک قصبے گوندلانوالہ میں فروکش ہوئے تھے۔ ڈیکلریشن منظور ہوا تو مولانا محمد اسماعیل صاحب کے کہنے سے یہ اخبار انھوں نے گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث کو دے دیا اور اس کے اخراجات کی ذمے دار وہی جماعت تھی۔ ارکانِ جماعت کے مشورے سے اس کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی کو بنایا گیا۔ مولانا ندوی کی ادارت میں "الاعتصام" کا پہلا شمارہ ۱۹۔ اگست ۱۹۴۹ کو معرضِ اشاعت میں آیا۔ پھر ضروری انتظامات کے لیے ایک مہینہ اس کی اشاعت ملتوی رہی۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۹ سے یہ اخبار ہر جمعے کو باقاعدہ شائع ہونے لگا۔ ۱۲۔ نومبر ۱۹۵۰ کو اسے مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تحویل میں دے دیا گیا اور اس سے کچھ عرصہ بعد یہ اخبار گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا۔ شیش محل روڈ پر اس کا دفتر تھا۔ اب اس کی آمدنی اور خرچ کی ذمے دار مرکزی جمعیت اہل حدیث تھی۔ مجھے ابتدا ہی سے اس اخبار میں مولانا ندوی کا معاون مقرر کیا گیا تھا۔

اس زمانے میں "الاعتصام" جماعت اہل حدیث کا پہلا اور آخری اخبار تھا، جس نے پہلی ڈگر سے ہٹ کر جماعت کے عمل و حرکت کے لیے نئی راہوں کی نشان دہی کی اور ان خطوط پر قدم زن ہونے کی دعوت دی جو اس کی شان کے شایاں تھے اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں جن کو اپنانا ناگزیر تھا۔

مناظرانہ بحثوں، مجادلانہ جھمیلوں اور مخاصمانہ الجھنوں سے اس اخبار کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کا انداز منفی نہ تھا، مثبت تھا۔ اس نے جماعت اہل حدیث کو نئے ذہن سے آشنا کرایا، نیا فکر عطا کیا، نئے اسلوبِ اظہار کی طرح ڈالی اور اپنے قارئین کو نئے طرزِ کلام سے متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے علمی مضامین، تحقیقی اداریے اور سیاسی شذرات دوسری جماعتوں کے رسائل و جرائد بھی نقل کرتے تھے اور پاکستان اور ہندوستان کے روزنامے بھی ان کو اپنے صفحات میں نمایاں جگہ دیتے تھے۔

اُس عہد کے "الاعتصام" میں خالص عالمانہ اور محققانہ مقالات چھپتے تھے، ملک کے سیاسی حالات پر بھرپور تبصرے ہوتے تھے، ادبی مضامین معرضِ اشاعت میں آتے تھے، بزرگانِ دین اور علمائے کرام کے حالات و سوانح سے اس کے صفحات مزیّن

ہوتے تھے اور بہت سے مشہور شعرا اپنا تازہ کلام بھیجتے تھے جو اس اخبار میں شائع کیا جاتا تھا۔ جماعت میں اندرونی علمی اور تنظیمی جھگڑے اس وقت بھی تھے، لیکن "الاعتصام" میں ان کو اچھالنے اور ان پر رائے زنی سے ہمیشہ احتراز کیا گیا۔

اس زمانے کے ان مضامین و مقالات اور اداریوں اور شذرات کی اگر فہرست تیار کی جائے جو مولانا ندوی نے تحریر کیے تو بہت سے صفحات میں پھیل جائے۔ اختصار کے پیشِ نظر یہاں صرف چند مضامین کے عنوانات درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔۔۔ ۱۹۔ اگست ۱۹۴۹ء کے (پہلے شمارے) سے لے کر ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء تک کے شماروں میں "سیر و سوانح" کے عنوان کے تحت فقہ کے ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کے مختصر حالات تحریر کیے۔

۲۔۔۔ ۴۔ نومبر ۱۹۴۹ء کے شمارے سے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کے شمارے تک ائمۂ حدیث میں سے علی الترتیب امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ پر تعارفی مضامین ضبطِ کتابت میں آئے۔

۳۔۔۔ ۳۰۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کے شمارے سے "ختمِ نبوت اور اس کے حدودِ اطلاق ۔۔۔ ایک نیا جائزہ" کے دہرے عنوان سے ایک نیا سلسلۂ مضمون شروع کیا، جس کی آخری اور انیسویں قسط ۱۲۔ مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں چھپی۔

۴۔۔۔ ۱۹۔ مئی ۱۹۵۰ء کے "الاعتصام" میں "حدیثِ معراج" کے عنوان سے معراج سے متعلق ایک نہایت عمدہ مضمون سپردِ قلم کیا۔

۵۔۔۔ "رؤیتِ ہلال ۔۔۔ اسلام نے قمری نظام کیوں قائم کیا"؟ ۹ جون ۱۹۵۰ء کے شمارے میں چھپا۔

۶۔۔۔ ۲۵ اگست ۱۹۵۰ء سے ایک اور سلسلے کا آغاز کیا۔ اس کا مستقل عنوان تھا ۔۔۔ "قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر" ۔۔۔ اس کے شروع میں مندرجہ ذیل نوٹ لکھا:

"یہ فخر صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ قریب قریب ہر ہر زمانے میں، ہر ہر

نقطۂ خیال سے اس پر غور کیا گیا ہے اور علوم و فنون کی بوقلمونی کے ساتھ اس کے عمق و گہرائی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم ان تمام غواصانِ بحرِ معانی کو اعتراف ہے کہ کہیں بھی یہ حضرات اس کو اتھلا نہیں پا سکے ـــــ سیکڑوں اور ہزاروں شناوروں نے اس سمندر میں غوطہ زنی کی اور ہمیشہ معنی و مقصود کے موتیوں سے دامنِ طلب بھر بھر کر ساحل پر آئے، مگر اس پر اس کے خزائن میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ یقین جانیے کہ اس کی ہر موج اور اچھال میں اب بھی اتنی دولت پنہاں ہے کہ پوری کائناتِ انسانی کو اس سے مالا مال کیا جا سکتا ہے، جستجو اور تحقیق شرط ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝

کہہ دیجیے اگر میرے پروردگار کی باتوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ ہو، تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں، سمندر نبڑ جائے گا، اگرچہ ویسا ہی اور سمندر اس کی مدد کو لے آئیں۔

”ہم اس پرچے سے اس نئے اور مستقل تفسیری باب کو شروع کر رہے ہیں۔ تفسیر آیات کا انتخاب ان معنوں میں ہے کہ اختصار کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے، ہم کن آیات کو اپنے ذوق کی رعایتوں سے آپ کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ ورنہ یہاں متعارف معنوں میں انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہاں تو ایک ایک آیت جانِ معنی اور روحِ انتخاب ہے۔ اس باب میں ہم صرف ان آیات کو لائیں گے جن کی ادبی، نحوی یا کلامی و فقہی اہمیتوں کو اجاگر کر سکیں۔ مقصود یہ ہے کہ ہماری موجودہ پود کے دلوں میں قرآن کی عظمتوں کا صحیح احساس کروٹ لے اور انھیں یہ معلوم ہو کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کی ایک کتاب میں کتنا اعجاز، کتنے معانی اور فکر و عمل کا کتنا نکھار ہے۔ امید ہے ہمارے قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔“

یہ تفسیر ۱۹۵۰ کے ”الاعتصام“ کے مندرجہ ذیل شماروں میں شائع ہوئی۔

۲۵ اگست۔ یکم ستمبر۔ ۸ ستمبر۔ ۲۰ اکتوبر۔ ۱۰ نومبر۔ ۱۷ نومبر۔ ۲۴ نومبر۔

یکم دسمبر، ۸ دسمبر، ۲۲ دسمبر۔

۱۹۵۱ کے درج ذیل شماروں میں چھپی۔

۵ جنوری، ۱۲ جنوری، ۲۶ جنوری، ۹ فروری، ۱۶ فروری — ۲ مارچ، ۹ مارچ، ۱۶ مارچ، ۲۳ مارچ، ۳۰ مارچ — ۶ اپریل — ۱۸ مئی، ۲۵ مئی — ۸ جون، ۱۵ جون — ۷ ستمبر — ۲۳ نومبر، ۳۰ نومبر — ۲۱ دسمبر۔

۱۹۵۲ کے صرف ایک یعنی ۱۱ جنوری کے شمارے میں چھپی۔

قرآن کی ان منتخب آیات کی تفسیر کے بعد اب پھر پیچھے چلیے۔

۷ — ۱۹۵۰ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام سے متعلق بعض اخبارات میں ایک سلسلۂ بحث شروع ہوا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ "ابوالاعلیٰ" نام رکھنا جائز نہیں۔ "الاعلیٰ" کے لفظ کا اطلاق، اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے اور "ابو" کے معنی باپ کے ہیں، یعنی (نعوذ باللہ) اللہ کا باپ۔ یہ نام بالکل غلط اور خلافِ شرع ہے۔

اوّل اوّل یہ بحث اس دور کے "امروز" کے ایڈیٹر مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم نے "امروز" کے (فکاہی کالم) حرف و حکایت میں شروع کی تھی۔ حسرت مرحوم طنز کے بادشاہ تھے اور الفاظ کا وسیع ذخیرہ ان کے خزانۂ ذہن میں محفوظ تھا۔ ان کا مقصد محض تفنن اور دل لگی تھا۔ لیکن اس مصرعِ طرح کو بعض حضرات لے اڑے اور اس پر سنجیدگی سے امروز میں مضامین لکھنے لگے۔ یعنی اس ہلکے پھلکے صحافتی مزاح کو فتویٰ و فقہ کا بھاری بھرکم مسئلہ بنا دیا گیا۔

جماعتِ اسلامی والے اس سے بہت پریشان ہوئے۔ جو لوگ اُس زمانے میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے تھے، ان کے لیے اس محاذ پر اُترنا اور اس کا صحیح صحیح جواب دینا مشکل تھا۔ لے دے کر ایک ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم تھے جو اپنے اخبار سہ روزہ "کوثر" کے "سیر و سفر" میں جواب دینے کی کوشش کرتے تھے، لیکن الفاظ کی تراش خراش کے محدود دائرے سے آگے بڑھ کر معترضین کا علمی انداز میں مقابلہ کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ جماعتِ اسلامی کے حامی ہم بھی نہ تھے (اب بھی وہی موقف ہے) لیکن

یہ بحث قطعی غیر علمی تھی۔

ایک دن مَیں نے مولانا ندوی سے عرض کیا کہ مذاق مذاق میں یہ بحث بہت آگے نکل گئی ہے اور بعض حضرات نے اُسے سنجیدہ مسئلہ بنا دیا ہے، ہمیں اس بحث میں حصہ لینا چاہیے اور ثابت کرنا چاہیے کہ "ابو الاعلیٰ" نام میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ مولانا نے فرمایا آپ لکھیں، مَیں اسے دیکھ لوں گا، اگر کوئی جھول ہوا تو نکال دوں گا۔ مَیں نے کہا آپ ہی لکھیں، میں تہذیب التہذیب وغیرہ کتبِ رجال میں سے کنیتیں تلاش کر کے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے مضمون لکھا اور اس کا دوہرا عنوان قائم کیا۔

نام میں کیا دھرا ہے۔

کیا "الاعلیٰ" کا لفظ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

ملک نصر اللہ خاں عزیز کو بھی کسی نے بتا دیا کہ "الاعتصام" میں اس موضوع پر مضمون لکھا گیا ہے۔ اس زمانے میں الاعتصام پوسٹ تو گوجرانوالہ سے ہوتا تھا، لیکن چھپتا لاہور میں تھا۔ پریس کا نام تھا، "ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس"۔ یہ پریس موہن لال روڈ پر تھا، جسے بعد میں اُردو بازار کہا جانے لگا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے آدمی بھیج کر پریس سے پرچہ منگوا لیا اور کوثر میں یہ مضمون نقل کر کے چھاپ دیا۔

پروفیسر محمد سرور جامعی مرحوم ان دنوں ہفت روزہ "آفاق" کے ایڈیٹر تھے۔ وہ جماعتِ اسلامی کے افکار سے اتفاق نہ رکھتے تھے، لیکن ان کا عدمِ اتفاق خالص علمی بنیادوں پر تھا۔ انھوں نے بھی آفاق میں یہ مضمون نقل کیا۔

حسرت صاحب مولانا حنیف ندوی کے پرانے دوستوں میں سے تھے، انھوں نے یہ مضمون پڑھا تو بعض دوستوں سے پتا چلا کہ وہ کچھ کبیدہ خاطر ہوئے۔ بہرحال اس کے بعد "امروز" نے یہ بحث بند کر دی۔

یہ مضمون نہایت دلچسپ اور مدلل ہے جو ۸ ستمبر ۱۹۵۰ کو "الاعتصام" کے صفحہ

اوّل پر شائع ہوا۔ اپنے قارئین کی دلچسپی کے لیے اُسے آئندہ صفحات میں نقل کیا جا رہا ہے۔

۸۔۔۔ اس دور میں الاعتصام کا طرز و اسلوب عام روش سے بالکل جداگانہ تھا۔ اس میں نہ متنازعہ فیہ امور پر بحث کی جاتی تھی اور نہ آمین اور رفع الیدین وغیرہ مسائل پر زور دیا جاتا تھا۔ اس پر جماعت کے بعض علمائے کرام نے اعتراض کیا تو مولانا ندوی نے ۲۹ دسمبر ۱۹۵۰ اور ۵ جنوری اور ۱۲ جنوری ۱۹۵۱ کے الاعتصام کی تین اشاعتوں میں پُر مغز اور زوردار اداریے لکھے، عنوان تھا۔ "الاعتصام کے معترضین سے"۔۔۔ ان اداریوں میں اُن تمام اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو جماعت کے علما کی طرف سے الاعتصام کے مضامین و مقالات کے بارے میں کیے جاتے تھے۔

۹۔۔۔ ۲۵ مئی اور یکم جون ۱۹۵۱ کے الاعتصام میں مولانا عبدالعزیز سعیدی مرحوم کا جو اُن دنوں رحیم یار خاں کے نواح میں ایک گاؤں میں اقامت گزیں تھے، ایک مکتوب شائع ہوا، جس کا ملخص یہ ہے کہ وہ جماعت اسلامی میں شامل تھے اور اہل حدیث کی حیثیت سے جماعت اہل حدیث کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے، لیکن رحیم یار خاں کی مقامی جماعت کے امیر نے ان کو اس سے روک دیا اور سخت الفاظ میں کہا کہ وہ جماعتِ اسلامی میں رہ کر کسی دوسری جماعت سے تعلق نہیں رکھ سکتے۔ اس پر انھوں نے جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ خاصا طویل مکتوب تھا جو من وعن الاعتصام کی دو اشاعتوں میں چھپا۔ اس کے جواب میں جماعت اسلامی کے ترجمان سہ روزہ کوثر (لاہور) نے اداریہ لکھا اور مولانا عبدالعزیز سعیدی پر تنقید کی۔ مولانا ندوی نے اس سلسلے میں الاعتصام کے تین شماروں (۲۲ جون، ۲۹ جون اور ۶ جولائی ۱۹۵۱ء) میں اداریے لکھے، عنوان تھا:

مسلکِ اہل حدیث اور جماعتِ اسلامی
ایک ناخوش گوار بحث

۱۰۔۔۔ ۲۷ جولائی، ۳ اگست، ۱۰ اگست، ۱۷ اگست، ۲۴ اگست اور ۳۱ اگست

۱۹۵۱ء کے الاعتصام کی چھ قسطوں میں مولانا نے ایک مضمون لکھا۔ "اہل حدیث کا دینی تصور اور اس کے لوازم۔"

اپنے موضوع سے متعلق یہ ایک اچھوتا مضمون ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

۱۵۔ مئی ۱۹۵۱ کو مولانا ندوی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہوئے۔ اس کے بعد چھ مہینے تک تو یہ الاعتصام میں باقاعدہ لکھتے رہے، پھر باقاعدگی قائم نہ رہ سکی۔ روزانہ صبح صبح گوجرانوالہ سے لاہور آنا اور شام کو واپس جانا، پھر اپنا تصنیفی کام بھی کرنا، ان حالات میں الاعتصام کے لیے مضامین لکھنا بہت مشکل تھا۔ ان دنوں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے مولانا "مسئلہ اجتہاد" تصنیف کر رہے تھے جو ادارے کی طرف سے ان کی پہلی کتاب تھی اور یہ کام زیادہ تر گھر میں کرتے تھے۔

اس زمانے میں اداریے اور شذرات وغیرہ زیادہ تر میں ہی لکھتا تھا لیکن اخبار کی پیشانی پر بطور ایڈیٹر مولانا ندوی کا نام چھپتا تھا — میں الاعتصام کے ابتدائے اجراہی سے مولانا کے ساتھ کام کر رہا تھا اور انھوں نے چند روز کے بعد ہی مجھ سے کتابوں پر تبصرے، سیاسی شذرات اور مضامین لکھوانا شروع کر دیے تھے۔ جو کچھ لکھتا تھا، مولانا اُسے دیکھ لیتے تھے اور نوک پلک ٹھیک کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی کسی موضوع پر اداریہ بھی لکھواتے تھے۔ میرا نام مضامین اور تبصروں میں تو چھپتا تھا، بعض اوقات شذرات میں بھی چھپتا تھا، لیکن اداریے میں نہیں چھپتا تھا۔

۲۶۔ جون ۱۹۵۳ تک الاعتصام کی پیشانی پر مولانا کا نام چھپتا رہا۔ اس کے بعد ۳ر جولائی ۱۹۵۳ سے بطور مدیر میرا نام چھپنے لگا۔ اب مولانا بھی گوجرانوالہ سے لاہور آ گئے تھے، اخبار بھی لاہور منتقل ہو گیا تھا اور میں بھی یہیں تھا۔ روزانہ شام کے بعد کسی نہ کسی ہوٹل میں ہماری ملاقات ہوتی تھی اور مختلف مسائل پر سلسلۂ کلام جاری رہتا تھا۔

الاعتصام سے علیحدگی سے بعد کے مضامین

الاعتصام کی ادارت سے علیحدگی کے بعد بھی ازراہِ کرم مولانا نے مجھ سے اور الاعتصام سے بدستور سابق تعلق رکھا اور حسبِ ذیل مضامین لکھے۔

۱۔ ۲۲۔ نومبر ۱۹۵۳ء (۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۷۳ھ) کو علامہ سید سلیمان ندوی نے کراچی میں وفات پائی۔ مولانا حنیف ندوی نے "علامہ سید سلیمان ندوی" کے عنوان سے ان پر تعزیتی مضمون لکھا جو الاعتصام کی ۴ دسمبر، ۱۱ دسمبر، ۲۵ دسمبر ۱۹۵۳ء، ۸ جنوری، ۲۹ جنوری اور ۵ فروری ۱۹۵۴ کی چھ اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا۔ یہ مضمون سید صاحب کے بہت سے علمی اور ذاتی پہلوؤں پر مشتمل ہے جو آئندہ صفحات میں درج کیا جا رہا ہے۔

۲۔ اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کا ایک ماہانہ رسالہ "چراغِ راہ" کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے اپریل ۱۹۵۴ کے شمارے میں مولانا مسعود عالم ندوی نے سید سلیمان ندوی پر ایک تعزیتی مضمون لکھا تھا۔ مضمون کی اشاعت سے چند روز پیشتر ۱۶ مارچ ۱۹۵۴ کو مولانا مسعود عالم ندوی وفات پا گئے تھے۔ اپنے مضمون میں مولانا مسعود عالم ندوی نے مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر بھی کیا تھا اور لکھا تھا کہ "مولانا ابوالکلام زبان و قلم کے بادشاہ ہیں، مگر ان کا علم ٹھوس نہیں۔"

اپریل ۱۹۵۴ کے "فاران" (کراچی) میں ماہر القادری مرحوم نے مولانا مسعود عالم ندوی پر "یادِ رفتگان" کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا، جس میں لکھا کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ مولانا ابوالکلام کی ذہانت و فطانت کے وہ قائل ہیں، مگر ان کو عربی نہیں آتی۔ نیز فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن کا جو ترجمہ کیا ہے، اس کو پڑھ کر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد عربی جانتے تھے، مگر ابوالکلام عربی نہیں جانتے ــــــ اس پر مولانا حنیف ندوی نے الاعتصام کی ۷ مئی، ۱۴ مئی، ۲۱ مئی اور ۲۸ مئی ۱۹۵۴ کی چار اشاعتوں میں ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا:

"مولانا ابوالکلام عربی نہیں جانتے۔"

دارالعروبہ[1] کا عجیب و غریب انکشاف

کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم

مضمون کا آغاز درجِ ذیل سطور سے ہوتا ہے:

"چراغِ راہ" اپریل ۱۹۵۴ء میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا ایک تعزیتی مضمون چھپا ہے، جسے پڑھ کر ان کے اخلاص اور سیّد صاحب کی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اس میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی سیرت اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسعود عالم صاحب ہمارے گہرے اور بے تکلف دوست تھے۔ ان کی موت کی خبر اچانک پہنچی تو نہ پوچھیے کہ کتنا صدمہ ہوا، اور کتنی دیر تک ہوش و حواس کے پورے کارخانے میں ایک تعطل سا برپا رہا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ الاعتصام میں ان کے حالات پر ایک مفصل مضمون لکھا جائے کہ چراغِ راہ میں ان کا تعزیت نامہ نظر سے گزرا، جس میں کہ اپنے محسن و محبوب استاذ کی خدمت میں انھوں نے درد اور خلوص میں ڈوبا ہوا نذرانہ پیش کیا تھا اور حقِ شاگردی ادا کیا تھا۔ آہ! کسے معلوم تھا کہ یہ شخص جو سید صاحب کے غم میں نڈھال ہے اور اُن کی وفات سے حد درجہ متاثر ہے، خود قبر کی آغوش میں آسودہ ہونے کو ہے اور اپنے دوستوں کو خون کے آنسو رُلانے والا ہے۔

"جب ہم مضمون کے اس حصے تک پہنچے کہ" مولانا ابوالکلام زبان و قلم کے بادشاہ ہیں، مگر اُن کا علم ٹھوس نہیں" تو حیرت ہوئی کہ اس "تحقیق" اور "صاف گوئی" کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس سے دعوتِ اسلامی کے مقاصد کو کتنی تقویت حاصل ہوئی؟

"ابھی ہم اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ ایک عزیز نے

---

[1] مولانا مسعود عالم ندوی نے "دارالعروبہ" کے نام سے عربی کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کیا تھا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کا آغاز دارالعروبہ ہی نے کیا تھا۔

اپریل (۱۹۵۴ء) کا " فاران " دکھایا۔ اس پر ماہر القادری صاحب نے مولانا مسعود عالم ندوی پر " یادِ رفتگان " کے عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اس میں بھی مولانا آزاد کے بارے میں مولانا مسعود عالم کے کچھ تاثرات بیان ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ . . . مولانا ابوالکلام عربی نہیں جانتے . . . "

اس سے آگے چل کر مولانا حنیف ندوی لکھتے ہیں :

" افسوس ہے کہ آج مولانا مسعود عالم ندوی زندہ نہیں، ورنہ ہم ان سے براہِ راست اور نسبتاً ذرا سختی سے پوچھتے کہ انھوں نے یہ کیا شوشہ چھوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں اور خشونتوں کو معاف فرمائے اور ان کی خدمات کے صلے میں انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔"

یہ مضمون الاعتصام کی چار قسطوں میں اشاعت پذیر ہوا۔

۳ ــــ مولانا حنیف ندوی کو جن لوگوں سے ہمیشہ شدید اختلاف رہا، ان میں منکرینِ حدیث کا گروہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل طبقے پر انھوں نے ہر موقعے پر تنقید کی اور مختلف انداز میں ان کے عقائد و تصورات کو ہدفِ نقد و جرح ٹھہرایا۔ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لائقِ استناد قرار دینا، فرامینِ پیغمبر کو تسلیم کرنا اور اطاعتِ رسول کو اطاعتِ الٰہی کے برابر ماننا بہرحال ضروری ہے۔ جو شخص اس سے ذرہ بھر انحراف کرتا ہے، وہ نہ قرآن کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اسلامی اوامر و نواہی سے متعلق غور و فکر کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔

اس موضوع پر مولانا نے " مطالعہ حدیث " کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی اور بہت سے مضامین سپردِ قلم کیے۔ اس سلسلے کے متعدد مضامین الاعتصام کے کئی شماروں میں معرضِ اشاعت میں آئے۔ ان میں سے ایک مضمون کا عنوان تھا ــــ " قرآن سے بھی پہلے "

اس مضمون کی اصل محرک ابن ماجہ کی وہ حدیث ہے، جس میں صحابہ فرماتے ہیں:

کنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوتینا الایمان قبل القرآن۔

(ہمیں قرآن سے بھی پہلے ایمان کی نعمت دی گئی) ۔
اسی قسم کی ایک حدیث مستدرک حاکم میں بھی ہے، جسے صحیحین کی شرط پر صحیح ٹھہرایا گیا ہے۔
یہ مضمون "— قرآن سے بھی پہلے —" ۱۶ جولائی، ۳۰ جولائی، ۱۳ اگست، ۲۰ اگست، ۲۷ اگست، ۱۷ ستمبر اور ۲۴ ستمبر ۱۹۵۴ کے الاعتصام کی سات قسطوں میں چھپا۔ ساتویں قسط کے اختتام پر "باقی آئندہ" لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علمی مضمون ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جتنا چھپا ہے، وہ اپنی جگہ اہم ہے۔

۴ — مرکزی جمعیت اہل حدیث کی سالانہ کانفرنس ۳، ۴ اپریل ۱۹۵۵ء کو لائل پور (حال فیصل آباد) میں مولانا سید اسماعیل غزنوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس کے ایک اجلاس میں مولانا حنیف ندوی نے مولانا سید داؤد غزنوی کے فرمان کے مطابق حجیتِ حدیث کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ یہ نہایت عالمانہ تقریر تھی جو ہزاروں افراد کے مجمعے میں کی گئی —— یہ تقریر ۲۲ اپریل —— ۱۹۵۵ء کے الاعتصام میں شائع ہوئی۔

۵ — روزنامہ "امروز" کے پہلے ایڈیٹر مولانا چراغ حسن حسرت نے ۲۶ جون ۱۹۵۵ کو اس دنیائے فانی سے عالمِ آخرت کی راہ لی۔ وہ مولانا حنیف ندوی کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ مولانا نے "حسرت کی یاد میں" کے عنوان سے ان پر تعزیتی مضمون لکھا جو ۱۵۔ جولائی ۱۹۵۵ کے "الاعتصام" میں چھپا۔ یہ مضمون آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے۔

اس کے علاوہ الاعتصام میں مولانا ندوی کے مندرجہ ذیل مضامین شائستہ التفات ہیں:

۶ — قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔	۲۲ جولائی ۱۹۵۵
۷ — تحریک اہل حدیث کا تاریخی پس منظر۔	۲۹ جولائی ۱۹۵۵
۸ — قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔	۱۹ اگست ۱۹۵۵

۹ــــ قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔ ۱۶ر ستمبر ۱۹۵۵

۱۰ــــ قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵

۱۱ــــ قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۵۵

۱۲ــــ ۱۷۔ فروری ۱۹۵۶ کو الاعتصام کا ”حجیتِ حدیث نمبر“ شائع ہوا تھا جو ۲۰×۳۰/۴ سائز کے سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں استنادِ حدیث سے متعلق متعدد اہلِ علم کے عالمانہ اور محققانہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ مولانا حنیف ندوی نے اس کے لیے دو مضمون تحریر کیے۔ ایک کا عنوان تھا، ”حجیتِ حدیث پر ایک یقین افروز دلیل۔“

۱۳ــــ دوسرا علامہ محمد اسد (جرمن) کی مشہور کتاب ”اسلام ایٹ دی کراس روڈ“ کے ایک مضمون کا ترجمہ کیا تھا، عنوان تھا، ”روحِ سنت۔“

۱۴ــــ ”اسلام میں نبوت کا تصور۔“ مولانا کا یہ مضمون الاعتصام کی ۲۵ مئی، یکم جون، ۱۵ جون اور ۲۲ جون ۱۹۵۶ کی چار اشاعتوں میں چھپا۔

۱۵ــــ مولانا ظفر علی خاں کا انتقال ۲۷ر نومبر ۱۹۵۶ کو ہوا۔ مولانا ندوی نے ان کی وفات پر ”مولانا ظفر علی خاں مرحوم“ کے عنوان سے تعزیتی مضمون لکھا جو ۷ر دسمبر ۱۹۵۶ کے الاعتصام میں شائع ہوا۔ یہ مضمون آئندہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔

۱۶ــــ ”کیا خلیفہ معزول ہو سکتا ہے؟“ ۴ جنوری، ۱۱ جنوری اور ۱۸ جنوری ۱۹۵۷ کو چھپا۔

۱۷ــــ ”ارسطو کی منطق پر ابنِ تیمیہ کے اعتراضات۔“ ۵ر اپریل اور ۱۲ اپریل ۱۹۵۷ کو زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

۱۸ــــ ”حدیث وسنت کے قرآنی پیمانے۔“ یہ مضمون ۱۷ جولائی، ۲۴ جولائی اور ۷ر اگست ۱۹۵۹ کے الاعتصام کی زینت بنا۔

۱۹ــــ ”اسلام میں فرقے۔“ یہ مضمون مشہور منکرِ حدیث غلام احمد پرویز کے اس نقطۂ نظر کی مخالفت میں لکھا گیا تھا کہ قرآن کی رُو سے مسلمانوں کا فرقوں اور گروہوں

میں منقسم ہونا شرک وکفر کے مترادف ہے ــــ اب تو بعض نیم اسلامی اور نیم سیاسی جماعتوں کے رہنما بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ مذہبی فرقے نفاذِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مولانا ندوی نے اسلام کے فقہی اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں اس موقف کی مخالفت کی ہے۔ یہ مضمون ۲۲ جولائی اور ۲۹ جولائی کے الاعتصام میں چھپا۔

۲۰ ــــ الاعتصام کے ۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۰ کے شمارے سے مولانا ندوی نے ایک نئے سلسلۂ مضمون کا آغاز کیا، جس کا عنوان تھا، "چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں"۔ اس مضمون کا پس منظر یہ ہے کہ ایک دن حسبِ معمول ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ یہ دلآویز موضوع زیرِ بحث آیا کہ قرآنِ مجید کی روشنی میں سیرتِ رسول پر کام ہونا چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس اہم کام کا آغاز کیا تھا، مگر ان کی بوقلموں مصروفیتوں کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بھی اس کو شائستۂ التفات ٹھہرایا تھا لیکن وہ بھی اپنے بہت سے مشاغل کی بنا پر اسے مکمل نہ کر پائے۔ اور بھی بعض اہلِ علم نے اس طرف عنانِ توجہ مبذول کی، مگر منزلِ اتمام تک رسائی کسی کی نہ ہو سکی۔ مولانا ندوی نے میری گزارش پر فرمایا کہ میں اس کی ابتدا کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا، اس کی تکمیل بھی ہونی چاہیے۔ فرمایا یہ بھی ہو جائے گی۔ ہم نے مندرجات کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا تو "چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں" اس کا پھبتا ہوا عنوان ذہن میں آیا۔ مولانا نے میری درخواست پر مضمون کا آغاز کر دیا اور ابتدا مندرجہ ذیل سطور سے کی۔

" الفاظ بسا اوقات دھوکا دیتے ہیں۔ عنوان مذکورہ بالا سے بظاہر شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ چہرۂ نبوت کے نکھار اور دلآویزی و دلبری کی حیثیت بجائے خود معیارِ حق کی نہیں، بلکہ معیارِ حسن و جمال صرف قرآن ہے، اور دونوں میں نسبت و تعلق کی وہی نوعیت کارفرما ہے جو آئینہ دیکھنے والے اور آئینے میں ہوتی ہے، حالانکہ امرِ واقعہ یہ نہیں۔ قرآن و سیرت میں اس سے کہیں زیادہ تعلق ہے۔ ایسا تعلق کہ جس کی وسعت پذیری دونوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یعنی جہاں آنحضرت کی اداہائے ہوش ربا پر قرآن کی ضوفشانیوں کے اثرات نمایاں ہیں اور بقول ام المومنین اور رمز آشنائے رسالت

حضرت عائشہ کے، آپ کی زندگی و اخلاق قرآن ہی کا دوسرا نام ہے، وہاں اس مصحف روشن کی تابانیوں کو بھی سیرت ہی سے فروغ حاصل ہے۔

"غور فرمایے، فہم و ادراک میں کس قدر پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ مطلع الوارکتاب کس درجہ مجمل اور گنجلک ہو کر رہ جاتی ہے، اگر اُسے حضورؐ کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے اور مخاطبِ اوّل اور مہبطِ وحی کی تشریحاتِ فکر و نظر کی اوّلیں تجلیات سے الگ کرلیا جائے۔ نیز اس جانی بوجھی حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے کہ کتاب اپنی حتمی اور قطعی ترجمانی کے لیے ہمیشہ ایک صاحبِ کتاب چاہتی ہے، جو اس کے اجمالات کو تفصیلات کی روشنی میں لائے، اس کے عقدوں کو وا کرے، اس کی مشکلات کو سلجھائے اور اس کے مطالب و معانی کو عمل اور روزمرّہ کی زندگی میں برت اور سمو کر دکھائے۔

"قرآن و سیرت میں تعلق و نسبت کی اگر یہی نوعیت ہے تو عنوان کے معنی یہ ہوئے کہ ایک آئینہ دوسرے آئینے کے مقابل ہیں ہے۔ ایک معیار کو دوسرے معیار کی رُو سے جانچا اور پرکھا جا رہا ہے، یا پھر دو مستقل بالذات، مگر ایک دوسرے سے وابستہ کسوٹیاں اور شمعیں ہیں، جن کے تقابل سے نقوشِ سیرت کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔"

اس طویل مضمون کی آخری قسط "الاعتصام" کے ۷ ستمبر ۱۹۶۲ کے شمارے میں چھپی۔ لیکن درحقیقت یہ آخری قسط نہ تھی۔ اس کے اختتام پر "باقی آئندہ" مرقوم ہے، مگر اس کے بعد افسوس ہے، یہ شائع نہیں ہوا۔ یہ مضمون الاعتصام کی $\frac{۲۰\times۳۰}{۴}$ سائز کی اکسٹھ $\frac{۶۱}{}$ اقساط پر مشتمل ہے اور بہتر $\frac{۷۲}{}$ صفحات کو گھیرے ہوئے ہے۔ نہایت علمی اور تحقیقی مضمون ہے۔ مولانا جس طرح اور کئی مضامین مکمل نہیں کر پائے، اسی طرح یہ بھی تکمیل کی منزل کو نہیں پہنچ سکا۔ زبان اور اندازِ بیان انتہائی شان دار ہے اور بہت سے اچھوتے مباحث کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اُن دنوں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ مولانا اتوار کی صبح کو مضمون لکھا کریں گے اور میں شام کو اُن کے گھر سے مضمون لے لیا کروں گا یا وہ شام کے بعد معمول کے مطابق انار کلی آئیں گے تو مضمون لیتے آئیں گے۔ اس فیصلے

پر بدستور عمل ہوتا رہا۔ تاہم مضمون مکمل نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بارہا ان سے عرض کیا گیا، وہ وعدہ بھی کرتے رہے اور ان کی خواہش اور دل کی تڑپ بھی یہی رہی کہ یہ سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے، لیکن کوئی نہ کوئی رکاوٹ اور مجبوری ایسی پیش آتی رہی کہ یہ مضمون اختتام کو نہ پہنچ سکا۔

ایک مرتبہ میں نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے مرحوم (سابق) ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام سے اس مضمون کا تذکرہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور مولانا سے اس کو مکمل کرنے کے لیے کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کیا جائے، کیونکہ اپنی نہج کی یہ ایک نئی چیز ہے۔ مولانا نے اس کی تکمیل کا ارادہ بھی کیا، لیکن ارادہ عمل کے سانچے میں نہ ڈھل سکا۔ اور بھی بہت سے دوستوں نے مولانا کو اس طرف توجہ دلائی اور اُسے چھاپنے کی تمنا کا اظہار کیا مگر معاملہ ابھی تک آگے نہیں بڑھ پایا۔

یہ مضمون ۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۰ کے شمارے سے چھپنا شروع ہوا تھا اور ۷ ستمبر ۱۹۶۲ تک چھپتا رہا۔ الاعتصام میں ان کا یہ طویل ترین مضمون ہے۔ اگر مولانا اس کی سات آٹھ قسطیں اور لکھ دیتے یا اب صحت یاب ہونے کے بعد چند روز میں اس کے آخری بیس پچیس صفحات تحریر فرما دیں تو قرآن کی روشنی میں سیرتِ رسول پر اپنی نوعیت کی یہ ایک منفرد شے ہوگی اور کتابی صورت میں منظرِ اشاعت پر آسکے گی۔

یہ مولانا ندوی کا الاعتصام میں آخری مضمون تھا۔ اس کے بعد بعض جماعتی معاملات میں ان کا نام تو اس اخبار میں چھپتا رہا، لیکن اس کے لیے وہ کوئی مضمون نہیں لکھ سکے۔ نہ کبھی میں نے ہی زور دے کر کسی موضوع پر ان سے کوئی مضمون مانگا ـــــــ الاعتصام میں سولہ سال (تین سال معاون مدیر اور تیرہ سال مدیر کی حیثیت سے) خدمات انجام دینے کے بعد ۳۰۔ مئی ۱۹۶۵ کو خود میں بھی اس سے علیحدہ ہو گیا۔ میں تو اصرار کر کے یا کسی ایسے موضوع پر گفتگو شروع کر کے، جس کے نتیجے میں کوئی مضمون تیار ہو سکتا ہو، اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور مضمون لکھوا لیتا تھا۔ لیکن میرے الاعتصام سے الگ

ہوجانے کے بعد نہ مولانا سے کسی نے زور دے کر یا موضوع منتخب کر کے، مضمون کے لیے کہا، نہ از خود انھوں نے کوئی مضمون دیا۔ اس کے بعد ان کے جو مضمون الاعتصام میں شائع ہوئے، وہ سب پرانے مضمون ہیں، جو انھوں نے اپنے دَورِ ادارت میں لکھے یا میرے زمانۂ ادارت میں تحریر فرمائے تھے۔

۲۱ ـــــ برصغیر پاک و ہند کے نامور خطیب اور مجاہدِ حریت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۲۱ اگست ۱۹۶۱ کو اس عالمِ خاکی سے منہ موڑ کر جنت الفردوس کا عزم کیا۔ مولانا ندوی نے ۸ ستمبر ۱۹۶۱ کے الاعتصام میں ان پر تعزیتی مضمون لکھا۔ عنوان تھا:

سید عطاء اللہ شاہ بخاری
عظیم خطیب اور عظیم مجاہد

سہ روزہ "منہاج" لاہور

جنوری ۱۹۵۸ کو چند مخلص دوستوں کے تعاون سے میں نے لاہور سے سہ روزہ "منہاج" جاری کیا۔ اس کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا۔ یہ اخبار بالخصوص جماعت اہلِ حدیث کے حلقے میں بہت مقبول ہوا۔ لیکن چودہ پندرہ مہینے سے زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کے قانون کے مطابق "منہاج" کو تاریخِ اجرا کے بعد سے لے کر کم و بیش تین سال تک اخباری کاغذ نہیں مل سکتا تھا، جس کی قیمت نَو دس روپے رِم تھی۔ مجبوراً مجھے کرنا فلی کاغذ خریدنا پڑتا تھا۔ اس کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور وہ پچیس روپے سے چالیس روپے رِم تک ملتا تھا۔ جس قدر اخبار کی تعدادِ اشاعت بڑھتی جاتی تھی، اسی نسبت سے خسارے میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بالآخر کافی خسارہ اٹھانے کے بعد اپریل ۱۹۵۹ کو میں نے اسے بند کر دیا اور اخبار نکالنے کے شوق سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی اور مولانا داؤد غزنوی کے کہنے سے سوا سال کے بعد پھر الاعتصام میں واپس چلا گیا۔

بہر حال جنوری ۱۹۵۸ سے اپریل ۱۹۵۹ تک میں الاعتصام کے صفحات سے غائب رہا اور مولانا حنیف ندوی کا بھی الاعتصام سے یہ "زمانۂ غیبوبت" ہے۔ اب

ان کا "ظہور" منہاج میں ہونے لگا۔

سہ روزہ "منہاج" کا پہلا شمارہ ۲۱۔ جنوری ۱۹۵۸ کو شائع ہوا۔ مولانا ندوی نے اس کے لیے جو مضمون مرحمت فرمایا اس کا عنوان تھا۔

اہلِ قرآن کا نظریۂ دینی
تنقید و تحلیل کی روشنی میں

۲۵۔ جنوری ۱۹۵۸ کے "منہاج" میں ان کا جو مضمون اشاعت پذیر ہوا، وہ تھا۔

نماز کی معنوی اہمیت اور روحانی پہلو
غزالی کے نقطۂ نظر سے

اس کے بعد "اہلِ حدیث کے خلاف ہمہ گیر برہمی کے اسباب" کے عنوان سے "منہاج" میں ان کا قسط وار مضمون چھپنا شروع ہوا۔ اس کی پہلی قسط ۵ فروری ۱۹۵۸ کے شمارے میں اور آخری اور نویں قسط ۱۳ مارچ ۱۹۵۸ کے شمارے میں طبع ہوئی۔ یہ ان کا مکمل مضمون ہے۔ منہاج $\frac{20\times30}{4}$ کے سائز پر شائع ہوتا تھا۔ یہ مضمون اس سائز کے پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث میں مقام و مرتبہ

مولانا حنیف ندوی کے حالات کے لیے اب میں آپ کو پھر بہت پیچھے کو لوٹنے کی زحمت دوں گا۔

۲۴ جولائی ۱۹۴۸ کو مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور اس کا تاسیسی اجلاس دارالعلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ، لاہور) کے وسیع ہال میں بہ صدارت مولانا سید محمد داؤد غزنوی منعقد ہوا۔ مولانا ندوی اس اجلاس میں شامل تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کو مرکزی جمعیت کے صدر اور پروفیسر عبدالقیوم کو ناظمِ اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا۔ پروفیسر صاحب اس زمانے میں گورنمنٹ کالج (لاہور) میں شعبۂ عربی کے چیئرمین تھے۔ اب اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) میں سینئر ایڈیٹر ہیں۔ ۸۔ دسمبر ۱۹۴۸ کو مجھے مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا ندوی مرکزی جمعیت کی

مجلسِ عاملہ کے رکن تھے اور مولانا داؤد غزنوی اور دیگر ارکانِ عاملہ کے نزدیک نہایت عزت و احترام کا مقام رکھتے تھے۔ مولانا غزنوی کی زندگی تک مولانا ندوی مرکزی جمعیت کی مجلسِ شوریٰ، مجلس عاملہ اور اس کی تمام کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں کے رکن رہے۔ مولانا غزنوی کی وفات (۱۶؍ دسمبر ۱۹۶۳ء) کے بعد مولانا ندوی نے اس سلسلے کی دلچسپیاں ختم کر دیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ آزادیٔ برصغیر سے قبل ہندوستان کی جماعت اہلِ حدیث کی تنظیم "آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس" کے نام سے قائم تھی۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں تھا، ناظمِ اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم تھے۔ مولانا حنیف ندوی اس کی مجلسِ عاملہ کے بھی رکن تھے اور اس کے عام سالانہ جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ دیگر علما میں مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا عبدالوہاب آروی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ)، مولانا عبداللہ الباقی اور مولانا عبداللہ الکافی جیسے عالی مرتبت حضرات اس میں شامل تھے۔ دہلی کے سیٹھوں میں حاجی محمد صالح (جو آزادی کے بعد جمعیت علمائے ہند کے ناظم مالیات منتخب کیے گئے تھے) اور حافظ حمید اللہ وغیرہ حضرات اس کے رکن تھے۔ مولانا ابوالقاسم بنارسی جو اپنے عہد کے جیّد عالم تھے اور جمعیت علمائے ہند سے وابستہ تھے، مولانا ندوی سے عمر میں کئی سال بڑے تھے، لیکن مولانا حنیف ندوی کی بہت قدر کرتے تھے۔ تفاوتِ عمر کے اعتبار سے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ندوی پر بہت شفقت فرماتے تھے۔

جو علمائے اہلِ حدیث پہلے سے مغربی پاکستان میں رہتے تھے اور جو تقسیم کے بعد یہاں آئے، انھوں نے "مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان" کے نام سے اپنی تنظیم قائم کی اور اس کے صدر مولانا سید داؤد غزنوی کو بنایا۔ جو حضرات مشرقی پاکستان میں سکونت پذیر ہوئے، انھوں نے "مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مشرقی پاکستان" کے نام سے اپنا جماعتی نظم و نسق قائم کیا اور اس کے صدر مولانا عبداللہ الکافی ہوئے۔ آزادی کے بعد بہت سے اہلِ حدیث ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے، انھوں نے اپنی جماعت کو اسی نام یعنی "آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس" سے قائم رکھا۔ اس کے صدر مولانا عبدالوہاب آروی تھے جو آرہ (ضلع

دربھنگہ۔صوبہ بہار) کے رہنے والے تھے اور جیّد عالم تھے۔ آزادی کے بعد ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے تھے اور کئی روز مولانا داؤد غزنوی کے مکان (شیش محل روڈ) پر قیام فرما رہے تھے۔ مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بڑی شفقت فرماتے۔ اب کئی سال سے ہندوستان کے اہلِ حدیث حضرات نے اپنی جماعت کا نام بدل دیا ہے اور اسے "مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ہند" کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں ہے اور جامع مسجد کے قریب ہے۔

مرکزی جمعیت کا پہلا اجلاس عام اور مولانا ندوی

مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا پہلا اجلاسِ عام لاہور میں (شیش محل روڈ پر) ۲۷، ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۴۹ کو منعقد ہوا۔ اجلاس سے تقریباً ایک مہینہ پہلے اس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہوا تو اس میں متفقہ طور پر مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کو اجلاس کے صدر اور مولانا محمد حنیف ندوی کو صدرِ استقبالیہ منتخب کیا گیا۔ دونوں حضرات نے تحریری خطبے پڑھے جو بڑے جان دار اور اپنے مشتملات کے اعتبار سے اس قدر وسعت کے حامل تھے کہ نہ صرف اہل حدیث بلکہ ہر مسلک کے اہلِ علم کے لیے لائق مطالعہ اور قابلِ اعتنا تھے۔ الاعتصام اس زمانے میں جاری نہیں ہوا تھا۔ مولانا سیالکوٹی کا خطبۂ صدارت اخبار "نوائے وقت" (لاہور) میں شائع ہوا، اور مولانا ندوی کا خطبۂ استقبالیہ الاعتصام کے اجرا کے بعد اس کی ۱۸ نومبر، ۲۵ نومبر اور ۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی تین اشاعتوں میں چھپا۔

جامعہ سلفیہ۔فیصل آباد

۳، ۴، اپریل ۱۹۵۵ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی تیسری سالانہ کانفرنس لائل پور (حال فیصل آباد) میں مولانا سید اسماعیل غزنوی کے زیرِ صدارت منعقد ہوئی۔ اس سے قبل اہلِ حدیث کا مرکزی دارالعلوم اسی شہر میں قائم کرنے اور کانفرنس کے موقعے پر اس کا سنگِ بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ سنگِ بنیاد سے پہلے فیصل آباد میں مجلسِ عاملہ کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں دارالعلوم کے نام کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو مختلف حضرات نے مختلف نام پیش کیے۔ مولانا حنیف ندوی نے اس کا نام "جامعہ سلفیہ" تجویز کیا، جو مسلکِ

سلفیت سے ہم آہنگ تھا اور اس کے فارغ التحصیل حضرات کے لیے "سلفی" کی نسبت کے اعتبار سے بھی نہایت موزوں تھا۔ یہ نام سب نے پسند کیا اور یہی رکھا گیا۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ جامعہ سلفیہ کا سنگِ بنیاد فیصل آباد کی جماعت اہل حدیث کے مشہور بزرگ حکیم نورالدین مرحوم نے رکھا تھا جو پاکستان کے ممتاز وکیل ایم اے رحمان کے جدِ امجد تھے۔ بعد ازاں ضلع فیصل آباد کے دو معروف بزرگوں صوفی عبداللہ اور میاں محمد باقر نے ایک ایک اینٹ رکھی۔ صدر جمعیت مولانا داؤد غزنوی اور دوسرے بہت سے حضرات وہاں تشریف فرما تھے۔ اس زمانے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظمِ اعلیٰ مولانا محمد اسماعیل صاحب تھے۔ انھوں نے اس موقع پر انتہائی مؤثر اور درد میں ڈوبی ہوئی تقریر کی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ابتدا میں جامعہ سلفیہ میں منتہی طلبا کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا تھا اور طے پایا تھا کہ جب تک فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ کی عمارت تعمیر نہیں ہو جاتی، اس وقت تک دارالعلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ، لاہور) کی عمارت میں جامعہ کے طلبا کو تعلیم دی جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور منتہی طلبا کی تعلیم کے لیے مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل، مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کافی عرصے تک یہ بزرگ فرائضِ تدریس انجام دیتے رہے۔ مولانا ندوی ہفتے میں دو دن پڑھاتے تھے۔ ان کے اس زمانے کے تلامذہ میں سے اس وقت بعض حضرات دینی مدارس کے مہتمم اور صدر مدرس ہیں، بعض یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور بعض سرکاری سکولوں میں معلم ہیں۔ (ان کے نام آئندہ سطور میں مولانا کے تلامذہ کی فہرست میں درج کیے جا رہے ہیں)۔

ادارہ علومِ اثریہ۔ فیصل آباد

غالباً ۱۹۷۴ء میں فیصل آباد کے بعض اہل حدیث حضرات نے دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کو مزید تعلیم دلانے اور انھیں تدریس و تصنیف کی تربیت دینے کی غرض سے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتدائی میٹنگ میں مولانا حنیف ندوی کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی اور مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ میٹنگ میں مسئلے کی تمام تفصیلات

سامنے آئیں اور اس نوع کے ادارے کی اہمیت اور ضرورت پر بحث ہوئی۔ بالآخر اس کے نام پر غور کیا گیا تو مولانا نے فرمایا کہ اس کا نام "ادارہ علومِ اثریہ" رکھا جائے، تاکہ اہل حدیث کی رُو سے اس میں "اثریت" کا اظہار بھی ہو اور فارغ التحصیل طلبا پر "اثری" کی نسبت کا اطلاق بھی ہو سکے۔

ادارہ علومِ اثریہ میں بہت محدود تعداد میں طلبا داخل کیے گئے تھے اور ان کو تدریسی و تصنیفی تربیت دینے کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے اربابِ انتظام کی درخواست پر ایک عرصے تک مولانا ہر ہفتے لاہور سے فیصل آباد تشریف لے جاتے اور طلبا کو پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصہ میں بھی اس سلسلے میں ہر ہفتے میں وہاں جاتا رہا۔ مولانا کے اس دَور کے شاگردوں میں بعض حضرات اب وہیں خدمتِ تدریس بھی انجام دے رہے ہیں اور خدمتِ تصنیف بھی۔ (ان کے نام مولانا کے تلامذہ کی فہرست میں دیکھیے)۔

ماموں کانجن میں خطبۂ صدارت

۱۹۸۱ء میں دار العلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) کا سالانہ جلسہ مولانا حنیف ندوی کی صدارت میں ہوا۔ اس میں مولانا نے تحریری خطبۂ صدارت پڑھا۔ اس خطبے میں انھوں نے اپنے اسلوبِ خاص سے مسلکِ اہل حدیث کی وضاحت کی۔ یہ خطبہ بعد میں شائع بھی ہوا۔ اب تک اس دار العلوم کے جتنے بھی سالانہ جلسے ہوئے ہیں اور ان جلسوں میں مختلف علما نے جتنی تقریریں کی ہیں، میرے نزدیک مولانا ندوی کا یہ خطبۂ صدارت معلومات اور اہل حدیث کے بنیادی نقطۂ نظر کی توضیح و تشریح کے اعتبار سے سب پہ بھاری ہے۔ بعض موجودہ اہل حدیث کی یہ کور ذوقی اور بدنصیبی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور علمی مسائل کو سمجھنے کے عادی نہیں رہے۔ انھوں نے پورے زور سے حلق پھاڑ پھاڑ کر بولنے والے مقرروں اور واعظوں کی غیر ثقہ اور اُتھلی باتیں سننے کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت

۱۹۷۲ سے ۱۹۸۲ تک (دس سال) مولانا ندوی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے۔

اس زمانے میں (ریٹائرڈ) جسٹس حمود الرحمٰن اور ان کے بعد (ریٹائرڈ) جسٹس محمد افضل چیمہ اس کے چیئرمین تھے۔ یہ دونوں چیئرمین حضرات زیرِ بحث مسائل میں مولانا ندوی کی رائے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔

مولانا ندوی پہلے اہل حدیث عالم ہیں، جن کو حکومت نے اہلِ حدیث کی حیثیت سے اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن مقرر کیا اور جنھوں نے کھل کر کونسل میں زیرِ بحث مسائل کی اپنے مسلک کے مطابق وضاحت کی۔

متاثر کرنے والی شخصیتیں

علما میں جن حضرات سے مولانا ندوی بہت زیادہ متاثر ہوئے اور جن کے حفظ و اتقان اور اخلاق و سیرت نے ان پر خصوصیّت سے اثر ڈالا، ان میں ان کے استادِ محترم مولانا محمد اسماعیل سلفی (گوجرانوالہ)، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا محمد سورتی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی، پروفیسر عبدالواجد کان پوری (جو عربی ادبیات میں اونچا مرتبہ رکھتے تھے) علامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا سید داؤد غزنوی اور مولانا حافظ محمد گوندلوی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کا ذکر انھوں نے زبانی بھی کئی مرتبہ کیا اور مختلف تحریروں میں بھی کیا ــــــ لسان القرآن جلد اوّل کے مقدمہ (صفحہ ۳۲) میں لکھتے ہیں۔

"ناشکری ہوگی، اس مرحلے پر اگر ہم اپنی ان محسن شخصیتوں ... کا ذکر نہ کریں، جن کی وجہ سے قلب و ذہن میں قرآن کے بارے میں علا پیدا ہوئی اور ان داعیوں کی پرورش ہوئی جو آگے چل کر ہمارے ذوق و فہم کے پاسبان ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں اپنے معلّم و مربّی حضرت مولانا اسماعیل صاحب سلفی کا نامِ نامی اُس لائق ہے کہ ہم بہ کمالِ افتخار ان کی عظمت کا اعتراف کریں۔ ان کی توجہاتِ خاص کا فیض تھا کہ ہمارے دل میں پہلے پہل قرآن سے محبت و شغف اور اس کے فہم و ادراک کی کرنیں پھوٹیں۔ ان کرنوں کو جن حضرات کی علمی مساعی نے فانوس و مشعل کی صورت میں ڈھالا، وہ ہیں بہ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی اور پروفیسر عبدالواجد کان پوری۔"

فروری ۱۹۵۶ء کو مَیں نے "الاعتصام" کے دورِ ادارت میں سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم "حجیّتِ حدیث نمبر" شائع کیا تھا۔ اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر مضمون نگار بزرگ سے ان کے مختصر حالاتِ زندگی لیے گئے تھے جو اُن کے مضمون کے صفحۂ اوّل پر چوکھٹے میں درج کیے گئے تھے۔ مولانا ندوی نے اس نمبر کے لیے "حجیّتِ حدیث پر ایک یقین افروز دلیل" کے عنوان سے مضمون عنایت فرمایا تھا۔ اس میں اپنے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ "وہ حضرات جنھوں نے ذہن کے سانچے کو خصوصیت سے متاثر کیا، تین بزرگ ہیں (۱) مولانا ابوالکلام کی جامع اور پُروقار شخصیت (۲) انہی کے رفیقِ کار مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، جنھوں نے کہ مولانا کی سکیم دعوت وارشاد کے ماتحت کلکتے میں تدریسی خدمات انجام دیں اور پھر ندوہ میں ادیب مقرر ہوئے (۳) عاشقِ رسول جناب قاضی سلیمان منصور پوری "رحمۃ للعالمین" کے مصنفِ شہیر۔ ان کی متانت، تقویٰ اور صاف ستھری معاشرت نے ہمیشہ دیکھنے والوں سے خراجِ تحسین وصول کیا۔"

درسِ قرآن

مولانا حنیف ندوی کو قرآن سے خاص شغف اور تعلقِ خاطر ہے۔ اس افشردۂ نور، سینۂ لاہوت کے اس آخری بول اور نطقِ جبریل کی اس شمعِ فروزاں سے جو قلبِ پیغمبر پر نازل ہوئی، مولانا ندوی کو بے پناہ محبت ہے۔ مَیں نے بارہا دیکھا کہ درسِ قرآن کے لیے مولانا کو جس نے بلایا، جہاں بلایا اور جس وقت بلایا، کوئی حرفِ اعتذار زبان پر لائے بغیر فوراً چلے گئے۔ پھر بلا کسی پیشگی تیاری اور مطالعہ کے، قرآن کو کھولا اور جو آیت سامنے آئی، پڑھی، اس کا ترجمہ کیا اور ایسے ایسے نکات بیان کرنا شروع کیے کہ سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے اور ان کے ذہن وفکر پر اثر آفرینی کی نورانی چادر تن گئی۔ اسلوب اتنا پیارا اور زبان ایسی شستہ و رواں کہ جس میں خود اسلوبِ قرآن اور معانیٔ قرآن منعکس ہو کر نظر وبصر کے زاویوں میں سمانے لگیں۔

کسی نے لکھا ہے کہ قرآن اگر اُردو میں نازل ہوتا تو ابوالکلام کی زبان میں نازل ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ ابوالکلام کی زبان کے ساتھ حنیف ندوی کی زبان بھی اس میں شامل ہوتی۔

لاہور کے لارنس گارڈن میں جہاں آج مسجد دارالسلام تعمیر ہے اور لائبریری دارالسلام قائم ہے، وہاں ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر کرنل سلامت اللہ مرحوم کی تحریک پر سب سے پہلے مولانا محمد علی قصوری (ایم۔اے کینٹب) مرحوم نے درسِ قرآن کا آغاز کیا تھا۔ اس پُرفضا جگہ میں دو تین صفیں بچھادی جاتی تھیں، مغرب سے آدھ پون گھنٹہ پہلے مولانا قصوری کا درسِ قرآن ہوتا تھا۔ پھر وہیں ان کی امامت میں نمازِ مغرب ادا کی جاتی تھی۔ شروع شروع میں شام کو سیر کے لیے آنے والے کچھ لوگ اس میں شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن بعد کو کافی حاضری ہونے لگی تھی۔ مجھے یاد ہے "نوائے وقت" میں مشہور صحافی م ش (میاں محمد شفیع) نے اس پر کالم لکھا تھا، جس میں درسِ قرآن کے اس سلسلے کی تحسین کی تھی اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی تلقین کی تھی۔ نیز مولانا محمد علی قصوری سے درخواست کی تھی کہ وہ اس نیک کام کو جاری رکھیں۔

مولانا محمد علی قصوری نے ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد اُن کے بڑے بھائی مولانا محی الدین احمد قصوری نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ وہ کبھی کبھی مولانا حنیف ندوی کو ساتھ لے جاتے اور مولانا ندوی درسِ قرآن دیتے۔ ندوی صاحب کی بعض درسی تقریریں قاضی محمود احمد نے لکھ کر الاعتصام کو بھیجی تھیں اور وہ اس میں شائع ہوئی تھیں۔ بہرحال قرآن سے مولانا کو خاص شغف اور محبت ہے۔ اس کے درس کے لیے جہاں جی چاہے لے جایئے، بلا تامّل چلے جائیں گے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ترجمۂ قرآن میں مولانا کے احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اپنی کسی کتاب یا مضمون میں قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ لکھنا مقصود ہو تو اس کا ترجمہ خود نہیں کرتے، کسی دوسرے کا ترجمہ سامنے رکھتے ہیں اور پھر اُس کے الفاظ میں مناسب ردّ و بدل کر لیتے ہیں۔ دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے ہیں کہ قرآن کے ترجمے کی ذمہ داری خود نہ قبول کریں۔

صحیح بخاری کی آخری حدیث پر ایک تقریر

صحیح بخاری کی فقہی خصوصیات کا اندازہ امام بخاری کے ابواب سے ہوتا ہے۔ وہ جو باب باندھتے ہیں، اس میں کوئی نہ کوئی فقہی مسئلہ اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ شروع سے آخر

تک یہ سلسلہ برابر چلتا ہے۔ مولانا حنیف ندوی کو ایک مرتبہ دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں تقریب اختتام بخاری کے موقع پر اس کی آخری حدیث پر تقریر کے لیے دعوت دی گئی۔ علماوطلبا کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ مولانا نے حدیث، تدوینِ حدیث، امام بخاری کی شرائطِ صحت، صحیح بخاری کا مرتبہ، امام بخاری کا علوِ مقام، ابواب میں ان کی فقہیات اور اس قسم کے دیگر مباحث پر دو گھنٹے تقریر کی اور ایسے ایسے نکات بیان کیے کہ حاضرینِ مجلس نے اس سے پہلے کبھی نہ سنے تھے۔

"امروز" کے مضامین

روزنامہ "امروز" (لاہور) کے عملۂ ادارت کے بعض معزز ارکان نے کئی سال پیشتر اخبار "امروز" کے لیے مختلف مواقع پر مولانا سے مضامین لکھوائے، جن میں سے تین مضمون اس وقت میرے سامنے ہیں۔

۱۔ "ہلالِ عید یا سوالیہ نشان ؟ مسرت و شادمانی کے تین دائرے"۔ مطبوعہ ۲ جنوری ۱۹۶۸ء۔ امروز کا عید نمبر۔

۲۔ "تین اہم سوال اور پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم۔" ۹ ر جون ۱۹۶۸ء

۳۔ "ختمی مرتبت علیہ السلام"۔ ۲۹۔ مئی ۱۹۶۹ء

تفسیر ترجمان القرآن پر مقدمہ

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" ایک علمی شاہکار ہے۔ اس کی دوسری جلد سورۂ مومنون تک چھپی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے مولانا کے ہاتھ کا تحریر شدہ سورہ نور کا مسودہ بھی مل گیا تھا، جو اس تفسیر میں آزاد ساہتیہ اکادمی دہلی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مولانا نے تفسیر کی تیسری جلد جو آخر قرآن تک تھی، مکمل کر لی تھی اور اب اس کے مسودے کا سراغ مل گیا ہے۔ خدا کرے یہ بات صحیح ہو۔

ان سطور میں مقصود صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر اور بعض دیگر حضرات نے مولانا آزاد کے الہلال، البلاغ اور ان کی بعض دوسری تصنیفات سے سورۂ مومنون سے آخرِ قرآن تک کی مختلف آیات اور ان کے تراجم و تفسیر کو جمع کر کے

کتابی شکل میں چھاپ دیا ہے۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک کوشش اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور کے مالک منصور احمد صاحب نے کی ہے۔ انھوں نے مولانا محمد عبدہٗ صاحب (فیصل آباد) کی خدمات حاصل کیں اور مولانا کا اچھا خاصا تفسیری مواد جمع اور مرتب کیا۔ پھر اس میں اپنی طرف سے کچھ اضافے کر کے سورۂ نور سے سورہ الناس تک ترجمان القرآن کی تیسری جلد کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کر دی۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا اس پر سات صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے، جس میں مولانا ندوی نے بعض عربی اور اردو تفسیروں کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کا اس باب میں جو علمی و ادبی اور تحقیقی کارنامہ ہے، اس کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔

فلسفہ کانگریس

مولانا ندوی پاکستان فلسفہ کانگریس کے رکن ہیں۔ کانگریس کے بعض جلسوں میں انھوں نے فلسفے سے متعلق مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے۔ ان میں سے بعض مقالے "ہسٹری آف مسلم فلاسفی" میں چھپ چکے ہیں۔ یہ کتاب ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے سابق ڈائریکٹر ایم ایم شریف مرحوم (وفات ۱۱۔ دسمبر ۱۹۶۵) نے مرتب کی تھی جو فلسفہ کانگریس کے صدر تھے۔

یومِ اقبال پر مقالہ

چند سال پیشتر تک "یوم اقبال" ۲۱ اپریل کو منایا جاتا تھا، جو علامہ کے انتقال کی تاریخ ہے۔ (اب ۹ نومبر کو منایا جاتا ہے جو ماہرینِ اقبالیات کے نزدیک علامہ کی تاریخِ ولادت ہے)۔ مولانا ندوی نے ایک مرتبہ ۲۱ اپریل کو یومِ اقبال کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی میں "اقبال اور ان کا فلسفہ" کے موضوع سے متعلق مقالہ پڑھا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ میں حتمی طور سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ مقالہ کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوا یا نہیں ہوا۔

ریڈیائی تقریریں

غالباً ۱۹۵۴ میں ریڈیو پاکستان لاہور سے مولانا ندوی کی تقریروں کا سلسلہ شروع

ہوا۔ ہر مہینے مولانا کی چار پانچ یا اس سے زیادہ تقریریں نشر ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۴ء تک جاری رہا۔ مولانا کے پاس ان تقریروں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ بعض تقریریں پانچ منٹ کی، بعض دس منٹ کی، بعض بیس منٹ کی اور بعض اس سے بھی زیادہ منٹ کی ہوتی تھیں۔ یہ تقریریں مجموعی طور سے کم از کم تین ہزار صفحات پر مشتمل ہوں گی۔

مرزائیت نئے زاویوں سے

مولانا نے الاعتصام کے دورِ ادارت میں ایک مضمون لکھا تھا، جس کا عنوان تھا۔ "ختم نبوت اور اس کے حدودِ اطلاق ــــ ایک نیا جائزہ"۔ یہ مضمون انیس قسطوں پر محیط تھا۔ پہلی قسط ۳۰۔ دسمبر ۱۹۴۹ کے اور آخری قسط ۱۲ مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں چھپی تھی۔ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں کچھ اضافوں کے ساتھ اور اس موضوع سے متعلق متعدد دیگر مضامین شامل کر کے اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ کتاب کا نام تھا۔ "مرزائیت نئے زاویوں سے"۔

اس کی اشاعت کا اہتمام مولانا ندوی کے مرحوم دوست صوفی نذیر حسین (وفات ۲۷ فروری ۱۹۵۴) نے کیا تھا اور انہی کے خرچ سے یہ کتاب "مکتبۂ دین و دانش گوجرانوالہ" کی طرف سے طبع ہوئی تھی۔ کم و بیش تین سو صفحات پر مشتمل تھی۔ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی نے اس پر مقدمہ تحریر کیا تھا۔

اس کتاب کے مندرجات و مشمولات سے قارئین کا محدود حلقہ ہی مستفید ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اشاعت کے فوراً بعد ۱۹۵۳ کے شروع میں مرزائیوں کے خلاف پورے ملک میں زبردست تحریک شروع ہو گئی تھی، جس میں تمام مکاتبِ فکر کے لوگ شامل تھے۔ اس دور کی حکومتِ پاکستان (بالخصوص حکومتِ پنجاب) نے ان تمام علما و زعما کو گرفتار کر لیا تھا جو مرزائیوں کے مخالف تھے اور انھیں اقلیت قرار دینے اور حکومت کی کلیدی اسامیوں سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار لوگوں کو پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا اور مرزائیت کی مخالفت پر مبنی بہت سی کتابیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اس طرح یہ کتاب ـــ "مرزائیت نئے زاویوں سے"ـــ

زیرِ زمین چلی گئی اور اس کی تشہیر کا دائرہ سمٹ گیا۔

یہاں یہ بات لائقِ ذکر ہے کہ مولانا کے پاس اپنا کوئی اور مطبوعہ مواد نہیں ہے، صرف اس کتاب کا ایک نسخہ ان کے پاس موجود ہے۔ اِسے حسنِ اتفاق ہی کہنا چاہیے۔

قدیم یونانی فلسفہ

غزالی کی تصنیفات میں "مقاصد الفلاسفہ" ان کی مشہور کتاب ہے جو یونانی فلسفے کے دقیق مباحث کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مولانا حنیف ندوی نے "قدیم یونانی فلسفہ" کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

امام غزالی، اسلام کی فکری تاریخ کے وہ پہلے اور آخری فلسفی ہیں، جنھوں نے علم و دانش کے رائج الوقت پیمانوں کا از سرِ نو جائزہ لیا، یونانی فلسفے کے صنم خانوں پر بھرپور وار کیا اور علم و آگہی کے نئے سرچشمے کی نشان دہی کی۔ ان کی المنقذ من الضلال اور تہافۃ الفلاسفہ اس سلسلے کی نہایت اہم کڑیاں ہیں۔ تہافۃ الفلاسفہ میں انھوں نے جودتِ طبع، نکتہ سنجی اور لطائفِ فکر کے وہ جوہر دکھائے ہیں جو بجائے خود لائق مطالعہ ہیں۔ ان کی فکری بلندیوں سے نہ صرف مشرق کو ناز ہے بلکہ جدید ترین مغرب بھی اس سے متاثر ہے۔ مثلاً پاسکل (PASCAL) جب یہ کہتا ہے کہ دل کی اپنی منطق ہے اور استنباط و استدلال کے اپنے معیار ہیں، جن سے ذہن و دماغ قطعی آشنا نہیں تو اس سے صاف طور پر غزالی کے اس نظریۂ معرفت و ادراک کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جس میں انھوں نے اذعان و یقین کا رُخ ظاہر سے ہٹا کر باطن کی طرف موڑا ہے۔

غزالی کی زندگی کا اصل مقصد چونکہ فلسفہ یونان کی واماندگیوں کو اجاگر کرنا تھا اور ابن سینا اور فارابی کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے سے پہلے فلسفیانہ حلقوں میں اپنی فلسفہ دانی کی دھاک بٹھائیں۔ "مقاصد الفلاسفہ" کی تصنیف میں یہی غرض پنہاں تھی۔ اس میں انھوں نے منطق، الٰہیات اور طبعیات جیسے ان خشک مضامین کو ایسے واضح، شگفتہ اور سمجھ میں آنے والے انداز میں بیان کیا ہے کہ جس سے ان کی فلسفیانہ صلاحیتیں اُبھر کر قاری کے

سامنے آجاتی ہیں۔

مولانا حنیف ندوی نے اس اسلوب سے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ علم و ادب کے تقاضے پہلو بہ پہلو رہیں اور کسی طرح بھی مضامین کی خشکی اور زبان کا اغلاق قاری کی دلچسپیوں کو مجروح نہ کرنے پائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مولانا نے پوری کوشش کی ہے کہ غزالی کے اپنے پیرایۂ بیان کی خوبیوں کو اردو میں جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ بلاشبہ مولانا اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں اور کتاب فلسفے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا ایک دلکش حصہ بن گئی ہے۔

یہ کتاب مجلس ترقیٔ ادب (کلب روڈ، لاہور) کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ فنِ فلسفہ کی یہ معرکۃ الآرا کتاب ۳۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اور خوب صورت ٹائپ میں چھپی ہے۔

تلامذہ

مولانا نے باقاعدہ اور طویل مدت کے لیے کسی دار العلوم میں فرائض تدریس انجام نہیں دیے۔ لیکن قیامِ جامعہ سلفیہ کے ابتدائی دَور (لاہور) میں اور ادارہ علومِ اثریہ (فیصل آباد) میں جن حضرات کو ان سے بعض نصابی کتابیں پڑھنے اور ان کے علم و فضل سے مستفید ہونے کا شرف حاصل ہوا، ان میں چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا حافظ عبدالرشید۔ استاد دارالعلوم تقویۃ الاسلام۔ شیش محل روڈ، لاہور۔

۲۔ مولانا حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی۔ مہتمم جامعہ محمدیہ۔ رینالہ خورد، ضلع اوکاڑہ۔

۳۔ مولانا عبدالرشید۔ مہتمم مدرسہ ضیاء القرآن والحدیث۔ رام گڑھ، لاہور۔

۴۔ ڈاکٹر مجیب الرحمٰن۔ صدر شعبہ اسلامیات راج شاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش۔

۵۔ قاضی محمد اسلم سیف۔ ناظم دارالعلوم تعلیم الاسلام۔ ماموں کانجن، ضلع فیصل آباد۔

۶۔ حافظ عبدالصمد بنگالی۔

۷۔ مولانا شرف الحق۔ معلم گورنمنٹ ہائی سکول، احمد پور شرقیہ۔

۸۔ مولانا محمد حسین طور۔ مدرس جھوک دادو، ضلع فیصل آباد۔

۹۔ مولانا ارشاد الحق اثری ۔ استاد ادارہ علومِ اثریہ، فیصل آباد۔

۱۰۔ صاحب زادہ برق التوحیدی، فیصل آباد۔

۱۱۔ مولانا عبدالحمید، بھکر۔

۱۲۔ مولانا محمد مدنی ۔ مہتمم جامعہ اثریہ، جہلم۔

۱۳۔ مولانا محمد خالد سیف ۔ اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد۔

صدارتی ایوارڈ

۳۰۔ جولائی ۱۹۸۴ء کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے اہتمام میں مولانا حنیف ندوی کے ساتھ ایک شام منائی گئی ۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر محمد افضل نے کی جو اس زمانے میں وفاقی وزیرِ تعلیم تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر صدرِ پاکستان کی طرف سے مولانا ندوی کی تصنیفی خدمات کی تحسین کرتے ہوئے ان کو دس ہزار روپے کا چیک پیش کیا ۔ اس سے ایک سال بعد ۱۹۸۵ء میں مولانا حنیف ندوی کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے ان کی تصنیفی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ —— ستارۂ امتیاز —— ملا ۔ یہ ایک سرکاری اعزاز ہے جو مولانا کو صدرِ پاکستان نے دیا ۔ اس سے مولانا کے اعزاز میں تو اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن ایوارڈ کے اعزاز میں ضرور اضافہ ہوا ہے ۔

بعض الفاظ کا استعمال

الاعتصام کے ابتدائی شماروں میں اور کتاب " مسئلۂ اجتہاد " میں لفظ " پچھواڑہ " کئی مقامات پر نظر آئے گا، جو مولانا نے " پس منظر " کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔ جیسے اس کی پچھواڑ یہ ہے ۔ یعنی اس کا پس منظریہ ہے ۔ اسی طرح " ڈھنگ " اور " ڈھب " بکثرت ملیں گے ۔ مثلاً اس نے اس ڈھنگ سے بات کی ۔ اس نے ایسا ڈھب اختیار کیا ۔ یہ دونوں لفظ طریقہ، نہج ، اسلوب اور انداز کے معنی میں استعمال کیے گئے ہیں ۔

" بہر حال " کے بجائے " بہر آئینہ " اور " پہلی ہی مرتبہ کی جگہ " اوّلِ وہلہ " کے الفاظ دکھائی دیں گے ۔ مثلاً بہر آئینہ یہ کام کرنا ہے ۔ اول وہلہ ہی میں یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی ۔

اہلِ لکھنؤ کے انداز میں مولانا ندوی تحریر میں اکثر الفاظ کا امالہ نہیں کرتے۔ مثلاً اس بارے میں کو، اس بارہ میں، اس سلسلے میں کو، اس سلسلہ میں، اس مسئلے میں کو، اس مسئلہ میں، اس معاملے میں کو، اس معاملہ میں، لکھتے ہیں ـــــ لیکن بولتے وقت ان الفاظ کا امالہ کرتے ہیں۔ یعنی بارے میں، سلسلے میں، مسئلے میں، معاملے میں کہتے ہیں۔

خط اور اندازِ تحریر

مولانا کا خط اتنا اچھا تو نہیں ہے، لیکن پختہ ہے۔ ان کا مسودہ عام طور پر صاف نہیں ہوتا۔ اس میں کانٹ چھانٹ بھی ہوتی ہے اور جگہ جگہ خطرناک موڑ بھی آتے ہیں، جسے دیکھ کر کاتب گھبرا اٹھتا ہے۔ جو کاتب ان کے خط اور اندازِ تحریر سے آشنا نہ ہو، اس کے لیے ان کے مسودے کی کتابت میں بہت دِقّت پیش آتی ہے۔ جتنا وقت ان کے ایک صفحے کی کتابت میں صَرف ہوتا ہے، اتنے وقت میں صاف مسودے کے دو صفحات کی کتابت بآسانی ہوسکتی ہے۔ مَیں چونکہ ان کے خط اور اندازِ تحریر سے مانوس ہوں، اس لیے کاتب کو اُسے سمجھنے کے لیے مجھ ہی سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ مولانا بھی اسے میرے ہی "بابِ تفہیم" پر دستک دینے کی ہدایت فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ بسا اوقات خود بھی اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے کو سمجھنے اور پھر کاتب کو سمجھانے سے "عاجز" آجاتے ہیں۔

مولانا کا ایک "کمال" یہ ہے کہ ڈیش کا مے کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ جہاں ڈیش کا محل ہو، وہاں کامہ بنا دیتے ہیں اور جہاں کامہ ہونا چاہیے، وہاں ڈیش ڈال دیتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جہاں ڈیش یا کامہ کسی کی ضرورت نہیں ہوتی، وہاں عام طور پر ڈیش ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً "کہ" کے آگے ڈیش، "بلکہ" کے آگے ڈیش، "اور" کے آگے ڈیش۔ اکثر کاتبوں کو بھی ان نزاکتوں کا علم نہیں ہوتا، وہ بھی مکھی پر مکھی مارتے چلے جاتے ہیں۔ جو تھوڑا بہت جانتے ہیں، وہ البتہ اس کا خیال رکھتے ہیں اور ہر نشان مناسب مواقع پر لگاتے جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کا مسودہ کتابت کے لیے اسی کاتب کو دیا جاتا ہے جو ان کے اس نوع کے "کمالات" سے باخبر ہو۔ یا پھر کتابت سے پہلے مَیں خود مسودہ دیکھ کر ایسی چیزوں کی اصلاح کر دیتا ہوں۔

مولانا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھیں اکثر اوقات پیرے بنانے میں بڑی دِقت پیش آتی ہے۔ بس لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مناسب مقام پر وہ بہت کم نئے پیرے بناتے ہیں۔ یہ فرض بھی بے چارہ کاتب انجام دیتا ہے یا میرے جیسا کوئی اور اللہ کا بندہ۔!

ان باتوں کی طرف ان کو بارہا توجہ دلائی گئی اور کئی دفعہ عرض کیا گیا کہ ان کا خیال رکھا کریں۔ مگر ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ "یہ مشکل کام مجھ سے نہیں ہوسکتا" یعنی پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے، خوب صورت سے خوب صورت الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں، علم و ادب کا حسین تریں گلستان سجایا جا سکتا ہے اور تحقیق و کاوش کی دیدہ زیب دنیا بسائی جا سکتی ہے، مگر ڈیش، کامے اور پیروں کا صحیح مقام متعین نہیں کیا جا سکتا۔

خصائص و عادات

مولانا ندوی خود بھی خوش مزاج، خوش اطوار، خوش اخلاق اور خوش گفتار ہیں اور چاہتے ہیں کہ باقی لوگ بھی ان تمام "خوشات" سے بہرہ مند ہوں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ مولانا پنجابی میں گفتگو کر رہے ہیں، لیکن اس اثنا میں کوئی علمی سوال کیا گیا تو جواب کے لیے فوراً اردو بولنے لگے۔ بعض اوقات تو اس انداز سے جواب دیتے ہیں کہ بات آسانی سے مخاطب کی سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن چونکہ فلسفے کے آدمی ہیں اور فلسفی مجبور ہے کہ سائل کی ذہنی و فکری سطح کا لحاظ کیے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کرے، اس لیے ایسا فلسفیانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں کہ ہر شخص کے لیے بات کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر فلسفے کی بھاری بھرکم اصطلاحیں اور عربی کے دقیق الفاظ اُسے مزید مشکل بنا دیتے ہیں۔

مولانا کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کسی کے حریف اور مخالف نہیں ہیں۔ کبھی کسی کے درپے آزار نہیں ہوئے۔ ہر شخص سے ہمدردی کا برتاؤ کرتے ہیں، ہر ایک سے اس کے مرتبے کے مطابق انس و محبت سے پیش آتے ہیں اور اس سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔

اہلِ علم کی انتہائی قدر کرتے ہیں اور ان سے ملاقات کے شائق رہتے ہیں۔ حسد، کینہ، بغض، سازش اور غیبت وغیرہ کے الفاظ سے ان کی ڈکشنری خالی اور ان عیوب سے ان کا دل ناآشنا ہے۔

موجودہ دَور کے اہل حدیث علما میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف سے انھیں بالخصوص قلبی تعلق ہے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب بھی ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ مولانا ندوی ان کے الدعوۃ السلفیہ کے رکن بھی ہیں۔ اب دونوں بزرگ بیمار ہیں۔ مولانا عطاء اللہ صاحب تقریباً چار سال سے صاحبِ فراش ہیں اور مولانا حنیف ندوی کم و بیش ایک سال سے بسترِ مرض پہ دراز ہیں۔ کافی عرصے سے بیماری کی وجہ سے دونوں کی ملاقات کا سلسلہ بند ہے۔ مَیں دونوں کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا ہوں، اور دونوں مجھ سے ایک دوسرے کا حال پوچھتے اور سلام پہنچاتے رہتے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ دونوں بزرگوں کو صحتِ عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔

مولانا ندوی پہ زندگی میں کئی دَور آئے۔ انتہائی تنگ دستی کا دَور بھی آیا اور ان کی توقع سے بہت زیادہ آسودہ حالی کا بھی۔ شدید بیماری کا بھی اور تندرستی کا بھی۔ لیکن ملال و اضطراب اور نخوت و رعونت کی آلودگیوں سے مطلعِ قلب ہر حال میں صاف رہا اور ہر دور میں صابر و شاکر رہے۔ انسان سے اور حالات سے ہمیشہ صلح رکھی اور ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ تنگ دستی اور بیماری کی تکلیفوں کا دور اللہ کی رضا قرار دے کر گزارا، اور آسودگی و صحت کو اس کی نعمتِ عظمیٰ سے تعبیر کیا۔ نہ غربت میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا اور نہ آسودگی میں کبر و غرور کا مظاہرہ کیا۔ چند مخلص دوستوں کے سوا غربت کو سب سے چھپائے رکھا اور کچھ آسودہ حال ہوئے تو آسودگی کی حدود سے بڑھ کر اس کے آثار ظاہر کیے۔

۱۹۳۰ء سے لاہور میں اقامت گزیں ہیں۔ درمیان میں (۱۹۴۹ سے ۱۹۵۲ء تک) تین چار سال گوجرانوالہ میں مقیم رہے۔ لیکن ذاتی مکان کہیں نہیں بنا سکے۔ ۱۹۸۶ء کے اختتام تک کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ گوجرانوالہ میں چھوٹا سا آبائی مکان تھا جو غربت کی مجبوریوں کے باعث فروخت کر دیا تھا۔ قیامِ پاکستان سے قبل معلوم نہیں کیسے اور کہاں سے اتنی رقم آئی کہ مغل پورہ (لاہور) میں پانچ مرلے کا ایک پلاٹ خرید لیا، مگر حالتِ عسرت میں اسے بھی بیچ دینا پڑا۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں بہت ہی سستے داموں ایک کنال کا پلاٹ خریدا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے بھی سستے بھاؤ فروخت کر ڈالا۔

ہمیشہ توکل اور قناعت کی زندگی بسر کی۔ زیادہ سے زیادہ حصول کی بات تو بہت بڑی ہے اور ان کی فطرت وعادت کے قطعی خلاف ہے، کسی قدر زیادہ اور مناسب حصول کے لیے بھی کبھی کوشش نہیں کی۔ جو اللہ نے جائز اور صحیح ذریعے سے دے دیا اس کو بہت سمجھا۔ اس دور میں ان اوصاف وخصائص کے لوگ طبقۂ علما میں بھی اور دیگر طبقوں میں بھی خال خال ہی نظر آئیں گے۔

ان کی ایک عادت یہ ہے کہ دفتر آتے ہیں تو پہلے (کم از کم ان سطور کے راقم سے) چند منٹ کے لیے باتیں ہوتی ہیں اور مبادلۂ لطائف کا سلسلہ چلتا ہے۔ پھر ایک ساتھ چائے پی جاتی ہے اور اس کے بعد لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ گھر میں بھی یہی مشاغل جاری رہتے ہیں۔ بیوی بچوں اور پوتوں سے بے تکلفانہ گفتگو کرتے ہیں اور سب کو دوست سمجھتے ہیں اور اسی سطح پر اُتر کے ان سے باتیں کی جاتی ہیں۔ گھر میں لطیفوں، باتوں اور چائے سے جو وقت بچتا ہے، اس میں لکھتے بہت کم ہیں، کسی پسندیدہ کتاب کے مطالعہ میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ روزانہ اخبار باقاعدہ پڑھتے ہیں۔ بعض خبروں اور مضمونوں پر تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اخبار میں جو بات قابلِ تبصرہ ہوتی ہے، اس کے بارے میں پہلے دوسرے کی رائے دریافت کرتے ہیں، پھر اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس پر اچھی خاصی تقریر بھی ہو جاتی ہے اور جو رائے ان کی ہو، اس کو صحیح سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اگر ان سے اظہارِ اختلاف کیا جائے تو فرماتے ہیں، آپ سمجھے ہی نہیں اور سمجھنا چاہتے بھی نہیں ہیں۔ صحیح بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔

اب آئندہ صفحات میں مولانا حنیف ندوی کے پانچ مضمون درج کیے جاتے ہیں۔

"نام میں کیا دھرا ہے۔ کیا "الاعلیٰ" کا لفظ اللہ کے لیے مخصوص ہے؟"

یہ مضمون ۸ ستمبر ۱۹۵۰ کے الاعتصام کے صفحۂ اول پر شائع ہوا۔

"مدرسہ مویدیہ کے ایک منارے تلے علامہ عینی درسِ حدیث دیتے تھے۔ سوئے اتفاق سے وہ ایک دن دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ حافظ ابن حجر جو اُن کے معاصر اور عالی قدر حریف تھے۔ اس پر کب چوکنے والے تھے۔ انھوں نے اُس کی عجیب وغریب معنوی توجیہ

پیدا کرلی اور لفظِ "عینی" کی رعایت سے خود انہی کی زبان سے یہ کہلوا دیا کہ اس میں میری ہی نظرِ بد کی کرشمہ سازی کو دخل ہے، ورنہ منارہ کہاں گرتا۔ ع

فلیس علی جسمی اضر من العینی

"عینی کے حلقۂ درس میں جب یہ لطیفہ پہنچا تو انھوں نے بھی چوٹ کی، اور حق یہ ہے کہ اس میں کامیاب رہے۔ انھوں نے کہا، حضرت! اگر منارہ گرا ہے تو نظرِ بد سے نہیں، بلکہ اس لیے کہ اس کی تعمیر میں جو پتھر استعمال ہوا ہے، وہ ناقص ہے۔ ع

ما اوجب الھدم الا خیبۃ الحجر

اس میں ان کا اشارہ "حجر" کی طرف ہے، جس کے معنی پتھر کے ہیں۔ معاصرانہ چشمک میں ایسے ایسے لطیفوں کا ہو جانا بالکل قدرتی امر ہے۔

"اوّل اوّل میں جب حسرت صاحب نے حرف و حکایت کے کالم میں مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کے نام پر طبع آزمائی فرمائی تو ہم یہی سمجھے کہ یہ بھی تقاضائے تفنن و معاصرت ہے حسرت صاحب چونکہ آج کل موج میں ہیں اور اتفاق سے اس کیمپ سے متعلق ہیں جو بہرآئینہ اسلامی تصورِ دین کا حامی نہیں، اس لیے وہ ان کی خوش نودیِ مزاج کے لیے ایسا لکھ رہے ہیں، اور حسرت صاحب میں یہ خوبی ہے کہ دوستی کے متعلقات عموماً ان کے عقیدہ و فکر کو بدلتے رہتے ہیں۔ بسا اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی مجلس میں وہ روایتی مسلمان بھی ہیں اور پکے کمیونسٹ بھی۔ اگر ان کے میمنہ میں چند خوش ذوق مسلمان تشریف فرما ہیں تو حسرت صاحب ان کی رعایت سے یہ کہتے ہوئے سنے جائیں گے کہ صاحب، ہم مسلمان ہیں، آخر ہم اسلام کیسے چھوڑ سکتے ہیں، اور جب میسرہ پر نظر پڑے گی تو کمیونسٹ دوست بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے، ان کی دلجوئی بھی ان کے نزدیک راہ و رسمِ دوستی کے لحاظ سے ضروری ہے، اس لیے دو چار باتیں ان کے ڈھب کی بھی ہو جائیں گی، مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ بات حرف و حکایت کے فکاہی کالم سے نکل کر علم و افتا کے سنجیدہ حلقوں میں پہنچ گئی ہے اور اس میں بڑی دھوم دھام سے بحث بھی ہو رہی ہے۔

"ہم نہیں چاہتے تھے کہ مسئلے کی اس فقہی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ مگر اس کا کیا کیا

جائے کہ بعض دوستوں کی مضمون نگاری اور مقالہ نویسی نے اسے فی الواقع ایک شرعی و دینی سوال بنا ہی دیا ہے اور اب لوگ ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ کیوں صاحب "ابو الاعلیٰ" کے نام میں درحقیقت کوئی قباحت ہے؟ اور آپ بھی اس نام کو مشرکانہ ہی سمجھتے ہیں؟

ہمارا جواب یہ ہے کہ نہیں۔! ہمارے ان کے اختلافات کی نوعیت دوسری ہے۔

"اس مسئلے میں جو الجھاؤ پیدا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "اعلیٰ" چونکہ اللہ کے ہزاروں ناموں میں سے ایک نام ہے، اس لیے "ابو الاعلیٰ" کے لازماً معنی معاذ اللہ، خدا کے باپ کے ہوں گے۔ حالاں کہ اس کی ذات صمدیت ابوّت و ابنیّت کے جھمیلوں سے یکسر پاک ہے ـــــ لم یلد ولم یولد۔

"اصولاً جو بات اس میں سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جو الفاظ بطور صفات استعمال ہوئے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم وہ ہے جو اختصاص و تعیین کے اس مرتبے پر فائز نہیں کہ ان کا اطلاق سوائے ذاتِ باری کے اور کسی پر نہ ہو سکے۔

اور دوسری قسم الفاظ کی وہ ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ پھر اس اختصاص کے بھی مراتب ہیں۔ مثلاً "رحمٰن" اور "صمد" دونوں لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ لیکن دونوں کے مرتبۂ اختصاص میں فرق ہے۔

وہ الفاظ جو اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی، جیسے حیّ، جمیل، حکیم، علی اور سلام وغیرہ۔ ان کے استعمال میں قطعی کوئی حرج نہیں۔ اس میں دیکھا یہ جائے گا کہ استعمال کرنے والے کی نیت کیا ہے۔ بلکہ استعمال کے قرائن یہ بتائیں گے کہ یہاں مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یا کوئی اور شخص ـــــ چنانچہ یہ دیکھیے کہ حیّ سیکڑوں مسلمانوں کا نام ہو گا، مگر اس میں کبھی یہ غلط فہمی نہیں ہو گی کہ یہ دعوئ الوہیت کے مترادف ہے۔ تہذیب التہذیب میں بھی اس کی ایک مثال موجود ہے۔ "جمیل" اللہ کا پیارا نام ہے، اور ہزاروں اور لاکھوں مسلمان بھی اس نام سے موسوم ہیں۔ تہذیب ہی میں یہ نام پانچ مرتبہ آیا ہے۔ "الحکیم" جو معرّف باللام بھی ہے۔ یہ بطور انسانی نام

کے کم وبیش تنتیس مرتبہ تہذیب التہذیب میں مذکور ہوا ہے۔ "علی" اللہ کا نام ہے، اور کون نہیں جانتا کہ یہی نامِ نامی حضرت علی بن ابو طالب کا بھی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ۱۶۳ مرتبہ یہ تہذیب التہذیب میں آیا ہے۔ ہزاروں مسلمان اس نام سے اب بھی موسوم ہوں گے۔ "سلام" اللہ تعالیٰ کا نام ہے، لیکن سلام کہلانا ناجائز نہیں۔ چنانچہ تہذیب التہذیب میں ایک راوی بعینہٖ سلام بن ابی سلام موجود ہے۔ یعنی یہ الفاظ ایسے ہیں جن کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اس درجے کا اختصاص لیے ہوئے نہیں ہے کہ دوسروں کے لیے ممنوع ہو، لہٰذا ان سے تسمیہ اور تکنّی قطعی جائز ہے۔

"الاعلیٰ" یا "اعلیٰ" بھی من جملہ انہی الفاظ کے ہے۔ اس کا اطلاق قرآن حکیم میں مثال پر بھی ہوا ہے۔ وللہ المثل الاعلیٰ (نحل) یا ولہ المثل الاعلیٰ (روم) فرشتوں کی ایک قسم کو بھی "ملاءِ اعلیٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لا یسّمّعون الیٰ الملاء الاعلیٰ (صافات) افق کے لیے بھی یہ آیا ہے۔ وھو بالافق الاعلیٰ (نجم) اسی طرح ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے "الاعلیٰ" قرار دیا ہے۔ وانتم الاعلون (آل عمران) اور حضرت موسیٰ کو خصوصیت سے "الاعلیٰ" ٹھہرایا ہے، قلنا لا تخف انک انت الاعلیٰ۔ لہٰذا "اعلیٰ" یا "ابوالاعلیٰ" کہلانے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔

اس نام پر اعتراض کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ "ابو" کا لفظ کھلا ہوا قرینہ ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ انسانی نام ہے، خدا کی صفت نہیں۔ یوں اعتراض کرنے والوں نے کس کو چھوڑا ہے؟ امام ترمذی کی کنیت "ابو عیسیٰ" پر بھی اعتراض کیا گیا کہ جب قرآن نے مسیح کی ولادت کو بغیر باپ کے مانا ہے تو یہ مسیح کے باپ کیسے ہوئے؟ مگر دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ خود اعتراض میں وزن کتنا ہے اور اس سے اس شخص کے مقام و فکر میں کیا تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ بات محض تفنّن کے طور پر حسرت صاحب نے کہی تھی، یاروں نے خواہ مخواہ اسے فقہ و افتا کے حضور میں پہنچا دیا۔

یعنی ہر ہر بال کی کھال اتارنا... بمدرسہ کہ بعد کے مصداق ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مودودی صاحب کے مسلک پر کچھ لوگوں کو دیانت داری سے اطمینان نہیں ہے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ یہ لوگ براہِ راست ان کے عقیدہ وفکر کو زیرِ بحث لائیں۔ "گوریلا وار" توقطعی بدذوقی ہے۔ وأتوا البیوت من ابوابھا۔

عبدالعزیز کنانی پر ایک مجلس میں ایک ظریف نے اسی طرح کا اعتراض کیا کہ صاحب آپ خلقِ قرآن جیسے اہم مسئلے پر کیوں کر بحث کرسکیں گے، پہلے روئے زیبا تو آئینے میں دیکھا ہوتا۔۔۔ آپ نے پورے اطمینانِ قلب سے جواب دیا کہ میرا دعویٰ ذاتی خوب صورتی کا نہیں، قرآن کے غیر مخلوق ہونے کا ہے۔ اس پر کوئی گرفت ہو تو پیش فرمایے۔

ہم بھی مودودی صاحب کی طرف سے ان حضرات سے کہیں گے کہ اصل چیز عقیدہ، فکر اور جماعتِ اسلامی کا مخصوص طریقِ عمل ہے۔ ان چیزوں پر کھل کر بحث کیجیے، یہ مفید بھی ہوگا اور ذوقِ علمی کی بھی اس سے تسکین ہوگی۔

نام صحیح ہو اور شرع شریف کے عین مطابق بھی ہو تو بھی خیالات وعمل پر گرفت کرنے کا حق قائم رہتا ہے ــــ اور یوں چراغ حسن بھی تو پڑھے لکھے لوگوں کا نام نہیں ہو سکتا۔ لگے ہاتھوں اسے بھی بدل ڈالیے۔ ذوق کی رعایت بھی تو آخر کچھ چاہتی ہے۔"

وفیات

وفیات پر مولانا حنیف ندوی نے بہت کم لکھا۔ ان کے اپنے زمانۂ ادارت میں تو اس موضوع سے متعلق الاعتصام میں ان کا ایک بھی مضمون نہیں ہے۔ البتہ میرے زمانۂ ادارت میں انھوں نے چار بزرگوں پر تعزیتی مضمون تحریر فرمائے جو الاعتصام میں شائع ہوئے۔ ایک علامہ سید سلیمان ندوی پر، دوسرا مولانا چراغ حسن حسرت پر، تیسرا مولانا ظفر علی خاں پر اور چوتھا سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر۔ یہ چاروں تعزیتی مضامین علی الترتیب آئندہ صفحات میں درج کیے جا رہے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کے منفرد مضامین ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی ؒ

سید صاحب نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء (۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۷۳ھ) کو کراچی میں وفات پائی۔

مولانا ندوی نے ۴ دسمبر، ۱۱ دسمبر، ۲۵ دسمبر ۱۹۵۳ اور ۸ جنوری، ۲۹ جنوری اور ۵ فروری ۱۹۵۴ء کے الاعتصام کی چھ قسطوں میں ان پر تعزیتی مضمون سپردِ قلم فرمایا، جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

آہ! موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے ایک ایسی شخصیت چھین لی، جو ہمارے لیے بدرجہ غایت محترم اور مؤقر تھی۔ علامہ مرحوم دراصل گزشتہ کئی برس سے علیل تھے اور جہاں تک فکر و قلم کی زندگی اور تازہ کاریوں کا تعلق ہے، یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ان کا رشتۂ حیات مدت ہوئی اس جانِ ناتواں اور جسمِ نحیف سے منقطع ہو چکا تھا، اور دوستوں اور عقیدت مندوں کو کوئی توقع نہیں رہی تھی کہ بحالاتِ موجودہ سید صاحب کوئی بڑا علمی کارنامہ انجام دے سکیں گے۔ یہ موت تو صرف اُن کے جسم کی موت تھی، ذہن و فکر کا ساز تو ایک زمانے سے خاموش تھا۔ مگر ان کے کارناموں اور خدمات کے پیشِ نظر اور اس صاف ستھری اور بے لوث زندگی کے پیشِ نظر جو انھوں نے بسر کی یہ کہنا پڑے گا —— ان کی موت محض ایک عالم ہی کی موت نہیں ہے، ایک محقق تاریخ نگار اور ادیب ہی کی موت نہیں ہے اور نہ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ تنہا پاکستان یا ہندوستان ہی سے متعلق ہے۔ ان کی موت سے علمی وقار مجروح ہوا ہے، شائستگیٔ اطوار متاثر ہوئی ہے، ایک خاص قسم کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کو نقصان پہنچا ہے۔ یہ کہنا کسی طرح غلط نہیں کہ پورے عالمِ اسلامی میں اس صدمے کو محسوس کیا جائے گا۔ سید صاحب کے اُٹھ جانے سے علم و شہرت کے کن کن گوشوں کو نقصان پہنچا ہے؟ اس کا اندازہ تو آئندہ حالات ہی سے ہوگا جب علمی ضرورتیں للکاریں گی اور کوئی سلیقے اور بھروسے کا آدمی نہیں ملے گا۔ اس وقت بس اتنا ہی سمجھ لیجیے، ایک عرصے تک ادب و علم کی بزم آرائیاں ان کے بغیر بے کیفی اور بے رنگی سے دوچار رہیں گی۔

یوں تو ہمارے ہاں پاکستان میں خدا کے فضل سے علما کی کمی نہیں۔ بہتیرے ایسے ہیں جن کی شعلہ مقالی سے گرمیٔ محفل کا سامان بہم پہنچ جاتا ہے اور ملک میں اچھی خاصی ہلچل

مچ جاتی ہے۔ جن کی قلمی جُنبشوں سے کتابوں کے انبار لگ جاتے ہیں اور حجم وضخامت کی دنیا میں ایک طوفان آجاتا ہے، جن کے جُبہ وعبا کی ہر ہر شکن زہد وتقدس کی ضامن ومتکفل ہے۔ مگر ان میں وہ کون ہے جو سید صاحب کی سی متانت اور خاموشی رکھتا ہو اور بغیر کسی ادعا اور ڈھول پیٹنے کے ایسے ایسے جلیل القدر کام کرجاتا ہو کہ ان پر فخر کیا جاسکے۔ قحط الرجال کے اس دور میں جب کہ ہر طرف سطحیت اور اُتھلے پن کا دَور دَورہ ہے اور ایسے اہل علم وقلم کا افسوسناک حد تک فقدان ہے جن کی طرف پورے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ دیکھا جاسکے۔ سید صاحب کا ہم کو داغِ مفارقت دے جانا، ایسا حادثہ ہے جس کو آسانی سے نہیں بھلایا جائے گا۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ گزشتہ متعدد برسوں سے ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آچکی تھی اور یہ اپنے اس مقام سے کہ جہاں ان کی بے نظیر شخصیت اور اُن کی نمایاں انفرادیت اور عظمت کے عَلَم گڑے تھے، ہٹ کر ایک خاص حلقے اور زاویے میں سمٹ آئے تھے، تاہم ہماری یہ رائے ہے کہ ان کی علمی خدمات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور علم وتحقیق میں ان کے اضافوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ کچھ ناگزیر نفسیاتی مجبوریوں کے پیشِ نظر سید صاحب نے اپنے کو آخر کے چند سالوں میں تمام علمی وتحقیقی حلقوں سے الگ کرلیا تھا اور اس میں اس حد تک غلو تھا کہ ان کو اپنے ہی ان کارناموں پر شرم محسوس ہونے لگی تھی، جو بیک وقت اتنے شاندار ہیں اور اتنے روحانی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے مزید تصوف آزمائی کی ضرورت نہیں تھی، لیکن بہر آئینہ یہ اُن کا ایک ذاتی فعل تھا اور ایسا رجحان تھا جس کو اپنانے میں وہ قطعی مجبور تھے۔ اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اس گراں قدر ہستی کے انتقال پر افسوس ہے اور اس صاحبِ علم وفضل کی وفات کا غم ہے، جس نے سیرت النبیؐ کے بقیہ ابواب وفصول کو اپنی ہنرمندیوں سے سجایا، جس نے سیرتِ عائشہ لکھ کر ثابت کیا کہ ازواجِ مطہرات کی فضیلت صرف اس بنا پر نہیں تھی کہ ان کا تعلق آنحضرت سے میاں بیوی کا تھا، بلکہ ان کی بزرگی وعظمت کا راز ان کی سیرت واخلاق اور مجتہدانہ بصیرت میں پنہاں تھا۔ جس نے خطباتِ مدراس لکھ کر ہزاروں واعظوں کے لیے سامانِ وعظ مہیا کیا اور آنحضرت کی جامعیتِ کبریٰ کو اس

انداز سے ثابت کیا، اور آپ کے کردار و سیرت کے ایک ایک خدوخال کی حفاظت و صیانت کو اس طور پر واضح کیا کہ فتنۂ انکارِ حدیث کے دروازے کم از کم معقول لوگوں پر تو بند ہی ہو گئے۔

ہمیں علامہ مرحوم کی زندگی کے ان لمحات سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں انھوں نے اپنی ذات کو حنفیت کے ایک تنگ اور جامد خانے میں محبوس کر لیا تھا اور ان جکڑ بندیوں کو پھر سے اختیار کر لیا تھا جس کو خود انھوں نے اور ندویت نے برسوں کی کاوش و محنت سے توڑا تھا، ہمیں ان کی زندگی کے ان اوقات سے بھی بحث نہیں، جس میں انھوں نے روحانیت کی ایک خاص فقیہانہ شکل کو اپنا لیا تھا اور بظاہر ہم سے کٹ چکے تھے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، برسوں کے علمی مشغلوں نے ان کے جسم میں اتنی سکت ہی نہیں رہنے دی تھی کہ عمر کے آخری لمحوں تک وہ اس انداز کو قائم رکھ سکتے کہ جس کی علامہ شبلی نے طرح ڈالی تھی۔ لیکن اس علیحدگی و انزوا کے باوصف ان کی خدمات اور علمی کاوشوں کے ایسے پہلو موجود ہیں جو زندہ ہیں، جوان ہیں اور جن میں استدلال و فکر کی وہی جولانیاں ہنوز تازہ ہیں۔ اس لیے ہمارے دل میں اس سید سلیمان کے لیے اب بھی پوری پوری جگہ ہے جس نے کہ ہمارے علم و ادب کو اپنی معلومات و معارف سے مالا مال کیا اور ایک خاص نوع کی دینی بصیرت پیدا کی۔

سید صاحب کا ایثار

دار المصنفین اعظم گڑھ کو گو علامہ شبلی مرحوم نے قائم کیا، لیکن اس کو ایک کامیاب ادارہ اور مؤسسہ کی شکل میں سید صاحب کی کوششوں نے ڈھالا اور انہی کی وجہ سے اس کی شہرت کو چار چاند لگے۔ یہ اگر چاہتے تو بڑی گراں قدر تنخواہ اور مشاہرے پر کسی یونیورسٹی میں بڑی آسانی سے پروفیسر ہو جاتے۔ لیکن پروفیسری پر لات مار کر تو یہ آئے تھے، اس لیے ان کا اصول تھا کہ علم کی خدمت دولت و ثروت کے حصول سے کہیں بہتر ہے۔ باہر کے لوگوں کو شاید اس چیز کا علم نہیں کہ سید صاحب ایسا یگانۂ روزگار عالم کتنے کم معاوضے پر سالہا سال تک دار المصنفین میں بیٹھا، علم و معارف کی اشاعت میں مصروف رہا، حالانکہ ان سے

بہت ہی کم درجے کے لوگ بڑی بڑی ملازمتوں پر فائز تھے اور ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی یہ فطری درویشی اور قناعت ہی تھی کہ جس کی بدولت یہ ایک جگہ جم کر کام کرنے کے لائق ہو پائے اور بلند پایہ تصنیفات کو آئندہ نسلوں کی راہ نمائی کے لیے چھوڑ گئے۔ ورنہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ دولت کی بھوک اور ثروت کی بے پناہ طلب نے ان کی اچھی خاصی صلاحیتوں کو ضائع اور برباد کر دیا۔

کسی علمی کام کے معاوضے کے دو ہی معیار ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس شخص کے رتبہ و مقام کو ملحوظ رکھ کر رقم کی تعیین کی جائے اور دوسرے یہ کہ اسے اتنا دیا جائے جس سے اس کا دماغی سکون برقرار رہے اور وہ فراغت و دل جمعی سے اپنے مشغلوں کو جاری رکھ سکے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ دار المصنفین میں جو لوگ بڑے اونچے پیمانے کا علمی کام کرتے تھے، ان کی تنخواہیں ان دونوں معیاروں کے اعتبار سے بھی کم تھیں۔

غالباً ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے، علامہ مرحوم کی دعوت پر خاکسار کو ایک مہینے کے لیے دار المصنفین میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا، دل چاہا کہ کسی نہ کسی طرح اس بزمِ علم میں شرکت کا موقع مل جائے۔ علامہ مرحوم سے اس آرزو کا ذکر کیا، تو آپ مسکرائے (اور وہ صرف مسکراتے تھے، ہنسی اور قہقہے نے ان کے پُر شکوہ وقار و سنجیدگی کو کبھی مجروح نہیں کیا تھا) فرمایا، بھائی! تمھاری ضروریات و مجبوریوں کا مجھے علم ہے، ہماری صاف ستھری زندگی، اور ایک خاص قسم کی وضع داری پر نہ جاؤ، یہاں ہمیں جو کچھ ملتا ہے وہ اتنا تھوڑا ہے کہ تم اس پر گزر نہیں کر سکتے ــــــ اس وقت اپنی مجبوریوں پر تو جو افسوس ہوا وہ ہوا ہی، زیادہ تعجب اس امر پر ہوا کہ یہ لوگ کس قدر بے نفسی سے اور ایثار سے کام لے کر اتنے بڑے ادارے کو چلا رہے ہیں۔

ایثار و قربانی کا یہ جذبہ ان میں فطری تھا۔ ایک مرتبہ بدوملہی ضلع سیالکوٹ میں جمعیت اہل حدیث کا جلسہ تھا۔ لوگوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس میں سید صاحب بھی تشریف لائیں۔ چنانچہ خط لکھنے کو تو لکھ دیا گیا اور اس میں شرکت کی باقاعدہ دعوت بھی دے دی گئی، لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اتنا بڑا آدمی اپنے علمی مشغلوں کو چھوڑ کر، کیا پنجاب کے قطعی غیر معروف

اور دُور افتادہ گاؤں میں آسکے گا، مگر ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب ہم نے دیکھا کہ یہ اہلِ حدیث کے چھوٹے سے جلسے میں بہ نفسِ نفیس تشریف لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں سننے کی بات یہ ہے کہ اعظم گڑھ سے بدوملہی تک کے مصارفِ سفر سید صاحب نے خود برداشت کیے۔ اہلِ جلسہ نے ان سے بہتیرا کہا کہ جناب کچھ تو قبول فرمایے اور زیادہ نہ سہی، ریل کا کرایہ تو آپ کو لینا چاہیے، مگر آپ نے یہ کہہ کر قصہ ختم کر دیا کہ یہ تو میرا اپنا مشن تھا، کیا اس پر بھی کسی صلے کا آپ مجھے مستحق سمجھتے ہیں — آہ! یہ ایثار پیشہ لوگ! اور یہ بے نفس ہستیاں!!

ان میں اور علامہ شبلی میں فرق، ان کا نقطۂ نظر زیادہ صائب تھا۔

ان میں اور علامہ شبلی میں کیا فرق تھا؟ اندازِ تصنیف اور طرزِ نگارش میں، ان میں وہ کیا خصوصیات تھیں، جو ان کو ممیز کرتی تھیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے، اور آئندہ مورخ جب ان کی تاریخ لکھے گا اور ان کی تصنیفات پر نظر ڈالے گا تو خصوصیت سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ علامہ شبلی مرحوم میں جو ذہانت، جودتِ فکر اور جامعیت و وسعت تھی، اور ان کے اسلوبِ تحریر میں جو ادبیت، بے ساختہ پن اور ایک خاص قسم کی دلآویزی تھی، اس کا تتبع مشکل ہے، اور شاید اس تتبع اور پیروی میں ان کے شاگردوں میں سے مولانا عبدالسلام ندوی ہی کامیاب ہوئے ہیں (اللہ تعالیٰ انھیں تادیر سلامت رکھے) لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں تک نقطۂ نظر کی اصابت و درستی کا تعلق ہے، علامہ مرحوم اپنے استاد سے سبقت لے گئے ہیں۔

علامہ شبلی مرحوم کا تاریخ اور دینیات میں لکھنے کا یہ جانا بوجھا طریق تھا کہ غور و فکر اور مطالعہ سے پہلے چند مفروضات اور مقدمات کو ذہن میں قائم کر لیتے، اور اس کے بعد ان کے مطابق آگے قدم بڑھاتے اور موضوع کو پھیلاتے اور روایات و احادیث کی ترجمانی میں اس تعبیر کو صحیح سمجھتے اور لائقِ استدلال ٹھہرتے، جو ان کے قائم کردہ مفروضات کے موافق ہوتی۔

ان کی یہ روشِ خاص، ان کی تمام تصنیفات میں برابر نمایاں ملتی ہے۔ چنانچہ جاننے

والے جانتے ہیں کہ تحقیق کا یہی انداز سیرت النعمان میں ہے، اسی کی جھلک سیرت النبی میں پائی جاتی ہے اور اسی طریقِ استدلال سے انھوں نے علم الکلام وغیرہ میں کام لیا ہے۔ اس کے برعکس علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا طریقِ استدلال یہ تھا کہ مفروضات کو کتاب و سنت کے مقتضیات کے ہم آہنگ رہنا چاہیے۔

نقطۂ نظر کی یہی اصابت تھی، جس نے سید صاحب مرحوم کو اہل حدیث کے حلقوں کے اتنا قریب کر دیا تھا کہ ایک زمانے میں ہمارے دوست مولانا امام خاں نوشہروی نے انھیں علمائے اہل حدیث میں شمار کیا، حالانکہ اہل حدیث کے معروف تصور کے اعتبار سے وہ کبھی بھی اہل حدیث نہ تھے۔

الندوہ، الہلال اور معارف

الندوہ میں انھوں نے جس دَور میں لکھنا شروع کیا، وہ زمانہ تھا جب مضمون نگاری کی دنیا میں وہ نئے نئے آئے تھے۔ الہلال میں بھی انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ مولانا ابو الکلام آزاد کا رنگ ان پر چھایا ہوا تھا۔ اور انہی پر کیا موقوف ہے، الہلال میں اس زمانے میں جس نے لکھا، اسی رنگ سے متاثر ہو کر لکھا، کیونکہ اس وقت پورے ہندوستان میں انہی کے جادوئے قلم کا چرچا تھا اور ناممکن تھا کہ کوئی لکھنے والا اس مواج، متلاطم اور پُر شور دریائے فصاحت و بلاغت سے بچ کر اپنی انفرادیت اور اسلوب کو قائم رکھ سکے۔

علامہ مرحوم کے جوہر اس وقت کھلے جب انھوں نے معارف میں تحقیق و نگارش کا ایک خاص انداز اختیار کیا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں انھوں نے اپنی بے بہا تصانیف سے علم و ادب کی خدمت انجام دی، وہاں انھوں نے معارف کے ذریعے اہل قلم کے سامنے تحقیق و کاوش اور محنت و سلیقہ کے نہایت عمدہ نمونے پیش کیے اور مضمون نگاری اور نکتہ سنجی کی نئی نئی راہیں کھولیں۔

اس وقت کے معارف کا کیا معیار تھا؟ اور کون کون لوگ اس میں لکھتے تھے؟ اس کو دیکھ کر اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ علم و ادب کی یہ کتنی بڑی خدمت تھی ـــــ یقیناً اس

وقت کے معارف کو صرف ایک پرچہ اور رسالہ سمجھنا غلطی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی حیثیت ایک ادارۂ علمی کی تھی، جس سے کہ متعدد اہل علم و قلم نے فائدہ اٹھایا ـــــ معارف کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے لکھنے والوں کے ذوقِ علمی و دینی کی سمتیں بدلیں، یعنی پہلے اگر اس وقت کے علما، امکان کذب اور امکانِ نظیر کے مسئلوں پر اپنی قوتیں صرف کرتے تھے، تو اب انھیں معلوم ہوا کہ تاریخِ اسلامی کا اہم اور سنجیدہ موضوع ان کی کاوش و محنت اور ذہانت و ذکاوت کا منتظر ہے۔ معارف نے پہلی دفعہ اور کامیابی کے ساتھ اسلامی تاریخ کے مٹے ہوئے نقش و نگار کو اجاگر کیا اور لکھنے والوں کا ایک گروہ تیار کیا، جس نے کہ اسلامی تاریخ کے مختلف گوشوں کے بارے میں نہایت ہی قیمتی معلومات بہم پہنچائیں، اس اعتبار سے معارف کی اہمیت ہمارے نزدیک ان کی باقاعدہ تصنیفات سے بھی زیادہ ہے۔

سید صاحب کی سیاسی خدمات

سید صاحب مرحوم کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مشترکہ ہندوستان کی کوئی تحریک ایسی نہیں جس میں انھوں نے شایانِ شان حصہ نہ لیا ہو۔ انجمن ترقی اُردو کا غلغلہ بلند ہوا تو انھوں نے بڑے زور سے اس کی تائید کی۔ جمعیۃ علمائے ہند کے دینی و سیاسی حلقوں میں انھیں ہمیشہ اجلال و احترام سے جگہ دی گئی، خلافت کا چرچا ہوا تو دار المصنفین کے پرسکون گوشے سے نکل کر اس میں شریک ہو گئے اور اس کے اہم اجلاسوں کی صدارتیں کیں۔ پھر جب یہ طے ہوا کہ اتحادیوں کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈا کا اس کے گھر میں پہنچ کر جواب دینا چاہیے اور ایک ایسا وفد ترتیب دینا چاہیے جو یورپ میں گھوم پھر کر مسئلہ خلافت کے بارے میں شکوک و شبہات کا ازالہ کرے تو اس میں اس بنا پر سید صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں کہ ان سے بہتر اور کون اس مسئلے کے صحیح تاریخی و دینی موقف کی وضاحت کر سکتا ہے ـــــ اس وقت یورپ کے مدبّرین جن کے قافلہ سالار لائڈ جارج تھے، دراصل یہ چاہ رہے تھے کہ ترک اپنی ریاست کو کہیں دینی قالب میں ڈھال دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں اور عالم اسلامی کے دباؤ سے مجبور نہ ہو جائیں کہ پھر ان جذبات و عواطف کو زندہ کریں جن کو ختم کرنے کے لیے نشر و اشاعت کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا اور جن کو بھیانک

اور قابلِ نفرت ٹھہرانے کے لیے جھوٹ اور افترا کی پوری مشینری کو حرکت میں لایا گیا تھا۔ سید صاحب اس قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے، لائڈ جارج سے ملے، پاپائے روم سے گفتگو کی، اور پیرس میں مشہور و معروف عربی خطبہ ارشاد فرمایا۔

مکہ معظمہ میں ابنِ سعود مرحوم نے جب مؤتمر عالمِ اسلامی کا اعلان کیا تو علامہ مرحوم نائب صدر کی حیثیت میں اس میں شریک ہوئے۔ افسوس کہ مؤتمرِ عالمِ اسلامی کا یہ تصور پروان نہ چڑھ سکا، ورنہ آج پورے شرقِ اوسط کی سیاسیات کا رنگ دوسرا ہی ہوتا۔

نادر شاہ نے جب افغانستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو ارادہ کیا کہ کابل یونیورسٹی کا نصابِ تعلیم ایسے لوگوں کے مشورے سے طے پائے جو علم و فضل میں سند مانے جاتے ہوں۔ چنانچہ سید صاحب کو اس غرض کے لیے خصوصیت سے بلایا گیا اور انھوں نے اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ اس فریضے کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا۔

عربی ادبیات میں ان کا پایہ

تاریخ اسلامی کے علاوہ ادبیاتِ عربی پر اُن کی نگاہ بہت گہری تھی۔ عربی بلا تکلّف اور ایسی بولتے تھے کہ بقول ان کے، اس پر خود اہلِ زبان کو رشک آتا تھا۔ قرآن پر چونکہ اکثر غور کیا تھا اس لیے اس کی زبان اور اسالیب پر بہت عبور ہو گیا تھا۔ عربی زبان میں ایک دشواری صلات اور حروفِ روابط کی ہے۔ اچھے اچھے ادیب بھی جب لکھتے اور بولتے ہیں تو صلات کے معاملے میں ان سے اکثر چوک ہو ہی جاتی ہے۔ کس فعل کا کیا صلہ ہونا چاہیے اور کن حروف کے ساتھ اسے آنا چاہیے۔ اس پر سب سے بہتر اور قابلِ اعتماد بلکہ حرفِ آخر قرآن حمید ہے۔ سید صاحب مرحوم کو چونکہ اس کتابِ ہدیٰ سے بے حد شغف تھا، اس لیے انھیں صلات کی خوب مشق تھی۔ وفدِ خلافت کے دوران میں جب یہ مصر میں ٹھہرے تو انھوں نے اپنے اس علم و مطالعہ کی روشنی میں بڑے بڑے ادبائے مصر کو ان کی اس طرح کی غلطیوں پر متنبہ کیا اور ثبوت میں قرآن حمید کی آیات پیش کیں۔ ان کی اردو تصنیفات تو اس قدر مقبول ہیں کہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان ایسا ہو گا جو ان سے ناواقف ہو۔ لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ ان کو عربی زبان میں کس درجہ مہارت تھی۔

ان کا ایک رسالہ عربی میں غیر مطبوع ہے، جس میں کہ انھوں نے ان علما کے سوانح حیات بیان کیے ہیں اور ان حضرات کی خدمات کا نقشہ کھینچا ہے، جنھوں نے جغرافیہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ عربی اشعار کا ایک مکمل دیوان بھی ہے جو عرصہ ہوا، ادبائے بیروت نے اشاعت کے لیے مانگا تھا، لیکن سید صاحب مرحوم نے نہیں بھیجا۔

ان کی موت ایک عہد اور دور کی موت ہے

ان کا ایک ایک لمحہ علم و فن کی خدمت میں گزرا۔ افسوس نامورانِ علم و دین کا جو سلسلۃ الذہب مولانا عنایت رسول چریاکوٹی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا شبلی اور سید سلیمان مرحوم سے قائم تھا اور جو صرف سید مرحوم کے وجود سے زندہ تھا، آج وہ نظروں سے اوجھل ہے اور آنکھیں اس پر اشک بار ہیں ــــ سید صاحب کی موت ایک عالم اور کامیاب و دقیقہ رس مصنف کی موت ہی نہیں، بلکہ پورے اس عہد اور دور کی موت ہے، آج سے چالیس پچاس برس پہلے جس کی ضیا باریوں سے پورا ہندوستان منور تھا۔ اپنے اس زمانے کے انحطاط کو دیکھیے، علم و فن کے افلاس اور ذہن و فکر کی کم مائیگی پر نظر ڈالیے اور پھر بتایے کہ ایسے جلیل القدر لوگوں کے اُٹھ جانے سے، اگر دل ملول و افسردہ ہیں اور آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں تو اس میں کیا بےجا ہے:

كنت السواد لمقلتي فبكى عليك الناظر
من شاء بعدك فليمت فعليك كنت احاذر

پہلی ملاقات اور پہلا تأثر

سید صاحب مرحوم سے پہلی ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ مَیں اس زمانے میں طالب علم تھا اور علّامہ ممدوح ندوہ کے معتمد تعلیمات۔ ہم درس طلبہ نے ڈرا رکھا تھا کہ ان کا سامنا نہ کرنا ورنہ سوالات کی بوچھاڑ ہوگی اور تم ہوگے اور ایسی ایسی باتیں پوچھی جائیں گی کہ تمھارا زچ ہوجانا یقینی ہے۔ لیکن یہاں یہ شوق دامن گیر تھا کہ جس سیّد سلیمان کو معارف کے علمی مضامین میں دیکھا ہے اور جس کی اثر آفرینیوں کا اندازہ سیرت النبی میں کیا ہے، اس کو قریب سے، محسوس اور متشکل قالب میں بھی دیکھا جائے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ مَیں پہلو بچاتا، خود ان کے

ہاں پہنچ گیا ــــــ بڑی محبت اور شفقت سے ملے اور خلافِ معمول مجھ سے کوئی بات انھوں نے نہ دریافت فرمائی ــــــ قصہ دراصل یہ تھا کہ ندوہ کے طالب علموں کے بارے میں چونکہ ان کو بڑی تشویش رہتی تھی کہ مبادا ان میں کوئی علمی خامی نہ رہ جائے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ جب یہاں سے فارغ ہو کر یہ نکلیں تو اس لائق ہوں کہ ملک کی اہم ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں۔ چنانچہ جب بھی ندوہ میں تشریف آوری ہوتی تو کئی کئی دن تک قیام رہتا۔ اس دوران میں طلبا کی علمی و اخلاقی حالت کا تفصیلی جائزہ لیتے۔ کیونکہ بحیثیت معتمد تعلیمات کے یہ اُن کے فرائض میں داخل تھا۔ اس سلسلے میں ان کا معمول یہ تھا کہ طلبہ سے مل کر مختلف النوع سوالات کرتے، کسی سے صیغہ پوچھتے، کسی سے تعلیل دریافت فرماتے، کسی سے فقہ و کلام کی کوئی بحث چھیڑتے اور کسی کسی کی آشفتگیٔ لباس و وضع پر گرفت کرتے۔ اس احتساب کا نتیجہ یہ تھا کہ طالب علم ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ مَیں چوں کہ ابتدا ہی سے بحث و مناظرے کے چسکے سے آشنا تھا، اس لیے اس چیز سے مطلق نہیں گھبراتا تھا کہ خدا جانے سیّد صاحب کیا پوچھ بیٹھیں۔ بلکہ کچھ اس نیت سے بھی سید صاحب سے خود ملنے کی جرأت کر بیٹھتا تھا کہ اس طرح میری معلومات میں اور اضافہ ہوگا اور ایک بڑے آدمی سے پنجہ آزمائی کا موقع ملے گا۔ سید صاحب میرے مناظرانہ ذوق سے آگاہ تھے اور میری اس کمزوری کو جانتے تھے، اس لیے جب بھی کلام، فلسفہ اور دینی مسائل پر اس انداز سے گفتگو فرماتے کہ جس سے نہ صرف میرے اس ذوق کی باحسن وجہ تسکین ہو جاتی، بلکہ مجھے ان کی علمی عظمتوں کا بھی پتا چلتا اور دل میں یہ تاثر اُبھرتا کہ اسلامیات سے متعلق ان کے تبحّر اور فضیلت کا جو عالم ہے، یہ عام مناظر قسم کے علما میں نہیں۔ ان کی معلومات نسبتاً محض سطحی ہیں۔ یہ تاثر جو اوّل اوّل ندوہ کی صحبتوں میں پیدا ہوا تھا اور سید صاحب کی مخصوص توجہات سے پختہ ہوا تھا، آہستہ آہستہ بحث و مناظرہ سے کلی نفرت پر منتج ہوا اور ثابت یہ ہوا کہ علم قیل و قال اور معارضہ و دلیل سے کہیں زیادہ کاوش اور گہرائی چاہتا ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ علم ہی نہیں ہے، فسطائیت کی ایک گھٹیا شکل اور حربہ ہے بلکہ یہ دین کا بھی کوئی اعلیٰ تقاضا نہیں۔ انبیا کے طریقِ دعوت میں ایسی پاکیزگی، نفسیاتی رعائتیں اور معقولیت ہوتی ہے کہ جو مناظرانہ

اوچھے پن میں نہیں پائی جا سکتی۔

طبیعت کا انداز اور لطائف

سید صاحب وضع کے بہت پابند تھے، جس شخص سے جس نہج کے ساتھ ابتدا میں تعلقات استوار ہوئے آخر تک اسی جوش اور اخلاص کے ساتھ قائم رہے۔ مَیں نے سید صاحب سے کچھ پڑھا لکھا نہیں، اگرچہ سیکھا بہت کچھ ہے اور وہ میری زندگی کا بڑا ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جس محبت و شفقت سے وہ پہلے روز ملے تھے اسی انداز کو آخر تک نباہا۔ عام لوگوں کو ان کی کم آمیزی اور لیے دیے رہنے سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید ان میں پندار حد سے زیادہ ہے اور یہ کسی سے لپک کر ملنے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ وہ چونکہ علمی آدمی تھے اور سمجھ سوچ کر ایک مخصوص وضع انھوں نے اپنائی تھی، اس لیے ملنے جلنے اور تعلقات قائم کرنے میں وہ یہ دیکھ لیتے تھے کہ اس سے کیا علمی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اور آیا اس سے اس وضع اور انداز کو تو نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شخص سے جس کے متعلق اُن کو یہ معلوم نہ ہو کہ کیسا انسان ہے اور کس غرض سے آیا ہے، وہ کھل کر نہیں ملتے تھے اور نہ یہ مناسب ہی سمجھتے تھے۔ لیکن جن لوگوں سے ان کے مراسم ایک مرتبہ قائم ہو گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ ملنے کے لائق ہیں، ان سے بڑی ہی بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ اسی کم آمیزی سے لوگوں کو ان کی طبیعت کے بارے میں بھی شدید غلط فہمی ہوئی اور خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا گیا کہ یہ بس علم و فضل ہی کا پیکر بنے بیٹھے ہیں، حسِّ تفنن سے یکسر محروم ہیں۔ حالانکہ ان کے لطائف نہایت شاندار ہوتے تھے۔ اس میں طنز، تنبیہ اور بلاغت کیا کچھ نہیں ہوتا تھا ـــــ علامہ اقبال مرحوم کے متعلق ایک لطیفہ سنیے۔ ایک مرتبہ ان کے ہاں انجمن حمایت اسلام کی ایک سب کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی، جس کا ایک ممبر مَیں بھی تھا اور سید صاحب مرحوم کو بھی علمی مشوروں کے لیے بلا لیا گیا تھا۔ علامہ اقبال مرحوم میں ایک کمزوری یہ تھی کہ جتنا یہ اپنے اشعار میں اونچے تھے اور اپنے فلسفہ و افکار میں گہرے اور عمیق تھے، اتنا بات چیت میں بلند نہیں تھے، اردو خالص پنجابی لب و لہجہ میں بولتے تھے اور بقول طباطبائی کے ’جی ہاں‘ کے بجائے، ’ہاں جی‘ کہتے تھے اور جب کسی مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے

تو اکثر توازن و اعتدال کے حدود سے متجاوز ہو جاتے تھے۔ اس پر سید صاحب نے کہا، ڈاکٹر صاحب! آپ کو جو کچھ فرمانا ہو، بس نظم ہی میں فرمایا کیجیے۔ کیونکہ آپ کی نثر میں وہ بات ہرگز نہیں جو نظم و شعر میں ہے۔

دار المصنفین میں ایک دفعہ ان کی ایک تصویر دیکھی۔ یہ گروپ فوٹو تھا، جس میں ان کے علاوہ عالمِ اسلامی کی کچھ اور علمی و دینی شخصیتیں بھی تھیں۔ مجھ سے کہا، جانتے ہو یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا آپ کی تصویر ہے۔ فرمایا نہیں۔ یہ تصویر کے جواز کا فتویٰ ہے۔ مقصد یہ تھا کہ جب میں نے اور ایسے ایسے نامور حضرات نے، تصویر کھنچوائی ہے تو اس کے جائز ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب سید صاحب فی الواقع فوٹو کے جواز کے قائل تھے اور اس پر ایک طویل سلسلۂ مضامین سپردِ قلم کر چکے تھے۔

اپنے معتمدی اور نظامت کے عہد میں ایک مرتبہ ندوہ کے ایک طالب علم سے، جس کی داڑھی خاصی بڑھ آئی تھی، پوچھا کہ میاں کس درجے میں پڑھتے ہو؟ اس نے شاید یہ کہا کہ چہارم میں یا پنجم میں۔ آپ کو یہ سن کر تکلیف ہوئی کہ اس عمر میں بھی یہ درجہ چہارم یا پنجم سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ فرمایا میاں تمہارا علم تمہاری داڑھی سے بہت چھوٹا ہے، اس لیے یا تو علم میں ترقی کرو یا داڑھی کی ترقی کو روکو۔

اسی طرح کے بیسیوں لطیفے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں تفنّن و مزاح کی صلاحیتیں موجود تھیں اور وہ اس طرح خشک اور متقشف نہیں تھے جیسا کہ بعض لوگوں نے سرسری ملاقاتوں سے اندازہ کیا۔

آخری ملاقات

علامہ مرحوم سے آخری ملاقات "جامعہ اشرفیہ" میں ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ مولانا عبدالباری جو پہلے پروفیسر عبدالباری تھے، اس وقت علامہ مرحوم کی معیت میں لاہور آئے تھے۔ ان سے بھی یہیں علیک سلیک ہوئی ـــ اللہ! اللہ! ان لوگوں میں کیا کیا انقلاب آئے، یا تو ہم اس عبدالباری صاحب کو جانتے تھے جنھوں نے برکلے کی ارتیابیت پر قلم اٹھایا تھا، مذہب و عقلیات پر بحث کی تھی اور سیرۃ النبی کے ان ابواب پر کامیاب طبع آزمائی کی تھی، جن کا تعلق

معجزات و خوارق سے تھا یا اب ایسے عبدالباری سے دوچار تھے، جن پر فلسفہ و حکمت کے کسی شائبہ تک کا پتا نہ چلتا تھا ـــــ بالکل یہی حال خود علامہ مرحوم کا تھا، ان میں بھی جو کایا پلٹ ہوئی اس کا بھی یہی انداز تھا۔ یا تو ہم اس سید صاحب سے آشنا تھے اور برسوں ایسی جامع شخصیت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا تھا کہ جن کی مجلس میں علم و ادب کے چرچے رہتے تھے، بات بات میں نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کا ثبوت دیا جاتا تھا اور تفنّن و مزاح کے ایسے عمدہ نمونے پیش کیے جاتے تھے کہ جن پر وجد طاری ہو جاتا تھا اور یا اب ایسی ذات کا سامنا تھا کہ جس پر اس سے بالکل مختلف دوسرا ہی رنگ چھایا ہوا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ اب علامہ مرحوم ایسے لوگوں میں رہ رہے تھے جو اُن کی بلندیوں اور عظمتوں سے قطعی آگاہ نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ذہنی سطح کے اعتبار سے ان میں اور علامہ مرحوم میں بڑا فرق تھا۔ سید صاحب جب ان لوگوں میں سے ایسے اشخاص کو "حضرت صاحب" کہہ کر پکارتے تھے کہ جن کا علمی درجہ اور علمی خدمات ہرگز اس لائق نہیں تھیں کہ وہ اس طرزِ تخاطب کے سزاوار ٹھہرتے تو ہمیں بے حد تکلیف کا احساس ہوتا اور مارے شرم کے ہماری گردن جُھک جاتی۔ سچ بات یہ ہے کہ سیّد صاحب کا یہ "ایثارِ نفس" ہمیں اس لیے بھی نہیں بھایا کہ انھوں نے از راہِ اخلاص جس چیز کو تصوّف و تقویٰ اور کردار کی بلندی سمجھ لیا تھا وہ ایک خاص طرح کی مقررہ زندگی، متعین چھاپ اور رکھ رکھاؤ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

جس طرح اسلام ایک طرح کی حکمت ہے اسی طرح تصوّف بھی زندگی کے جامع تصوّر کا نام ہے۔

کیونکہ اسلام جس طرح ایک جامع اور ہمہ گیر حکمت ہے اور اس سے مراد زندگی کی تنہا کوئی ایک ہی شاخ نہیں ہو سکتی، اسی طرح تصوف و تقویٰ کا مفہوم یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے مقصود زندگی کے بعض جانے بوجھے گوشے ہی ہیں۔ بلکہ یہ تو پوری زندگی کے مقابلے میں محض ایک طرح کے طرزِ فکر اور اندازِ خیال کا نام ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص تصوّف کی طرف مائل ہو گیا ہے تو اس سے ہمارا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس نے عمل کے لیے زیادہ حکیمانہ، زیادہ استوار اور مخلصانہ بنیادیں تلاش کر لی ہیں۔ یعنی اب یہ شخص اس لیے نہیں جی رہا ہے کہ

دولت و ثروت اس کے قدم چومے، شہرت و نام وری اس کا کلمہ پڑھے اور عزت و وجاہت اس کی چاکری کرے، بلکہ ان سب دواعی و اسباب کے علی الرغم اس کے عمل کے محرکات اب کچھ اس طرح کے ہوگئے ہیں کہ یہ آخرت کو دنیا سے کہیں زیادہ لائق غور سمجھنے لگا ہے اور عوام الناس اور اربابِ حکومت و جاہ کی خوشنودی سے کہیں بڑھ کر احکم الحاکمین کی خوشنودی اس کے مدِنظر ہے۔ یہ نہیں کہ دنیا کی عارضی مسرتیں اس کا نصب العین ہیں — یہ تبدیلی صرف نقطۂ نگاہ اور نیت کی تبدیلی ہے، زندگی کی بوقلمونی اور رنگارنگی اس سے متاثر نہیں ہوتی — گویا تصوف اختیار کرنے کے باوجود یہ ممکن ہے کہ گوناگوں علمی مشغلے جاری رہیں۔ زندگی میں بشاشت و انشراح اور نشاطِ کار کی صلاحیتیں قائم رہیں اور ادب، حکمت، فلسفہ، تاریخ اور فن و مشاغل کی وہ تمام کیفیتیں اور نوعیتیں جوں کی توں باقی رہیں جن کو پہلے سے اپنا رکھا ہے۔ بلکہ ان تمام چیزوں میں پہلے سے زیادہ چمک اور رونق پیدا ہو جائے — تصوّف کے یہ اونچے معنیٰ تو ہماری سمجھ میں آتے ہیں کہ ایک ادیب اور اچھا ادیب ہو جائے، ایک مورّخ زیادہ ذمہ دار مورخ بن جائے اور ایک فلسفی و حکیم اپنے تفلسف کے لیے پہلے سے بڑھ کر استوار بنیادیں تلاش کر لے۔ لیکن یہ کہ یہ نفسِ زندگی ہی سے دست بردار ہو جائے، قلم توڑ دے اور خاص طرح کے تکلفات اور اندازِ زیست کو تقویٰ و کردار کی عمدہ مثالیں قرار دے لے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آنے والی نہیں۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو سید صاحب مرحوم اور ان کے ساتھ پوری ندوی ٹیم نے جو متصوفانہ کروٹ لی ہے وہ کامیاب نہیں رہی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ یہ حضرات جب تک صوفی نہیں ہوئے تھے، ایسے ایسے ادبی، علمی اور ذہنی و تاریخی شہ پارے ان کی کاوشوں سے منصۂ شہود پر آئے کہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ لیکن جوں ہی ادب و علم کے میکدۂ حیات سے اُٹھ کر اس قافلے نے خانقاہ کا رُخ کیا، فکر و نشاط اور عمل و زندگی کا سارا کارخانہ ہی بند ہو گیا اور اگر کچھ لکھا بھی تو وہ زندہ رہنے والا نہیں۔

ہماری مجبوریاں

ہمارے اس نوع کے احساسات کو ممکن ہے، بعض لوگ بے موقع سمجھیں مگر ہمارے

لیے یہ بہت ہی باموقع ہیں۔ ہماری مجبوریاں اس سلسلے میں یہ ہیں کہ سیّد صاحب کی موت نے قدرتاً ہمیں ان تمام دوسرے صدموں کی یاد بھی دلا دی ہے جن کا تعلق اس نئی تبدیلی سے ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ان کا اظہار ہو ہی جائے اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارے سوا ان صدموں کے ذکر کرنے والا اب رہ بھی کون گیا ہے؟ ندوہ، وہ میکدۂ علم، وہ بیت الحکمت، وہ مجمع اخوان الصفا، وہ دارالادب، اور مصنفین کا گہوارہ اور وہ گلدستۂ ریاض ذوق، جس کو تیس چالیس سال کی تاریخی کوششوں نے ترتیب دیا تھا، آج کہاں ہے؟ اب ندوی بھی اور اور بولیاں بولنے لگے ہیں اور اس جمود اور مقلّدانہ روش کو سراہنے لگے ہیں جس کی مخالفت کی وجہ سے یہ مدرسۂ فکر معرض ظہور میں آیا تھا۔ اس لیے اگر ہم بھی نہ بولیں اور اس صورتِ حال کا ماتم نہ کریں تو اور کون ان جذبات کی ترجمانی کرنے والا ہے؟ —

ندوی گروہ نے تصوّف میں آکر کیوں کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا؟ اس کی دو وجہیں

بہر آئینہ غرض یہ ہے کہ سید صاحب مرحوم اور پورے ندوی طائفہ کے اس میلان سے ندوی تحریک و تصوّر کو جو نقصان پہنچا وہ تو پہنچا ہی، خود ان حضرات کی علمی ترقیات بھی رُک گئیں۔ اس کی دو نمایاں وجہیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اس وقت تصوّف کی آغوش میں آئے جب تحقیق و تفحّص کی امنگوں اور ولولوں سے پیمانۂ قلب و ذہن خالی ہو چکا تھا اور جو کچھ انھیں کرنا تھا وہ ماضی میں کر چکے تھے اور جن جن شہ پاروں کو ترتیب دینا تھا دے چکے تھے، اور وہ بلاشبہ ایسے ہیں کہ تاریخ ان کو یاد رکھنے پر مجبور ہے۔ اب یہ عمر کی ایسی منزلوں میں تھے کہ جہاں پہنچ کر اشہبِ فکر سستانا چاہتا ہے اور نفسیاتی طور پر ایسے عقائد و تصوّرات کی پناہ میں آنا چاہتا ہے جو خارجی افکار کو بھلا دیں اور ایک طرح کی باطنی آسودگی و اطمینان مہیّا کریں۔

دوسرے یہ کہ انھوں نے تصوف کے جس رخ کا تتبّع کیا وہ سراسر فقہی اور تنگ نظرانہ تھا اور زندگی کی ایسی سمٹی ہوئی تعبیر پر مشتمل تھا کہ اس میں خلاقی و وسعتِ خیال کی گنجائش

نکل ہی نہیں سکتی تھی، اس میں مسائل ہو سکتے تھے، اختلافات اُبھر سکتے تھے اور حنفیت و تقلید کے فوائد و برکات کو اجاگر کیا جا سکتا تھا، لیکن گہرائی، زندگی اور تخلیق کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ مذہب کی طرح تصوف بھی زندگی کا ایک مستقل بالذات تصوّر ہے اور اس کی تعبیر و ترجمانی میں بھی وہی اختلافِ خیال اور تشدّت رونما ہے جو نفسِ مذہب میں ہے۔ پھر جس طرح مذہب کے معاملے میں یہ صحیح ہے کہ اس کی کچھ تعبیریں اونچی اور حیات آفریں ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کے ڈانڈے زندگی کی نفی اور رہبانیت سے ملے ہوئے ہیں، اس طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ تصوّف کی بھی کئی کئی تعبیریں ہیں۔ کچھ وہ ہیں کہ جن میں گہرائی، روشن ضمیری اور زندگی ہے اور کچھ وہ ہیں کہ جن کا تعلق چند اوضاع، مخصوص نوع کی پابندیوں اور التزامات سے ہے اور بس۔ ہمیں افسوس تو یہی ہے کہ ندوی گروہ نے اگر قدم بڑھانے ہی تھے تو ایسے تصوف کی طرف بڑھائے ہوتے جس سے کہ ان میں نئی زندگی جنم لیتی اور فکر و عمل کی تازہ کاریاں اُبھرتیں، نہ یہ کہ جو کچھ کیا دھرا تھا، اسی پر پشیمان ہوتے اور جس خول سے نکلے تھے پھر اسی خول میں جا گھستے۔

مقامِ شکر اور اظہارِ عبرت

خیر، جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا اور سید صاحب کے ساتھ شکوہ و شکایات کا یہ باب بھی دفن ہوا، اور ہمیں امید ہے کہ سابقہ روایاتِ کرم کی بنا پر ہماری ان گستاخیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ ایک آخری بات ہم تحدیثِ نعمت کے طور پر ضرور کہنا چاہتے ہیں، اس لیے کہ اس کا یہی موقع ہے، پھر نہ ہم کہیں گے اور نہ کوئی دوسرا اس پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ اس اختلاف و تنقید کے باوصف جس کو ہم نے روا رکھا، صرف ہم ہیں جو اُن کی حقیقی قدر و منزلت سے آگاہ ہیں۔ صرف ہمیں یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ان کے انتقال پر ریڈیو پاکستان سے پہلی تعزیتی تقریر نشر کر سکیں اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ گزارشات پیش کر سکیں۔

اس عرصے میں ہم نے ان تمام مضامین کو بنظرِ امعان دیکھا ہے جو اس سلسلے میں مختلف رسائل و اخبارات میں چھپے ہیں، اور ہمیں یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی کہ جن لوگوں کے

ساتھ علامہ مرحوم نے آخر آخر میں اپنا رشتۂ محبت و تودّد جوڑا تھا وہ انا للہ اور خدا غریقِ رحمت کرے کے رسمی الفاظ سے آگے نہیں بڑھ سکے، اور ان کی حقیقی عظمت کا اعتراف کرنے میں انھیں کافی احتیاط کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ سید صاحب قبلہ براہِ راست ان کے اکابر میں سے نہیں تھے اور ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ ان کے اکابر کے آستانۂ عقیدت پر مجبور ہو کر ان کو آنا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ اللہ نے ان کو اپنے مرشد میں فنا ہو جانے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

گویا نہ سیرت النبی کوئی کارنامہ ہے، نہ ارض القرآن کوئی خدمت ہے، نہ حیاتِ مالک کوئی کام ہے اور نہ حیاتِ عائشہ اور دوسری گراں قدر تصنیفات ہی کوئی دینی مقام رکھتی ہیں، صرف مرشد میں فنا ہو جانا ہی بہت بڑی نیکی ہے۔

عام حالات میں ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص جسے چاہے اپنا رہنما مان لے، جس گروہ میں چاہے شامل ہو جائے اور جس طرح کے عقائد بھائیں اختیار کر لے۔ اس معاملے میں ہر شخص صرف اپنی ہی صواب دید کے سامنے جواب دہ ہے، دوسروں کو اس پر اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لیکن سید صاحب کا معاملہ جدا ہے۔ وہ معمولی اور عام آدمی کی صف میں نہیں آتے اور نہ ان کو وہ رعایت ہی دی جا سکتی ہے جو عوام کو دی جاتی ہے، کیونکہ انھوں نے عمرِ عزیز کا بہترین حصہ ایک خاص تصوّر کی اشاعت میں بسر کیا ہے، کچھ رفقا اور ساتھیوں کو لے کر ایک منزل تک پہنچے ہیں، علم و عمل کا ایک سانچہ پیش کیا ہے اور ان علمی و عملی روایات کی طرح ڈالی ہے جس سے کہ ندوی گروہ دوسروں سے ممیز ہوتا ہے۔

اب اگر صورتِ حال یہ ہو کہ خود انھوں نے ہی ان سب چیزوں کو ختم کر دیا ہو تو اُن کے دوستوں اور عزیزوں کو اس پر کم از کم اظہارِ افسوس کی اجازت تو ہونا ہی چاہیے اور اس تمام مضمون آرائی کا یہی خلاصہ ہے۔ یہ کچھ کلمے ہیں جو بے اختیارانہ دل سے نکلے ہیں اور صفحاتِ قرطاس پر پھیل گئے ہیں۔ پرانی دیواریں گرتی ہی ہیں، خشک اور خزاں رسیدہ پتوں

کا جھڑ جانا ہی ٹھیک ہے۔ لیکن اگر کسی طرح بنا بنایا محل گر پڑے اور کوئی ایسا باغ بادِ سموم کی نذر ہو جائے جس کا ایک نظارہ ہی عمر میں اضافہ کر دینے کا موجب ہو تو کسے افسوس نہیں ہوگا۔

ایک اور بات یہاں صاف ہو جانا چاہیے، تاکہ کسی نوع کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ یہ جن خیالات کا اظہار ہوا ہے، اس کا منشا کوئی گروہی تعصب نہیں، یہ محض سید صاحب مرحوم و مغفور قبلہ کی نسبت سے اس انداز کی باتیں لکھی گئی ہیں، ورنہ ہم کم از کم برسوں کے غور و فکر کے بعد عقیدہ و فکر کے جس موڑ پر ہیں وہ ایسا ہے کہ جہاں تعصب کی طرف کوئی راہ نہیں کھلتی۔ ہمارے نزدیک ہر شخص جو کتاب و سنت کی روشنی میں قدم بڑھاتا ہے، عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہے اور اس کے کاموں اور خدمات کی ایک متعین قیمت اور سطح ہے، چاہے تفصیلات میں وہ ہم سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

ایک ضروری تجویز

اس آخری گلے کے ساتھ جو خدا جانے کس سے ہے اور کیوں نوکِ قلم پر بے اختیار ٹپک پڑا ہے، ہم ان کلمات اور تجویز پر اس تعزیت کو ختم کرتے ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ اگر حکومتِ پاکستان کو توفیق عطا کرے تو وہ سید صاحب کی یادگار میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کر دے جو ان رجحانات کو فروغ دے جو پہلے پہل ندوہ کے پیشِ نظر تھے۔ یا قائدِ اعظم کی یادگار میں جو دار العلوم زیرِ تجویز ہے اس کو جلد از جلد پروان چڑھاتے اور اس میں علامہ مرحوم کے نام سے اسلامیات کا ایک مخصوص شعبہ کھول دینے کا انتظام کرے جس میں کہ منتہی اور فارغ التحصیل طلبہ اونچے پیمانے کا تنقیدی اور تصنیفی کام کر سکیں۔ اس میں ایسے لائق اور قابل اساتذہ رکھے جائیں جن کی نظر وسیع ہو اور جو دینیات کے علاوہ موجودہ مدارسِ فکر سے بھی اچھی طرح آگاہ ہوں اور یہ جانتے ہوں کہ پرانی اقدار کو نئی مصطلحات میں کیونکر ڈھالا جا سکتا ہے اور نئے نئے مذاہب فکریہ کی اسلامی نقطۂ نظر سے کیونکر تشریح ممکن ہے؟

صرف یہی ایک طریق ہے جس سے کہ ہم سید صاحب کے نام اور کام کو علمی دنیا میں زندہ

رکھ سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ ہو بھی سکے گا؟ اس کا جواب ہم کیا دیں۔ پاکستان میں یہ سوال ہی کب زیر بحث ہے کہ اپنی تہذیب وثقافت کو قائم رکھنے کے لیے کچھ کیا جائے اور بنیادی واساسی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ یہاں تو ہر شخص اس دھن میں بے قابو ہو رہا ہے کہ دولت و اقتدار کی جو سلسبیل یہاں بہہ رہی ہے، اس میں اپنا حصہ لگایا جائے، ورنہ کیا معلوم یہ موقع پھر ملے یا نہ ملے۔

حسرت کی یاد میں

مولانا چراغ حسن حسرت کا انتقال ۲۶-جون ۱۹۵۵ء کو لاہور میں ہوا، مولانا ندوی نے ۱۵۔ جولائی ۱۹۵۵ کے الاعتصام میں "حسرت کی یاد میں" کے عنوان سے ان پر تعزیتی مضمون لکھا جو درج ذیل ہے:

اسحاق بن ابراہیم موصلی کی شہرت ایک مغنّی کی حیثیت سے ہوئی۔ چنانچہ ابوالفرج اصفہانی نے "آغانی" میں بے شمار قصے اس کی نغمہ آفرینیوں کے بیان کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کی نزاکتوں پر اس کو کس درجے قابو حاصل تھا۔ مگر خود اس کی رائے اپنے متعلق یہ تھی کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے — چنگ ورباب کا مشغلہ تو اس کے ذوقِ لطیف کا صرف ایک اظہار تھا، جس کو یار لوگوں نے اس قدر اچھالا کہ اس کو اس کا طرۂ امتیاز سمجھ لیا گیا، ورنہ دراصل وہ جامعیت کے اعتبار سے اعجوبۂ روزگار تھا۔ اور ایسا یگانہ فرد تھا کہ بہت کم لوگ اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ یعنی تمام علومِ دینیہ وادبیہ میں کاملانہ دستگاہ رکھتا تھا۔ صرف ونحو کے رموز اس پر واتھے، عروض وشعر کا یہ دھنی تھا، منطق والٰہیات کی مشکلات اس کے سامنے ہیچ تھیں اور فقہ وحدیث اور علم المسائل میں تو وہ اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ کردار وسیرت کی پاکیزگی کا یہ عالم تھا کہ خلیفۂ وقت نے یہ کہہ کر اس کی عظمت کا اعتراف کیا کہ:

"اسحاق! تو اگر شعر وغنا سے متّہم نہ ہوتا تو تمہارا عفاف اور اصابت رائے اس بات کی متقاضی تھی کہ میں تمہیں عہدۂ قضا کی پیش کش کرتا۔"

مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ بھی کم و بیش اسی طرح کا حزنیہ وابستہ ہے۔ ان کی شہرت اگرچہ ایک کامیاب اور صاحبِ طرز مزاح نگار کی حیثیت سے ہوئی، لیکن وہ صرف ظرافت نگار اور ادیب ہی نہ تھے، بلکہ تاریخ اسلامی پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ فارسی کے ذخیرۂ نظم و نثر کے شناور ہی نہیں، بہترین نقاد بھی تھے۔ اساتذۂ سخن اور ان کی خصوصیات فنی ازبر تھیں اور اردو تو ان کے گھر کی چیز تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے چند تاریخی سلسلوں کو جس سلیقے اور ہنرمندی سے مدوّن کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ تصنیف و تالیف کو مستقل طور پر اپنا لیتے اور اسی کے ہو رہتے تو اس میدان میں ان کی خدمات بہت سے پیشہ وروں کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیتیں۔

ان سے پہلی ملاقات آج سے بیس پچیس سال پہلے عرب ہوٹل کی ایک صحبت میں ہوئی اور پھر اس نے گہرے روابط کی ایسی صورت اختیار کر لی کہ جو اب تک محفوظاتِ دل کی متاعِ گراں بہا ہے۔ ان دنوں یہ عموماً یہیں بالالتزام محفل آرا ہوتے تھے اور یہیں ان کی قابلیّت و جامعیت کے جوہر کھلتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے منتہی طالب علموں کا ایک ہجوم انھیں گھیرے رہتا۔ ادبِ جدید، شعر و شاعری، کانگرس اور لیگ اور دینی مسائل اپنی تمام رنگارنگیوں کے ساتھ بحث کی جھپیٹ میں آجاتے اور حسرت ان سب سے نمٹتے۔ کسی کو شعر سناتے، کسی پر پھبتی کہتے، کسی کے سامنے تحقیق و تنقید کا دریا بہاتے اور کسی کسی کو ٹرخا بھی دیتے۔ عرفی، خاقانی، سعدی، حافظ اور غالب و میر کے تو ایسے ایسے چیدہ اشعار سناتے کہ وجد آجاتا۔

یہاں کی بحثوں میں اکثر ایک نازک موڑ کمیونزم اور اس کے نظریۂ تاریخ کا آجاتا — کالج کے پُرجوش لڑکے اس کو پیش کرتے اور ان سے رائے پوچھتے۔ اس پر حسرت تاثر میں ڈوبے ہوئے لب و لہجے میں کہتے کہ مولانا! (یہ ان کا تکیۂ کلام تھا) ہم بہرحال مسلمان ہیں، ہمارا ماضی سے گہرا تعلق ہے اور ہم اسلام کے لاتعداد احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے — اور درحقیقت اسلام ان کے قلب و ضمیر میں ایسا رچا ہوا تھا کہ جیتے جی اس سے دست بردار ہونا انھیں کسی طرح گوارا نہ تھا۔

جو شخص بھی ان کو بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ کوٹ پتلون میں ملبوس دیکھتا، وہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کے پہلو میں ایک اسلام پسند دل ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ حسرت نہ صرف اسلامی ذہن وفکر رکھتے تھے، بلکہ بہت سی باتوں میں خاصے قدامت پسند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جدید رجحانات کو چھوڑ کر ادبیات میں "کلاسکس" سے ان کا شغف نسبتاً زیادہ تھا اور باہمی تعلقات اور دوستی میں تو بالکل مشرقی تھے (علامہ مشرقی نہیں) وہی وضع داری، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی اخلاص اور حفظِ مراتب۔

ذہن کی یہ خاص کیفیت، یہ اسلامیت اور خیالات وافکار میں سلامت روی کا سبب غالباً یہ تھا کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ حسرت نے ذہنی تربیت کی منزلیں فارسی ادبیات کے آغوش میں طے کیں ـــــ اور بقول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے، فارسی ادبیات میں یہ عجیب تاثیر ہے کہ اگرچہ اس کا سارا تار و پود تغزل اور رندی و ہوسناکی کے مضامین سے تیار ہوا ہے، مگر اس سے ذہن میں استواری، اخلاق میں بلندی اور اسلامی عقائد و تصورات کے ساتھ ایک طرح کا لگاؤ ضرور اُبھر آتا ہے۔

حسرت سے آخری ملاقات بھی ایک ہوٹل ہی میں ہوئی۔ اب یہ پہلے سے تنومند، قوی ہیکل اور زندگی سے معمور حسرت نہیں تھے۔ بلکہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، ایک خیال، لطیف اور مجرد روح۔ میں انھیں اس عالم میں دیکھ کر کہتا کہ یہ حسرت نہیں، حسرت کا جوہر اور خلاصہ ہے۔ باتیں اسی طرح دھواں دھار، پُرجوش اور مخلصانہ۔

ہم میں کسی نے بینک اور انشورنس کا قصہ چھیڑ دیا۔ پھر کیا تھا فوراً ایک تقریر جھاڑ دی۔ کہنے لگے کہ ہمارے پاس کبھی اتنا روپیہ ہی نہیں ہوا کہ اس معصیت کا ارتکاب ہو سکے۔ انشورنس کے البتہ مواقع تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب، علما کے فتوے بھی لے آئے اور بااصرار کہا کہ اپنے بال بچوں پر رحم کرو اور زندگی کا بیمہ کرالو۔ لیکن میں نے کہا کہ میں بیمے کی پیش کش کو ایک گناہ سمجھ کر تو قبول کر سکتا ہوں، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو جائز سمجھوں۔ عمل کی کوتاہیاں قابلِ معافی ہیں، لیکن عقیدہ و فکر میں ٹیڑھ قطعی قابلِ بخشش نہیں۔ رہا بال بچوں کا سوال تو جو بات میں اپنے لیے جائز نہیں سمجھتا، اس کو اپنے بچوں کے لیے کیوں کر روا رکھ سکتا ہوں۔

حسرت کی لاابالیانہ زندگی کے ساتھ اس انداز کا تقشف بظاہر بے تکا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہر انسان اپنی بے شمار کوتاہیوں اور لغزشوں کے باوجود

دین کے بعض کاموں میں بڑا متشدّد ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ متشدّد رہنا چاہتا ہے ـــــ حسرت کی ذہنی مجبوریاں بھی کچھ اسی ساخت کی تھیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اگرچہ اسلامیات میں مہارت و رسوخ کا مرحوم نے کبھی دعویٰ نہیں کیا، پھر بھی اسلام کے صحیح مزاج سے لُغت ہائے حجازی کے بہت سے قارونوں کے علی الرغم اچھی طرح واقف تھے اور اس حقیقت کے رمز شناس تھے کہ اسلام وسیع تر انسانی اقدار و مفادات کے تحفظ کے لیے نازل ہوا ہے۔

بار ہا معاشرے کی موجودہ ناہمواریوں پر اُن سے تبادلِ افکار کا موقع ملا۔ ان کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ اسلام جاگیرداری کا حامی و ناصر نہیں ہوسکتا اور کسی ایسے نظام کا موید نہیں ہوسکتا جو معاشی ناہمواریوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رکھنا چاہتا ہے۔

ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع اور متنوع تھا۔ چنانچہ علمی و ادبی شخصیتوں کے علاوہ ایسے لوگوں سے بھی راہ و رسم رکھتے تھے جو بالکل اَن پڑھ ہیں۔ ان تعلقات کا دلچسپ پہلو یہ ہوتا کہ ان سے ہنسی مذاق کی باتیں انہی کی اصطلاحات میں ہوتیں۔ اس وقت یہ ٹھیٹھ پنجابی کی حیثیت سے گفتگو کرتے ـــــ تعجب ہوتا کہ حسرت کی شخصیت بھی کیسی حاملِ انداد ہے، یا تو یہ گومتی اور جمنا کی ڈھلی ہوئی بولی میں موتی بکھیر رہے تھے اور یا ایک جست میں چناب اور راوی کی افسانہ خیز سرزمین میں پہنچ گئے۔

حسرت کے کردار میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ بھائی وہ ان کا خاص فلسفۂ حیات تھا۔ دوسرے دانش وروں کی طرح ان پر بہت اچھے دن بھی آئے اور ایسے سخت اور کڑے دن بھی کہ ایک پائی پاس نہیں ـــــ لیکن کیا مجال کہ کسی وقت بھی ستمِ روزگار کا شکوہ زبان کو آلودہ کرے یا چہرے کی کوئی شکن دل کی الجھنوں کی غماز ہوسکے۔ وہی مشاغل جاری ہیں، چائے اور کافی کا دور چل رہا ہے، خوش گپیاں ہو رہی ہیں اور غموں کو بھلائے اور نظرانداز کیے ہوئے محوِ مکالمہ طرازی ہیں ـــــ "مکالمہ طرازی" دراصل حسرت کا مخصوص جوہر تھا جو قدرت نے انھیں خصوصیت سے عطا کر رکھا تھا۔ اس فن میں وہ ایسے طاق تھے کہ بہت کم لوگ اس سلسلے میں ان کے حریف ہوسکتے ہیں، اور یہ ان کا فن ہی نہ تھا بلکہ ذریعۂ تسکین بھی تھا۔ اس سے مرحوم خوب خوب کام لینا بھی جانتے تھے۔ یہ کیا کم ہے کہ

اس طرح کم از کم غمِ ایّام کی تلخیوں کو فراموش کر دینے میں کامیابی حاصل کر لیتے تھے۔

پاکستان میں اہلِ قلم و ذوق کا پہلے سے قحط ہے، حسرت کی موت نے اس کی خوف ناکیوں کو اور بڑھا دیا ہے ــــ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کا کوئی عقیدت مند اُن کی جملہ نگارشات کو ان کے مختصر سے سوانحِ حیات کے ساتھ جمع کر دے۔ اس سے اتنا تو ہو گا کہ گو حسرت گوشت پوست کی زندگی میں ہمارے رفیق نہیں رہے، تاہم ان کی ادبی رفاقتیں تا دیر زندہ رہیں گی۔

مولانا ظفر علی خاں مرحوم

مولانا ظفر علی خاں ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ ان پر مولانا ندوی کا تعزیتی مضمون ۷ دسمبر ۱۹۵۶ کے الاعتصام میں چھپا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں اگر عربی ادبیات پر قلم اٹھاتے تو حریری اور ہمدانی ہوتے۔ فارسی میں لکھتے تو ابوالفضل اور فیضی ان کی نگارشات پر سر دُھنتے اور انگریزی میں طبع آزمائی فرماتے تو اڈیسن اور میکالے سے کم رتبہ کیا پاتے لیکن انھوں نے اظہارِ خیال کا ذریعہ ایسی زبان کو ٹھہرایا جس میں داد سے زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم داغؔ دہلوی نے ان کی اردوئے معلّٰی کو سراہا۔ حالیؔ نے ان کی قوتِ تاثیر کو ان الفاظ میں تسلیم کیا:

ڈالا یہ تیری پکار نے غُل جی اٹھے وہ مُردے جو تھے بے جاں

اور سر سید تو ایک مرتبہ ان کے قطعے کو سُن کر جھوم جھوم گئے۔

اُردو پر ان کو جو قدرت حاصل تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یو۔پی والوں نے بھی ان کو ہمیشہ مستند مانا ہے۔

اقبالؔ ایشیا کا کتنا بڑا شاعر ہے۔ اس نے مسلمانوں کو کیا نہیں دیا۔ حکمت، فلسفہ، اور دین کا گہرا اور اونچا تصوّر اس کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ بلاشبہ اس نے خیالات و افکار کی پرانی سمتیں بدل ڈالی ہیں اور ایک ایسی بلند پایہ شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے، جس

میں علاوہ تخلیقی صلاحیتوں کے دعوت بھی ہے، زندگی کا متعین زاویہ نگاہ بھی ہے اور غضب کی پھبن بھی ہے۔ مگر ایک طبقے کو بایں جلالتِ قدر ان کی زبان نہیں بھائی۔ ان کو اس میں تذکیر و تانیث اور اضافت و محاورے کی غلطیاں نظر آئی ہیں۔

مولانا کا معاملہ دوسرا ہے۔ ان کی ہر بات سے اختلاف ممکن ہے، سوا زبان کے، کہ اس بارے میں قطعی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ صحیح لکھنا بھی ایک درجہ ہے، مگر مولانا کی ذاتِ گرامی ایسی تھی کہ ان کے ذوقِ ادب نے زبان کو سنوارا، اسے نئی نئی تعبیریں بخشیں، اچھوتے اور نادر پیرایہ ہائے بیان عطا کیے اور زندگی و جوش کی نعمتوں سے مالا مال کیا۔ جو لفظ ان کے منہ سے نکل گیا، سند ہے اور جو اصطلاح ان کے دار الضرب سے ڈھل کے آئی، مقبول ہے۔

اس بات کا فیصلہ کرنا سخت دشوار ہے کہ ان کی تقریر و تحریر میں کیا فرق ہے؟ دونوں میں یکساں زور ہے، آمد ہے اور فصاحت و بلاغت کا دریا ہے کہ متلاطم ہے۔ بولتے تو معلوم ہوتا کہ حسین و جمیل الفاظ کی ایک سلسبیل ہے کہ جاری ہے اور لکھتے تو گمان ہوتا کہ الفاظ و لغات کا ایک ذخیرہ ہے جو اُمڈا ہوا چلا آرہا ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے کرتے کہ اصل کتاب اس سے کم درجے کی معلوم ہوتی۔ چنانچہ ڈریپر کی زندگی اگر وفا کرتی اور وہ سن پاتے کہ "معرکہ مذہب و سائنس" ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے تو یہ انگریزی نسخہ تلف کرا دیتے اور اس کے اردو ایڈیشن پر فخر کرتے۔

افسوس ہے کہ میر عثمان علی کی کمزوری اور اڈوائنر کی دشمنی کی وجہ سے ان کو حیدر آباد میں زیادہ عرصہ رہ کر اردو زبان کی خدمت کا موقع نہیں ملا، ورنہ جس ٹھاٹھ سے انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اردو بڑی حد تک علمی و فنی مصطلحات سے بے نیاز ہو جاتی۔ ان کے بہار آفرین قلم نے جس طرح صحافت کو معمولی وقائع نگاری کی سطح سے اونچا اٹھایا اور اس میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ یہ تازہ بتازہ اور نو بہ نو سیاسی واردات کی کامیابی سے ترجمانی کر سکے، اسی طرح اگر یہ ترجمہ و تالیف کے مشغلے کو جاری رکھتے تو یقین جانیے کہ ادائے مطالب میں اردو آج کسی مغربی زبان سے پیچھے نہ ہوتی۔

ان کی ذات بجائے خود ایک ادارہ تھی اور علم و ادب کے ایسے مرکز سے تعبیر تھی کہ جس نے وجاہت حسین، وحید الدین سلیم اور نیاز فتح پوری ایسے باکمال انشا پردازوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ گویا سرسید کے بعد یہ دوسرے آدمی تھے جنھوں نے وقت کی اہم شخصیتوں کو اس درجے متاثر کیا۔

آج پاکستان میں خدا کے فضل سے بہتر سے بہتر اُردو روزنامے موجود ہیں، لیکن ان میں کوئی ایسا نہیں جس کی صحبت کو ایک شب و روز سے زیادہ تک کے لیے گوارا کیا جا سکے۔ لیکن وہ "زمیندار" جس کو خود مولانا نے برسوں مرتب کیا تھا اور اپنی تخلیقاتِ ادبی سے نوازا، آج بھی اس لائق ہے کہ قلب و ذوق کی دلچسپیوں کا سامان مہیا کر سکے۔ اُردو ادبیات میں جس طرح "الہلال" اور "البلاغ" کا مقام ہے، اسی طرح "زمیندار" کے پُرانے فائل ٹکسالی ادب کا بہترین مرقع ہیں۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ اٹھے اور پچاس سالہ زمیندار کے فائلوں کو اس نقطۂ نظر سے دیکھ جائے کہ اس میں کیا کیا گہر ہائے آب دار ایسے بکھرے پڑے ہیں جو چننے کے قابل ہیں ـــــ اگر کوئی جم کر یہ کام کر سکے تو نہ صرف یہ کہ اُردو ادب کی بیش بہا خدمت ہوگی بلکہ اس سے پاک و ہند کی نئی سیاسی تاریخ لکھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ یہی نہیں، اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہنا چاہیے کہ صرف اس طریق سے معلوم ہو سکے گا کہ انگریزی استعمار نے کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں اور کس کس طرح سچائی کو کچلنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح صرف "زمیندار" کی گزشتہ تاریخ کے مطالعہ ہی سے پتا چل سکتا ہے کہ حق کس کس طرح دب دب کر اُبھرتا ہے اور کیونکر ہر نئی افتاد کا مقابلہ کر کے پہلے سے بھی زیادہ نکھرتا ہے۔

بعض لوگ مرحوم کی نظموں سے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ہنگامی ہیں اور اس میں اس عنصر کی افسوس ناک حد تک کمی ہے جو نظم کو حیاتِ جاودانی بخشتا ہے۔ لیکن ایسے معترض حضرات اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ شعر صرف غیر فانی معانی ہی سے تعبیر نہیں، بلکہ اس میں اور بھی بہت سی باتیں دیکھی جاتی ہیں۔ اگر شکوہِ الفاظ، محاورے کی پابندی، قوافی و ردیف کا

اچھوتا پن، بندش کی چستی اور ایک خاص ڈھب کی موسیقی، کسی نظم میں جان ڈال دینے کے مترادف ہے، تو کم و بیش یہ خصوصیات مولانا کی تمام نظموں میں جلوہ گر ہیں۔ کیا حسن بجائے خود ایک ادبی قدر نہیں ؟ اور اگر یہ صحیح ہے تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ظفر علی کی ہر نظم حسن و جمال کے تقاضوں کی بہترین آئینہ دار ہے۔ ہم نے جامی کی یہ زور دار نظم بھی پڑھی ہے اور مزے لے لے کے پڑھی ہے :

روحی فداک اے صنمے! بطحی لقب
آشوب ترک شور عجم فتنۂ عرب

محسن کاکوروی کا بدائع و صنائع سے آراستہ نعتیہ کلام بھی پیشِ نظر ہے لیکن جو لطف حالی کے ان سادہ اشعار میں پایا :

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا

وہ سوائے مولانا ظفر علی خاں کی اس مشہور نعت کے اور کہیں نظر نہ آیا :

وُہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اِک روز جھلکنے والی تھی کل دنیا کے درباروں میں

مدح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مولانا کے جذبات و احساسات کا نہایت ہی نازک گوشہ تھا۔ جب توجہ اس طرف مبذول ہوتی تو پھر نہ پوچھیے کہ عقیدت و نیاز مندی کیوں کر سمٹ کر زندہ و جاوید نظم کی صورت اختیار کر لیتی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

اے کہ تیرا جمال ہے زینتِ محفلِ حیات
دونوں جہاں کی رونقیں ہیں تیرے حُسن کی زکات
بلدگہِ الست سے بخش دیے گئے تجھے
سب فلکی تصرفات سب فلکی تجلیات
چہرہ کشا کرم ترا قاف سے تا بہ قیروان
لطف ترا کرشمہ سنج کعبہ سے تا بہ سومنات

دیکھتے ہی ترا جلال کفر کی صف الٹ گئی
جھک گئی گردنِ ہبل ٹوٹ گیا طلسمِ لات
سر پہ اندھیری رات ہے، گھر گئی ہے بھنور میں ناؤ
موجِ بلا ہے تاک میں دُور ہے ساحلِ نجات
تھام کے پایۂ عرش کا کیجیے اب اس سے التجا
اے کہ ہے مبداءِ فیوض اک فقط تری ہی ذات
موردِ لطفِ خاص پر کس لیے آج یہ عتاب
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات

شعر و شاعری اور تقریر و تحریر کی برجستگی ان کی زندگی کا اصلی رُخ نہیں تھے۔ یہ تو اصل میں نتیجہ تھے ان کی بے چین طبیعت اور دلِ دردمند کا۔ یہ سب سے پہلے ایک سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ یہ بات بڑے تعجب کی ہے کہ اگرچہ مولانا کے والد مولانا سراج الدین احمد خاں، سرسید سے بہت متاثر تھے اور خود مولانا علی گڑھ کے فیض یافتہ تھے، تاہم کیا مجال کہ ان کے ٹھیٹھ عقاید پر اس کی پرچھائیں بھی پڑ سکی ہو۔

ملک میں دینیات کے بارے میں دو واضح رجحان رہے ہیں۔ ایک ان لوگوں کا جو قبر پرستی اور الحاد و زندقہ کے حامی ہیں اور دوسرے ان لوگوں کا جنھوں نے کتاب و سنت اور توحید و رسالت کے سوا اور کسی نقطۂ نظر کی تائید نہیں کی۔ مولانا نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے ہمیشہ آخری گروہ کا ساتھ دیا ـــــ اور اس سلسلے میں لومۃ لائم کی پروا نہیں کی، بلکہ بڑی بڑی دینی و سیاسی شخصیتوں سے بسا اوقات لڑ بھی گئے ـــــ چنانچہ سلطان ابن سعود نے جب حجاز کو اپنی اصلاحی کوششوں کا مرکز قرار دیا تو مشترکہ ہندوستان میں اس سے مخالفت و عناد کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ صرف مولانا کا دل گردہ تھا کہ انھوں نے سلطان کے موقف کی غیر مشروط طور پر حمایت کی۔

سیاسیات میں ان کی عمرِ عزیز کا بہت بڑا حصہ گزرا۔ انگریز کے استعمار کو انھوں نے ہر ہر مورچے پر شکست دی، بلکہ بعض اوقات تو نبرد آزمائی کے لیے نئے نئے مورچے پیدا

کیے۔ سیاسی جماعتوں اور ملک کی بڑی بڑی سیاسی تحریکوں کو انھوں نے ہمیشہ اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا اور اپنی مجوزہ کسوٹیوں سے پرکھا اور جانچا۔ نہ سب کی مخالفت کی اور نہ سب کی تائید و نصرت کا بیڑا ہی اٹھایا۔ ان کا مرکزی نقطۂ خیال اس خصوص میں یہ رہا کہ اگر کسی تحریک سے اُن کے جذبۂ اسلامیّت کی تائید کا پہلو نکلتا ہے تو اس کے بے غرض اور بے لوث مبلّغ و داعی بن گئے اور اگر اُن کے ٹھیٹھ اسلامی احساسات کو اس سے ادنیٰ سا گزند پہنچنے کا بھی احتمال نظر آیا تو اس کے خلاف بپھر گئے اور کسی قیمت پر اس تحریک کے چلانے والوں کو معاف نہیں کیا ــــ یہ ہے ان کی سیاسی زندگی کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ۔ اس کو سمجھ لینے سے یہ اعتراض خود بخود اُٹھ جائے گا کہ انھوں نے کیوں ملک کی بڑی بڑی تحریکوں کا آخر وقت تک ساتھ نہیں دیا۔

انگریزی استعمار سے ٹکر لینے کے معاملے میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم منفرد اور تنہا نہیں، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ملک کے کچھ اور جلیل القدر حضرات بھی ہیں، جن کی مجاہدانہ مساعی اور کوششوں کا نتیجہ پاکستان اور ہندوستان کی موجودہ آزادی ہے، اور یہ ناشکری ہوگی کہ اس مرحلے پر ان کو فراموش کر دیا جائے۔

لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ آزادی کی اس جنگ میں جو کم و بیش نصف صدی تک جاری رہی، کس نے کیا قیمت ادا کی اور کون مصائب و محن کی کن کن نوعیتوں سے دوچار ہوا ــــ ؟ تو اس اعتبار سے مولانا ظفر علی خاں اور ان کے اخبار "زمیندار" کا نام نامی سرفہرست رہے گا۔

آخر میں ہمیں مولانا اختر علی سے کہنا ہے کہ وہ تمام دوسرے کاموں کو ملتوی کر کے

"حیاتِ ظفر علی خاں"

کی تدوین کر ڈالیں ــــ یا چند اہلِ قلم کو اس کام پر لگا دیں جو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔

سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری

عظیم خطیب اور عظیم مجاہد

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا سانحہ ارتحال ۲۱ر اگست ۱۹۶۱ کو ملتان میں پیش آیا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ۸ر ستمبر ۱۹۶۱ کے الاعتصام میں ان پر جو تعزیتی مضمون تحریر کیا، وہ یہ ہے :

شاہ صاحب کے انتقال سے ملک ایک سحر طراز خطیب اور شیوا بیان مقرر سے محروم ہو گیا ہے۔ بہ حیثیت فن کے خطابت اور تقریروں کا چونکہ ایک خاص موسم ہوتا ہے جو اپنی تمام بہار آفرینیوں کے ساتھ گزر چکا، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ مستقبل بعید میں بھی کسی ایسے شعلہ مقال خطیب کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی تو اس میں قطعی مبالغہ و غلو کی آمیزش پائی نہیں جاتی۔

وہ عظیم شخص جس کی مؤثر اور دلآویز تقریروں سے آج سے پچیس تیس سال پہلے پورا ہندوستان گونج رہا تھا، آہ ! آج آسودۂ لحد ہے۔ اب وہ بلبلِ ہزار داستان جس کی چہک سے چمن زارِ وطن کا پتّا پتّا اور بُوٹا بُوٹا گویا تھا، آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ہے۔

جن لوگوں نے شاہ صاحب کی تقریروں اور خطبوں سے براہِ راست استفادہ نہیں کیا، ان کے سامنے ان کے خطیبانہ کمالات کا نقشہ کھینچنا مشکل ہے۔ ہاں ــ ! اگر دریا کی روانی کا کوئی تصور آپ کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔ پھولوں کی نزاکت اور مہک سے آپ آشنا ہیں۔ آگ کے شعلوں کو آپ نے دیکھا ہے اور کسی ایسے فن کار کو سنا ہے جو نغموں کے ساتھ ساتھ اثر و سحر اور کیف و وجد کی کیفیات کو بھی سامعین کے دلوں میں اُتار سکتا ہو، تو آپ کو شاہ صاحب کی جامعیّتِ تقریر کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکے گا ــــ مگر ٹھہریے ــــ ! ابھی نقشے کے تمام رُخ آپ کے سامنے نہیں آپائے۔

شاہ صاحب کی تقریروں میں شیر کی گرج، شاعر کے احساسات اور صوفی و عارف کے اخلاص و سرمستیوں کو بھی شامل کیجیے، جب کہیں جاکر ان کی خطیبانہ خصوصیات فہم و فکر کی گرفت میں آسکیں گی۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ شاہ صاحب کی موت پر قریب قریب ہر حلقے نے اظہارِ افسوس کیا ہے، اور ان کی خدمات کے پیشِ نظر ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر افسوس ہے اس سلسلے میں ان کے سیاسی افکار و معتقدات کی ایک غلط بحث خواہ مخواہ چھڑ گئی ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ نہیں کہ ان کا تعلق ماضی میں کس سیاسی جماعت سے رہا ہے اور اپنی معاصر سیاسی جماعتوں کے بارے میں انھوں نے کس موقف کو اپنے لیے پسند کیا ہے، اس کے برعکس دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ شروع سے زندگی کا جو نقشہ انھوں نے تجویز کیا، کیا سرِ مو اس سے منحرف ہوئے؟ اور جن خیالات و تصوّرات کو انھوں نے اپنایا، ان کی پوری پوری قیمت ادا کی یا نہیں؟ اس سے بھی زیادہ جو چیز ان کی شخصیّت کو نکھارنے والی ہے، وہ ان کی بے نظیر جرأت و بے باکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس جگر داری کے ساتھ انھوں نے انگریز سے ٹکر لی ہے، جس بہادری اور حوصلہ مندی کے ساتھ انھوں نے قید و بند کی سختیوں کو جھیلا ہے، اس کی کوئی مثال ان کے حریفوں میں تلاش کی جاسکتی ہے؟

شاہ صاحب کی عظمت کا راز ان کی عزیمت میں ہے، ان کے ایثار میں ہے، ان کی درویشی و فقر میں ہے، ان کے غنا اور بے نیازی میں ہے، ملک سے وفا شعاری میں ہے اور راہ و رسم دوستی کی استواریوں میں ہے۔

ان پر زبانِ اعتراض دراز کرنے والے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں، کیا اس متاعِ گراں مایہ کے کسی حصے کو بھی ان کے دامنِ کردار نے سمیٹا ہے؟ ان میں یہ جتنی خوبیاں مبدأ فیاض کی طرف سے جمع ہوگئی تھیں، ان میں کی ایک ایک خوبی ایسی ہے کہ جو کسی شخص کے کردار و سیرت کو چمکا دینے کے لیے کافی ہے۔

شاہ صاحب اپنی ان خداداد قابلیتوں کے بل پر اگر پیری مریدی کا کاروبار اختیار کرتے تو لاکھوں ہاتھ بیعت کے لیے آگے بڑھتے اور اگر اپنی اس محبوبیّت و شخصیت سے کوئی مالی

فائدہ اٹھانا چاہتے تو سیم و زر کی فراوانیاں ان کا خیر مقدم کرتیں۔ دنیا جانتی ہے کہ شاہ صاحب نے یہ دونوں کام نہیں کیے۔ کیا یہی ایک چیز ان کی عظمت کے لیے کافی نہیں؟

ایک اور پہلو سے ان کی زندگی کا جائزہ لیجیے۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ آزادی و حریت کی روشنی کسی ایک ہی دروازے سے داخل ہوتی ہے یا تخت و اورنگ کی بزم آرائیاں تنہا کسی ایک ہی شخص یا جماعت کی کوششوں کی رہینِ منت ہوتی ہیں۔ روشنی کئی دروازوں سے صحن تک آتی ہے اور تخت و اورنگ کی بزم آرائیوں کے پیچھے کئی تاریخی عوامل ہوتے ہیں، جو کارفرما ہوتے ہیں۔

اگر واقعاتِ عالم و تاریخ کا یہ تجزیہ صحیح ہے تو پھر حصولِ پاکستان کی کامرانیوں کا انتساب ان تمام تحریکوں اور شخصیتوں کی طرف ہوگا، جنھوں نے براہِ راست یا بالواسطہ انگریزی استعمار کو ختم کرنے کی کوششیں کی ہیں، یا ہندو کی اجارہ دارانہ ذہنیت پر کاری ضرب لگائی ہے۔

ترتیب اشیا کو اگر اس انداز سے دیکھیے تو حصول پاکستان کے ضمن میں سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کا حصہ کسی طرح بھی کم اہم نظر نہیں آئے گا، اس لیے کہ انھوں نے اس وقت انگریز کے قلعۂ اقتدار میں شگاف ڈالے، جب اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت کرنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت سلطان جابر کے سامنے آزادی و حریت کا کلمہ بلند کیا، جب اس کے صلے میں طوق و سلاسل کی گراں باریوں کو انگیز کرنا لازمی تھا۔

شاہ صاحب کی سیاسی خدمات کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ انھوں نے تحریکِ ہجرت کا آغاز کیا، خلافت میں جان ڈالی اور ہر اس سیاسی محاذ پر دادِ شجاعت دی، جس سے انگریز کے پندارِ استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔

توحید کی پرجوش اشاعت اور سنت کی ترویج میں جس والہانہ انداز سے انھوں نے حصہ لیا، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عشقِ رسول کی نزاکتوں اور توحید کے اسرار و رموز کو اس کامیابی سے بیان کرتے تھے، جو کہ صرف انھی کا حصہ تھا۔

اردو بولتے تو معلوم ہوتا تھا کہ غالب اور داغ نے شاعری کو چھوڑ کر خطابت

اختیار کرلی ہے اور پنجابی میں تقریر کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ چناب اور راوی نے اپنی روانیاں انھیں بخش دی ہیں۔

آہ! آج ہم ایسی جامع صفات شخصیّت سے محروم ہوگئے ہیں۔

اور آخر میں ایک لطیفہ ــــ "ابوذر" اور "ابوزر"

ایک مرتبہ دو عالمِ دین مصروفِ گفتگو تھے، ایک مولانا محی الدین لکھوی اور دوسرے ایک اور بزرگ۔ میں اور مولانا حنیف ندوی چند بے تکلّف دوستوں کے ساتھ ان سے کچھ دور بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مولانا محی الدین لکھوی ایک پرہیزگار اور صوفی عالم ہیں، مہمان نوازی اور مستحقین کی امداد و اعانت ان کا خاصہ ہے۔ پیسہ ان کی جیب میں ٹھہر نہیں سکتا، اِدھر آیا اور اُدھر گیا۔ دوسرے عالم جن سے وہ محوِ گفتگو تھے، اس سے برعکس طبیعت کے مالک ہیں اور روپے پیسے سے خاص ربط و شغف رکھتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ان کے پاس ایسا مقناطیس ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے پیسے کو دوسرے کی جیب سے کھینچ کر ان کی جیب میں ڈال دیتا ہے ــــ ہم میں سے کسی نے کہا۔ "مولانا محی الدین اس دور کے ابوذر ہیں"۔ مولانا ندوی نے فرمایا، "مولانا محی الدین ابوذر (ذال کے ساتھ) ہیں اور جن صاحب کے پاس یہ بیٹھے ہیں، وہ ابوزر (ز کے ساتھ) ہیں ــــ

دونوں کی طبیعت کے اعتبار سے یہ لطیفہ عین مبنی برحقیقت تھا۔

یہ ہیں مولانا محمد حنیف ندوی اور ان کی وہ خدمات جو انھوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے یا اس کے بعد ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے علاوہ مختلف اوقات میں دیگر اداروں میں سرانجام دیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی

کا اسلوبِ نگارش

(چند اشارات)

میرزا ادیب

میں سب سے پہلے ایک ذاتی واقعہ عرض کرنے کی اجازت مانگوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ صورت یہ ہوتی تھی کہ اُردو اور انگریزی میں سب سے زیادہ نمبر لیتا تھا لیکن حساب میں ہمیشہ وہ چیز میری جھولی میں آگرتی تھی جسے "انڈہ" کہا جاتا ہے۔ استادوں نے بہتیری کوشش کی کہ انڈے سے میری دلچسپی ختم ہو جائے مگر ان کی ساری کوششیں رائگاں ہی گئیں۔ چھٹی سے ساتویں میں چلا گیا۔ ساتویں کا سالانہ امتحان ہوا تو میں نے اپنی روایت کو برقرار رکھا۔ یہ بات ہیڈ ماسٹر صاحب تک پہنچی تو انھوں نے یہ اچھا نہ سمجھا کہ ایک لڑکا جو سب مضامین میں پوری طرح طاق ہو، حساب میں فیل ہو جائے۔ انھوں نے فرمایا: "میں اس کا حساب کا امتحان خود لوں گا۔" چنانچہ وہ اس غرض سے کلاس روم میں آگئے۔ فرمایا "میں زبانی سوال پوچھوں گا۔" پہلے انھوں نے اپنی طرف سے دو تین بڑے آسان سوال پوچھے۔ مگر میری حالت یہ تھی "تک تک دیدم، دم نہ کشیدم" مسکرا کر بولے "اب آخری سوال پوچھتا ہوں۔ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔" میں نے ذرا سوچ کر کہا "چار۔" "بس تم پاس ہو گئے ہو۔" انھوں نے نعرہ مارا اور میں یوں ساتویں سے آٹھویں جماعت میں چلا گیا۔ آج بھی وہی مرحلہ درپیش ہے۔ کہاں مولانا محمد حنیف ندوی جیسے متبحر عالم اور کہاں میں۔ ان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ قارئینِ کرام بھی وہی رویہ اختیار کریں جو میرے نرم دل ہیڈ ماسٹر صاحب نے اختیار کیا تھا اور مجھے موجودہ امتحان میں پاس کر دیں۔ جہاں تک مولانا محمد حنیف ندوی کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے میں یوں بھی ان سے نہاہا مرعوب ہوں۔ ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ چند سال پیشتر اکادمی ادبیات نے ادبا کو

اسلام آباد میں بلایا اور ان کے لیے ہوٹل میں کمرے مخصوص ہونے لگے تو مولانا نے ازرہِ خلوص و محبت مجھے اپنا "روم میٹ" بنانے کا اظہار کر دیا۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا مگر میری تو سٹی گم ہو گئی۔ مولانا سے دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی۔ عالمانہ شکوہ سے گفتگو کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ سوچا اگر انھوں نے حسبِ عادت اردو عربی لب و لہجے میں بولنی شروع کر دی تو میرے پلے کیا پڑے گا۔ اتفاق یہ ہوا کہ عین اس وقت اپنے یار مہربان رحیم گل آ گئے۔ چھڑی ٹیکتے ہوئے خراماں خراماں آئے اور آتے ہی پٹھانی لہجے میں بولے۔ میرزا! آپ میرے ساتھ کمرے میں رہیں گے۔ مَیں نے اطمینان کا سانس لیا اور مولانا سے رحیم گل پر ساری ذمے داری عاید کر کے معذرت طلب کر لی اور مولانا نے بڑی فراخ دلی سے مجھے معاف کر دیا۔

آج مجھے مولانا کے اسلوب پر کچھ کہنا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ کچھ کہنے کی کوشش کرنا ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ دوں۔ اس سلسلے میں دو باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

مولانا کئی حیثیتوں سے اپنی تخلیقات میں سامنے آئے ہیں۔ وہ ایک محقق ہیں، شارح ہیں، مفسّر ہیں، مترجم ہیں، نقاد ہیں اور مقدمہ نگار ہیں۔ اگر تعمقِ نظر سے ان کی فاضلانہ تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی اور حیثیتیں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وہ عالمِ دین ہیں، فلسفی ہیں، منطقی ہیں، مورخ ہیں۔ ان میں سے ہر حیثیت ایک خاص اسلوبِ نگارش کی مقتضی ہے۔ ہر حیثیت کے لیے ایک خاص ذہن کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خاص ذہن اپنے فکری نتائج کے اظہار کے لیے وہی اسلوب اپنائے گا جو ان فکری نتائج کو بہتر طور پر دوسروں کے حوالے کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہو۔ محقق کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، شارح اور مفسّر کا اپنا۔ مترجم کو مصنف کے ساتھ ساتھ قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ نقاد کے ہاں "قطعیت" ہوتی ہے، اس کا اندازِ بیان غیر جذباتی اور حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ اسی طرح فلسفیانہ اور منطقیانہ افکار کی ترسیل کے لیے ایک فلسفی اور منطقی جو اسلوب اختیار کرتا ہے وہ شارح اور مفسر کے اسلوب سے لگا نہیں کھاتا۔ تو کیا مولانا نے الگ الگ اسلوب کو اختیار کیا ہے؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے اور اوّلین توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں ایسا نہیں ہے اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ اسلوب کا مطلب ہے صاحبِ اسلوب کی حقیقی شخصیت۔ اور شخصیت کو مختلف حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ اگر شخصیت کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو حقیقی شخصیت اکائی کی صورت میں رونپذیر نہیں ہو سکے گی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہو گا کہ ہم اس کے اسلوب کو سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔ البتہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخصیت کا اسلوب تو ایک ہی ہوتا ہے جسے اس کا "مجموعی اسلوب" کہہ سکتے ہیں، تاہم اس کے کچھ اپنے جُدا جُدا پہلو، جُدا جُدا عکس، جدا جدا رنگ ہوتے ہیں۔ ایک درخت کی طرح جس کی شاخیں درخت سے اس طرح وابستہ ہوتی ہیں کہ ان میں سے ہر شاخ کو درخت کا جزو ہی کہے جائے گا اور ہر شاخ اصولاً درخت کی نمائندگی کرتی ہے۔

تو مولانا کا مجموعی اسلوب کیا ہے؟

جہاں تک مولانا کی تحریریں پڑھ کر مَیں اندازہ لگا سکا ہوں، کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کا مجموعی اسلوب منطقیانہ ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ ان کا یہ منطقیانہ اسلوب عام منطقیوں جیسا خشک، بے کیف، بے رنگ نہیں ہوتا بلکہ اس میں ادیبانہ رنگ کی جھلک نمایاں طور پہ محسوس کی جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب میں جہاں منطقیانہ سطح پر دلائل آفرینی ہے، وہاں ادبی سطح پر تخلیقی حُسن و جمال بھی ہے۔ اس قسم کے انداز میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اگر صاحبِ اسلوب شعوری طور پر ایک رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کرے تو دوسرا رنگ پھیکا پڑ جائے گا مگر مولانا کے ہاں منطقیانہ اور ادیبانہ سطح ہموار رہتی ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی جو وجہ میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا شعوری طور پر، ارادۃً یا باقاعدہ کوئی منصوبہ بنائے بغیر اظہارِ خیال نہیں کرتے۔ یہ دونوں جزو، منطق اور ادب ان کی شخصیت کے جزوِ لاینفک ہیں جو بغیر کوشش کے ان کی تحریروں میں دَر آتے ہیں۔

اس ضمن میں دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ مولانا کے تجزیاتی مطالعے کا طریقِ کار یہ ہے کہ وہ زیرِ گفتگو موضوع کو امکانی حد تک الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصے پر انحصار کے

ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اس سے دو فائدے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک فائدہ یہ کہ مصنف کو ہر پہلو پر بحث کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور دوسرا فائدہ اس کے پڑھنے والوں کے لیے ہے کہ وہ بسہولت تمام موضوع کے سارے پہلوؤں کو یکے بعد دیگرے اپنے ذہنوں میں سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مولانا کے اسلوب کی بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ ایک مرکزی عبارت کو ذیلی عنوانات پر پھیلا دیتے ہیں اور ہر عنوان پر کھل کر بات کرتے ہیں۔

جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس نوع کا تجزیاتی مطالعہ صرف مولانا کے لیے مختص نہیں ہے۔ تاہم اس انداز سے کسی فکری بحث کو اس کے متعلقہ اجزا کے ساتھ ذہنی گرفت میں لے کر ایک ایک جزو کا تجزیہ کرنا مولانا ہی کے اسلوبِ خاص کا مظہر ہے۔

تجزیے کے اس طریقِ عمل پر صرف وہی شخص حاوی ہو سکتا ہے جو موضوع کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتا ہو اور ہر پہلو پر ان تمام معلومات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر چکا ہو، جن کی اس سلسلے میں ضرورت ہو سکتی ہے۔

عام طور پر "جزو نگاری" سے عبارت کے تسلسل اور روانی میں فرق آجاتا ہے، مگر مولانا کے ہاں ایسی کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اجزا کو باہمی طور پر مربوط کرنے کا فن خوب جانتے ہیں، اس لیے ان کی تحریر میں انقطاعِ تسلسل نہیں ہوتا اور نہ روانی کہیں رکتی ہے۔

مولانا، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مختلف حیثیتوں کے ساتھ ہمارے سامنے آئے ہیں ان ساری حیثیتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ مگر ان کا اسلوب اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ ان کے ان مقدمات میں صورت پذیر ہوتا ہے، جو انھوں نے اپنی تصانیف کی ابتدا میں سپردِ قلم کیے ہیں۔

اردو میں کئی بڑے طویل، جامع اور مبسوط مقدمے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً مولانا حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری"، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا "محاسن کلام غالب"، اور مولوی عبدالحق کا وہ مقدمہ جو مولانا ظفر علی کے ترجمے "معرکۂ مذہب و سائنس" پر ہے۔ لاریب یہ مقدمے فن مقدمہ نگاری میں سنگِ میل تصور کیے جاتے ہیں، لیکن جب مولانا حنیف ندوی کے مقدمات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ سب سے زیادہ "مقدمے باز" ثابت ہوئے ہیں۔

ان کے "سلسلۂ غزالیات" ہی کو لیجیے۔ یہاں چار کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ سرگزشتِ غزالی، تعلیماتِ غزالی، افکارِ غزالی، تہافت الفلاسفہ۔ اب ان کے مقدمات کی تفصیل ملاحظہ کیجیے:

سرگزشتِ غزالی کا مقدمہ ۱۰۸ صفحات کو محیط ہے اور اصل کتاب ۱۰۹ سے شروع ہو کر ۱۸۸ پر ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اصل متن سے مقدمہ طویل ہے۔

تعلیماتِ غزالی کا مقدمہ ۱۰۴ صفحات پر پھیل گیا ہے۔

افکارِ غزالی پر مقدمہ ۱۱۳ صفحات لیے ہوئے ہے۔

تہافت الفلاسفہ میں جو مقدمہ شامل کیا گیا ہے وہ ۸۸ صفحات پر چھایا ہوا ہے۔

ایک اور کتاب کا حوالہ بھی دوں گا۔ یہ کتاب ہے "افکار ابنِ خلدون"۔ جس کا مقدمہ جو اصل میں مقدمہ۔ المقدمہ ہے ۷۷ صفحات پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

مولانا نے اپنے ہر مقدمے میں کتاب کے متن کی شرح و بسط کے ساتھ تفسیر بھی کی ہے اور جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے تنقید بھی کی ہے۔ میں اگر پورے اختصار کے ساتھ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں کہہ دوں تو عرض کروں گا کہ مولانا ہر مصنف کے پیچھے پیچھے آنکھیں بند کر کے نہیں چلے بلکہ ہر مصنف کے ہم قدم چلے ہیں اور آنکھیں کھول کر۔ جہاں انھوں نے دیکھا ہے کہ مصنف اپنی حقیقی راہ سے الگ ہو گیا ہے تو وہ خاموش نہیں رہے۔ اس کی طرف واضح اشارہ کر دیا ہے۔

مولانا کا منطقیانہ، ادیبانہ اور تجزیاتی اسلوب اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ ان مقدمات میں موجود ہے۔ وہ جو کہتے ہیں بال کی کھال اُتارنا، تو یہ چیز قدم قدم پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

مولانا کا انداز مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح خطیبانہ نہیں۔ خطیبانہ بلند آہنگی مولانا کے یہاں کہیں بھی نظر نہیں آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا بنیادی طور پر ایک منطقی ہیں۔ ایک منطقی اظہارِ افکار و خیالات کے لیے خطابت کی راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اُس کے پیشِ نظر دلائل کی منطقیت ہوتی ہے خطیبانہ آہنگ نہیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اپنی طرف ہی سے کہا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ان کے اسلوب کے سلسلے میں دو تین مثالیں دوں تاکہ مولانا کی اپنی گواہی بھی مل جائے۔

سرگزشتِ غزالی کے مقدمے میں فرماتے ہیں۔

"کیا غزالی فلسفی ہیں" ۔۔۔ ؟ اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غزالی اندازِ استدلال اور ذہن و فکر کی ساخت کے اعتبار سے تو قطعی فلسفی ہیں ہی ۔ زندگی اور اسلوبِ زیست کے نقطۂ نظر سے بھی فلسفی ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے ۔ کیونکہ ذہن و فکر کے اعتبار سے فلسفی ہونا اور بات ہے اور پوری زندگی کو حکمت کے سانچوں میں ڈھال لینا شئ دیگر ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ساری فلسفیانہ تگ و دو اور حکیمانہ موشگافیاں دینی قسم کی ہیں اور ان کا مقصد کائنات کے اسرار و رموز کے بارے میں مطلق سچائی کو پا لینا نہیں، بلکہ صدق و حقانیت کی ایسی منطق تک رسائی حاصل کرنا ہے جس سے اسلامی عقائد و افکار کی تائید ہو سکے ۔" (صفحہ ۵۵)

افکارِ غزالی میں تصوف کی وضاحت و صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

" ہمارے نزدیک وہی تصوف صحیح ہے جو ذوقِ عبادت کو نکھارتا اور کردار و سیرت کو چمکاتا ہے یا جس سے نظر و بصر میں حکیمانہ اور عارفانہ مذاق اُبھرتا ہے ۔ اگر تصوف کو ان حدود میں رکھا جائے اور اخلاص و طرزِ فکر تک اس کے فیوض سے فائدہ اٹھایا جائے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی جُز کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے بلکہ اس کے دائرے اجتماعیت کے دوائر سے ملتے ہیں، اور ان میں نہایت مفید تبدیلیوں کے موجب ثابت ہوتے ہیں ۔" (ص ۷۳)

صرف دو مثالیں اور دوں گا ۔ تحریکوں کے بارے میں تعلیمات غزالی کے صفحہ ۴ پر یوں رقم طراز ہوتے ہیں ۔

" دینی اور علمی تحریکیں اپنے سفر کا آغاز کسی متعین وقت سے نہیں کرتیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں فکر و عمل کے کچھ سادہ نقطے معاشرے کی سطح پر اُبھرتے ہیں اور پھر وقت کی رفتار اور مناسبتوں سے یہی نقطے متعین نقوش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن میں رنگ و روغن بھی ہوتا ہے اور شوخی اور جِلا بھی ۔"

افکار ابن خلدون میں یہ بتاتے ہوئے کہ ابن خلدون نے خود کو نمایاں کرنے لیے کوئی سطحی طریقہ اختیار نہیں کیا تھا، لکھتے ہیں :

" پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اتنے بڑے آدمی کو جس کی ذہنی صلاحیتیں غیر معمولی ہیں اور جو اپنے مقام و موقف اور شخصیت کی اثر آفرینیوں سے روشناس بھی ہے جیساکہ اس کی تحریروں

سے ظاہر ہے، ضرورت ہی کیا پڑی ہے کہ وضع وجعل کے گھٹیا اور ناتمام بہروپ سے اپنی عظمت میں اضافہ کرے، جب کہ اپنی بے پناہ قابلیتوں کے بل بوتے پر وہ اس لائق ہے کہ سفاکِ مشرق تیمور سے لے کر فتاکِ مغرب پیڈرو تک کو متاثر و مسحور کر سکے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کی تحریروں میں کہیں کہیں مشکل الفاظ بھی آجاتے ہیں مگر ان الفاظ کے استعمال سے عبارت اَدق اور عسیر الفہم نہیں ہوتی۔ اپنے تخلیقی کاموں میں ہر لمحہ عربی زبان سے ان کا جو تعلق قائم ہے اس سے ایسا ہونا ضروری ہے لیکن مولانا کی خوبی یہ ہے کہ وہ عبارت کی روانی میں کوئی فرق نہیں آنے دیتے۔ ان کا سنبھلا سنبھلا، نکھرا نکھرا، اُجلا اُجلا اسلوب انتہائی مؤثر ہے اور قاری کے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

میں نے دینی علوم کے تین بڑے مفکروں کی تحریریں پڑھی ہیں۔ ان میں سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، دوسرے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور تیسرے مولانا محمد حنیف ندوی۔ میں ان کے اسالیبِ بیان کا تجزیہ اس طرح کرتا ہوں:

مولانا ابوالکلام کے اسلوب کا تصوّر کرتا ہوں تو میری نگاہوں کے سامنے ایک ایسی شوریدہ سر ندی آجاتی ہے جو طوفانی رفتار سے بہتی ہوئی راستے کے بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتی ہوئی اور انھیں بہاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اسلوب کی مثال ایک ایسی صاف، شفاف، آئینہ رنگ ندی کی ہے جو پتھروں سے بچتی ہوئی، دھیرے دھیرے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

مولانا حنیف ندوی کے اسلوب کو بھی ندی ہی کے توسط سے پیش کروں گا مگر یہ ایک ایسی ندی ہے جو نہ تو طوفانی رفتار سے بہتی ہے، نہ اس میں داخلی اور خارجی نوعیت کا جوش و خروش ہے۔ یہ پتھروں سے ٹکراتی بھی نہیں، مگر ان سے الگ بھی نہیں ہوتی، بلکہ بڑی ملائمت سے انھیں اپنی گود میں لے کر چپ چاپ چلی جاتی ہے۔

دینِ حنیف

اور

مولانا محمد حنیف ندوی

تحسین فراقی

ندوہ کا تصور کیجیے تو یک بہ یک لوحِ ذہن پر ایک دو نہیں بیسیوں ندوی راہبِ متبتل کے چراغ کی طرح لَو دینے لگتے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کی جوئے شیر کے فرہاد سید سلیمان ندوی سے آغاز کیجیے اور عبد الباری ندوی، عبد السلام ندوی، عبد الرحمٰن نگرامی ندوی، رئیس احمد جعفری ندوی، نجیب اشرف ندوی، شاہ معین الدین ندوی اور مسعود عالم ندوی تک اور وہاں سے ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد حنیف ندوی تک پہنچ جایئے، کہیں بھی یہ سلسلۂ متین ٹوٹتا ہوا محسوس نہیں ہوتا بلکہ مرورِ محض کی طرح ایک تسلسل سے ہم کنار ہے۔ علمائے اسلام کا یہ وہ گروہ ہے جس نے دل کے عوض دانش اندوزی نہیں کی بلکہ دل اور دانش دونو کے اتصالِ جمیل سے ایک چیزے دیگر ترتیب دی ہے۔

آج سے تقریباً ایک صدی قبل جب خاکِ ہند لکھنؤ میں ندوۃ العلما کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کے درج ذیل مقاصد متعین کیے گئے:

۱۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح، علومِ دین کی ترقی، تہذیبِ اخلاق اور شائستگیٔ اطوار۔

۲۔ علما کے باہمی نزاع اور اختلافی مسائل کے رد و کد کا پورا انسداد۔

۳۔ عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کی تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات سے مکمل علیحدگی۔

۴۔ ایک عظیم الشان اسلامی دار العلوم کا قیام۔

۵۔ محکمۂ افتا کا قیام۔

ندوہ، ندویوں اور ندوی تحریروں کے کامل فہم کے لیے ان مقاصد کو پیشِ نظر رکھنا بے حد ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ خود ندوہ اور خصوصاً ندوی ان مقاصد کی کہاں تک پاس داری کر سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ ندوہ بالعموم اور ندوی بالخصوص

ان مقاصد میں سے ایک دو کے ساتھ منسلک نہ رہ سکے، مثلاً سیاسی اور ملکی معاملات سے مکمل علیحدگی نہ ممکن تھی نہ مستحسن۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدا میں ندوہ سیاسی معاملات سے الگ تھلگ رہا۔ یہ الگ بات کہ اس کے باوجود صوبہ جات متحدہ کا گورنر انٹونی میکڈونل ندوہ کا سخت مخالف ہوگیا، اور ادھر مولانا احمد رضا خاں نے ندوہ کے مقابلے میں "جدوہ" قائم کیا۔ ندوہ آج بھی قائم ہے، "جدوہ" کا نام صرف کتابوں میں محفوظ رہ گیا۔ دل کی دھڑکنوں اور دماغ کی کروٹوں میں بار نہ پا سکا۔ اور ہاں اس سلسلے میں دو اور دلچسپ باتیں سنتے چلیے۔ ایک تو یہ کہ ندوہ کا سنگِ بنیاد کسی دیسی نے نہیں بدیسی نے رکھا یعنی ممالکِ متحدہ کے گورنر سر جان ہیوٹ نے اور دوسرے یہ کہ بقول ایس ایم اکرام اس سے پانچ سال بعد یعنی ۱۹۱۳ میں ندوہ کے معتمد علامہ شبلی نے ندوہ کے ایک مدرس مولوی عبدالکریم کو جہاد پر ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں معطل کر دیا:

اے عقل چہ می گوئی، اے عشق چہ فرمائی؟

ندوی کلچر کی تفہیم کے لیے یہ بات بھی مدّنظر رہنی چاہیے کہ اس کی تخمیر میں علی گڑھ کی فکریات اور جدید مصری علم کلام دونوں کا حصہ ہے اور شیخ محمد اکرام کے خیال میں یہ دونوں زاویہ ہائے فکر شبلی کے توسط سے ندوہ پہنچے اور پھلے پھولے۔

دورِ حاضر میں جب خر بازاری اور خرد پرستی بہت بڑھ گئی ہے، نیک و بد کی تمیز اُٹھ گئی ہے، حسین اور قبیح کا امتیاز ختم ہوتا جا رہا ہے اور جب ہم میں سے اکثر علم کے نام پر سائے کو اسیر کرنے کی فکر میں ہیں تو حقیقی اور نافع علم کی کساد بازاری پر تعجب کیسا؟ عارفِ رومی فرماتے ہیں:

مرغ بر بالا پراں و سایہ اش — میدود بر خاک، پراں مرغ وش
ابلہے صیادِ آں سایہ شود — میدود چنداں کہ بے مایہ شود

یعنی نتیجہ یہ کہ:

شوقِ لیلائے سول سروس نے اس مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

افسوس کہ ہم دھوئیں کے شیدائی اور آگ کے وجود کے منکر ہیں۔

بہر حال ایسے میں مولانا محمد حنیف ندوی جیسے بزرگوں کے کام اور قد کو دیکھ کر زندگی پر اعتماد بحال ہوتا ہے اور سچے علم کی پیاس بڑھتی ہے۔ پیرِ رومی نے فرمایا تھا کہ عالم کو دیکھنا عبادت ہے کہ اس سے نیک بختی کے دروازے کھلتے ہیں۔ للہ الحمد کہ ہم نے ندوی صاحب کی متعدد بار زیارت کی ہے۔

مولانا حنیف ندوی صاحب کی تحریروں میں ایک نہیں کئی چراغ روشن ہیں۔ فلسفہ، علم کلام، فقہ، تفسیر، تعبیر، توجیہہ، تہذیب، لسانیاتِ قرآن اور حدیث کے سلسلے کے مباحث۔ آپ ان چراغوں کو الگ الگ تو پہچان سکتے ہیں لیکن ان سے صادر ہونے والی روشنی ایک دوسرے میں اس طرح نفوذ کر گئی ہے کہ اس کو الگ الگ کرنا کارِ محال ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلام کے ہشت پہلو قصر کے صحن و سقف تک رسائی حاصل کرنے کے لیے علومِ اسلامیہ کے صدر دروازے سے گزرنا کس قدر ضروری ہے۔ اسی ضرورت نے "اساسیاتِ اسلام"، "مطالعۂ حدیث"، "مطالعۂ قرآن"، "افکارِ غزالی"، "تعلیماتِ غزالی"، "سرگزشتِ غزالی"، "عقلیاتِ ابنِ تیمیہ"، اور "لسان القرآن" جیسی کتابوں کو جنم دیا ہے۔ مولانا ندوی نے اپنے موضوعات کے انتخاب اور احاطے میں توازن کو برقرار رکھا ہے اور اس باب میں خاصی وسعت بہم پہنچائی ہے اور یوں اپنے موضوعات سے انصاف کیا ہے۔ ورنہ ہمارے لکھنے والوں میں سے اکثر کا حال اس امریکی پروفیسر سے مختلف نہیں جس کا موضوعِ گفتگو تھا "SNAKES IN IRELAND" اور جو سٹیج پر چڑھا تو یہ کہہ کر اُتر آیا تھا:

"LADIES AND GENTLEMEN, THERE ARE NONE"

ع نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے سفرنامہ پاکستان میں مولانا حنیف ندوی کا ذکر کرتے ہوئے ایک عرصہ پہلے لکھا تھا:

"جعفری صاحب بھی اچھا خاصا وقت گزار کر واپس گئے اور صبح جب آئے تو ایک صاحب کو ساتھ لیے ہوئے۔ یہ صاحب کوئی تابع مہمل نہ تھے، مولانا محمد حنیف ندوی تھے، خاصے پرانے اہلِ قلم اور بزمِ ثقافت میں جعفری صاحب کے ہم بزم۔ ان سے کوئی ۱۴-۱۵ سال پہلے

اسی لاہور میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اس وقت بالکل جوان تھے، اب پہچانے نہیں جاتے تھے مسلک کے لحاظ سے اہلِ حدیث لیکن اعتقادی، کلامی، فقہی ہر غلو ندوی "کلچر" سے دبا ہوا۔ مہذب، شستہ اور شائستہ۔"

اور واقعہ یہ ہے کہ دریا بادی صاحب کا یہ بیان ندوی صاحب کی شخصیت کے فہم میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلک کے اعتبار سے اہلِ حدیث ہونے کے باوجود ان کی تحریروں میں اس خشونت اور سرکہ آرائی کو کہیں دخل نہیں جو عموماً اس گروہ میں اور اس کی تحریروں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں وہی شائستگی، رفتگی اور شستگی نظر آتی ہے جو اُن کی شخصیت کا خاصہ ہے۔

مولانا کی چودہ پندرہ کتابوں کا فرداً فرداً محاکمہ نہ تو اس نشست میں ممکن ہے اور نہ میں خود کو اس کا اہل پاتا ہوں۔ البتہ ان کے مطالعے سے جو مجموعی تاثر ذہن پر مرتسم ہوتا ہے، وہ ایک ایسے عالمِ دین کا ہے جو دین کا قابلِ لحاظ فہم بھی رکھتا ہے اور مختلف عصور و دہور کے فکری سرمائے کے علاوہ اپنے عہد کی روح اور اس کے مسائل سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔ جس کا نقطۂ نظر مختلف علوم اور سماجی، سیاسی اور تہذیبی نظام ناموں کے سلسلے میں واضح، غیر جانب دارانہ اور معروضی ہے۔ جو تنقیح و تہذیب اور جرح و تعدیل کے فن سے کماحقہٗ واقف ہے۔ جو تقلیدِ جامد کا مخالف ہے، اجتہاد کو دنیائے اسلام کی اہم ترین ضرورت خیال کرتا ہے اور اہم تربات یہ ہے کہ زبانِ عربی اور اس کی نزاکتوں اور دلالتوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ جو مغربی علوم و آثار سے نہ تو بدکتا ہے اور نہ انھیں کلیتہً قبول کرنے کا حامی ہے اور جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کی سحر کر

مولانا ندوی اس بات کے قائل ہیں کہ زمانہ ہر لحظہ متغیر ہو رہا ہے، اس کے احوال وظروف بدل رہے ہیں، اس کی کیفیتیں اور کمیتیں متبدل ہو رہی ہیں اور اس کے مظاہر و مناہج میں تبدیلی آرہی ہے، اس لیے اس تیز رَو زمانے کا ساتھ دینے کے لیے مُسلم فکریات میں اجتہاد کے

اصول کا کارفرما ہونا نہایت ضروری ہے، لیکن کم نظر اور جاہل شخص اجتہاد کا ہرگز اہل نہیں اور اس کے لیے جو کڑی شرائط اکابر نے مقرر کی ہیں، ندوی صاحب ان سے کاملاً متفق نظر آتے ہیں۔ چونکہ اجتہاد کی شرائط میں سے اوّلیت کامل قرآن فہمی کو حاصل ہے، اس لیے مولانا نے "مسئلہ اجتہاد" میں قرآن فہمی کے اصول بڑی خوبی سے منقح کیے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا نے ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مدت ہوئی ایک صاحب کے فہم قرآن کا بڑا چرچا تھا اور یہ مشہور تھا کہ فہم قرآن میں ان کا اپنا ایک قابلِ قدر مدرسۂ فکر ہے۔ یہ بزرگ خود تو اکثر باہر رہے۔ ان کے ایک شاگرد رشید کو البتہ یہ توفیق ہوئی کہ وہ اُن کے تفسیری نوٹوں کو شائع کریں۔ ہم نے جب پہلے پہل اِن محشّٰی قرآن کو دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ اس میں آیاتِ حیض سے بڑے بڑے سیاسی مسائل کا استنباط کیا گیا تھا۔"

مولانا نے تفسیر، تاویل، توجیہہ اور تعبیر کے اصولوں سے اپنی کتابوں میں بڑی فکر افروز بحثیں اٹھائی ہیں۔ وہ چیزوں کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ انھیں اس بات پر افسوس ہے کہ قرآن کی بعض ایسی مؤیدات ہیں جن پر غور نہیں ہوا۔ حدیث کے بدنام وضّاع عبدالکریم بن ابی العوجاء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جب فیصلہ ہوا کہ اس کی گردن مار دی جائے تو اس نے کھلے بندوں اقرار کیا کہ میں نے قریب قریب چار ہزار حدیثیں گھڑی اور مسلمانوں میں رائج کی ہیں، جن میں بہتری حلال چیزیں ہیں، جن کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اور بہتری حرام ہیں جن کو حلال قرار دیا گیا ہے۔"

اس بیان پر مزید دلچسپ اور فکر افروز اضافہ یوں کرتے ہیں: "ہماری رائے میں یہ ابن العوجاء کا آخری جھوٹ ہے جو وہ بول سکا ہے۔ اس سے اس کی غرض یہ تھی کہ وضعِ حدیث کا حیلہ تو کامیاب نہیں ہوا، اس طرح محدثین کے حلقوں میں ہلچل تو پیدا ہو جائے گی، ورنہ کون نہیں جانتا کہ ابن العوجاء سے بہت پہلے حلّت و حرمت کی واضح بنیادوں پر اسلامی معاشرہ قائم ہو چکا تھا اور چل رہا تھا۔"

اجتہاد بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح برسرِکار آتا ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے

کر لیجیے کہ حضرتِ عمرؓ نے قطعِ ید کی سزا اس لیے منسوخ کر دی کہ معاشرہ اور حکومت ایسے حالات و ظروف نہ پیدا کر پایا تھا جس میں کوئی شخص چوری سے باز رہتا، حالاں کہ اس باب میں سورۂ مائدہ میں نصِ صریح قطعِ ید سے متعلق موجود تھی! اسی طرح غلامی کا مسئلہ ہے، ندوی صاحب کی رائے میں غلامی کے انسٹی ٹیوشن کو اضطراراً اور بعض شرائط و ترمیمات کے ساتھ قبول کر لیا گیا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حالات کی تبدیلی کے بعد بھی اس ادارے کو محض اس لیے قائم رکھا جانا چاہیے تاکہ فقہ و حدیث میں اس سے متعلق جو بحثیں اور تفصیلات مرقوم ہیں ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر بالفرض مستقبل میں سوزاک و آتشک اور برص و جذام سے انسان مخلصی حاصل کر لیتا ہے تو بعض لوگوں کو اس پر اصرار ہو کہ ان بیماریوں کا وجود ضروری ہے تاکہ ان کے باب میں تحقیق و کاوش پر مبنی طبّی سرمایہ بے کار نہ چلا جائے۔

اجتہاد کے باب میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا زوال اور انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا نازک بھی ہے۔ مولانا نے بعض متاخرین کا تو اس باب میں دفاع کیا ہے کہ اس زمانے میں حالات میں بے راہ روی تھی، حکومتیں کمزور اور غیر اسلامی رجحانات کی حامل ہو رہی تھیں، عوام میں ہوسِ دنیا کا غلبہ تھا۔ عقلی فتنوں نے عقیدوں کی استواری میں کئی رخنے ڈال دیے تھے اور ہر جاہل و بدعقیدہ آدمی کو حق حاصل تھا کہ دین کے بارے میں جو چاہے کہے۔۔۔ اس نزاکتِ احوال کو دیکھ کر فقہا نے ملحدانہ اجتہاد کے مقابلے میں تقلید و تقیید کی قباحتوں کو ترجیح دی۔

سوال یہ ہے کہ کیا دنیائے اسلام میں سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حالات آج بھی ویسے نہیں ہیں؟ پھر اجتہاد کا دروازہ کھولنے پر اصرار کیوں کیا جا رہا ہے؟ میں نہیں کہتا کہ اس باب میں علامہ اقبالؒ کا نقطۂ نظر کس حد تک درست تھا، مگر انھوں نے تو عہدِ حاضر کے لیے بھی "تقلیدِ آبا" ہی کو اولیٰ تر قرار دیا تھا، اور یوں متاخرین فقہا سے اتفاق کیا تھا۔

عہدِ حاضر فتنہ ہا زیرِ سر است طبعِ ناپروائے او آفت گر است
جلوہ اش ما را زما بیگانہ کرد سازِ ما را از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتشِ دیرینہ برد نور و نارِ لا الٰہ از سینہ بُرد

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات — ملت از تقلید مے گیرد ثبات
راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است — معنیٔ تقلید، ضبطِ ملت است
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار — از شجر مگسل بامیدِ بہار
بحر گم کردی زیاں اندیش باش — حافظِ جوئے کم آبِ خویش باش

—— (رموزِ بے خودی)

مطلب یہ کہ ایسے دَورِ پُرفتن میں زمانۂ ماضی کی بحرِ بے کراں کی طرح پھیلی ہوئی عظمتوں کا حصول تو ممکن نہیں رہا، مگر تقلید کے ذریعے اپنی "جوئے کم مایہ" کو تو بہر حال بچایا جا سکتا ہے۔

مولانا ندوی صاحب کی تحریروں میں فکر و تدبر کا عنصر ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔ وہ سوال اٹھاتے چلے جاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہیں فلسفے کی نارسائیوں پر گفتگو ہو رہی ہے تو کہیں متکلمین اسلام کی بے نفع موشگافیاں زیرِ بحث آ رہی ہیں، کہیں اقانیم ثلاثہ کی بے معنویت اجاگر کی جا رہی ہے تو کہیں ثقافت کے خدوخال نمایاں کیے جا رہے ہیں۔ کہیں تاریخی جبریت کی نفی کی جا رہی ہے تو کہیں مستشرقین کی تلبیس و دجل کا پردہ چاک کیا جا رہا ہے۔ کہیں ابنِ خلدون کے تنقیدی، عمرانی اور علمی خیالات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور اس کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا جا رہا ہے اور کہیں یونانیات کے گھنیرے بادلوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کی حالت اور امام غزالی کے بصیرت افروز ارشادات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ یوں مولانا کی تحریروں میں حیرت انگیز تنوّع نظر آتا ہے جو عہدِ حاضر میں کم کم علما کو نصیب ہوا ہے۔

امام ابن تیمیہ پر بالعموم اور غزالی پر بالخصوص مولانا نے جس تفصیل سے لکھا ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔ مولانا نے ان موضوعات اور ان کی RELEVANCE کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ امام ابن تیمیہ ہوں یا غزالی، دونوں نے اپنے عہد کے داخلی و خارجی فتنوں میں اور قیامت خیز انتشار میں احیائے اسلام کے نقشے مرتب کیے۔ امام ابن تیمیہ نے تو بقول مولانا چومکھی لڑائی لڑی اور جہاں انھیں تاتاریوں اور نصیریوں کے مقابلے میں تلوار اٹھانا پڑی، وہیں فقہا کے جمود اور صوفیا کے الحاد اور شعبدہ طرازیوں اور متکلمین کے غلط تصوّرات کے خلاف قلم کو جنبش دینا پڑی۔ لیکن افسوس کہ انھیں عام طور پر رجعت پسند گردانا گیا، حالانکہ ندوی

صاحب کے خیال میں ان پر یہ الزام بے معنی ہے۔ ان کی رائے ہیں " جو شخص ارسطو کی منطق پر کڑی تنقید کرتا ہے اور بیکن اور لائبنز سے بھی پہلے اس کی افادیت کو مشکوک قرار دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک مثبت، آسان اور قابلِ فہم منطق کی طرح ڈالتا ہے تو یقیناً ایسا شخص تقدم پسند اور فکر و دانش کے قافلوں کو آگے بڑھانے والا ہے۔"

امام غزالی نے مسلم نشاۃِ ثانیہ میں جہاں دیگر کئی کارنامے انجام دیے، وہیں ان کا ایک بڑا معرکہ فقہ اور تصوف کی تطبیق و تزویج ہے، اور یوں دونو کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھیے کہ اسی غزالی نے اپنے عہد میں بقول شبلی "ایک جم غفیر کو برافروختہ کیا ... فقہا نے فتویٰ دے دیا کہ ان کی تصنیفات اور خصوصاً احیاء العلوم کا مطالعہ کرنا گناہ ہے۔ اسپین کے علما نے، جن کے سرگروہ قاضی عیاض تھے، ان کی تصنیفات بادشاہ کے سامنے پیش کیں اور رائے دی کہ سب جلا دینے کے قابل ہیں، چنانچہ کُل کی کُل جلادی گئیں ... مخالفت کا سلسلہ امام صاحب کی وفات کے بعد بھی مدت تک قائم رہا۔"

واضح رہے کہ ان کتابوں کو جلا دینے کا فتویٰ قاضی عیاض مالکی جیسے عالم نے دیا تھا جو کتاب الشفا کا ممتاز مصنف اور مسلم کا شارح تھا۔ آج علامہ غزالی کی تمام کی تمام کتابیں علما و مشائخ کی جائے پناہ ہیں۔ شبلی کے بعد غزالی کا احیا مولانا محمد حنیف ندوی کے حصے میں آیا ہے اور وہ لائق مبارک باد ہیں۔

مولانا کا تازہ ترین کارنامہ "لسان القرآن" کی تدوین و تصنیف ہے۔ مولانا سے پہلے اردو، انگریزی اور عربی میں متعدد حضرات نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ اردو میں محمد عبدالرشید نعمانی اور غلام احمد پرویز کی لغات القرآن کا نام لیا جاسکتا ہے، عربی میں امام راغب کی مفردات کا اور انگریزی میں جان پینرس J. PENRICE کی "DICTIONARY & GLOSSARY OF THE QURAN" کا، جو انیسویں صدی کے اواخر میں شائع ہوئی۔ اردو میں اس باب میں عبدالرشید نعمانی کا کام اب تک اہم ترین کارنامہ تھا کیونکہ انھوں نے اپنی کتاب میں صرف لغاتِ قرآنی کے معنی ہی نہیں دیے تھے بلکہ جا بجا تاریخی، کلامی اور دیگر متعدد تفسیری و فقہی مباحث بھی درج کیے ہیں اور اکابر کے اقوال

نقل بھی کیے ہیں اور ان پر محاکمہ و تجزیہ کا اہتمام بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے جامعیت کے لحاظ سے اسے مفرداتِ راغب پر ترجیح دی تھی۔ آج مولانا دریا بادی زندہ ہوتے تو مولانا ندوی کے اس کارنامے کو راغب اور نعمانی دونوں سے بہتر بتاتے۔

مولانا ندوی کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے کام کو سات آٹھ صفحوں میں تو نپٹایا نہیں جاسکتا۔ انھوں نے اپنے لیے جتنے سنگلاخ موضوعات کا انتخاب کیا، ان کی اجمالی تفصیل بھی ناممکن ہے۔ فلسفہ، لسانیات، علم کلام اور اجتہادی و فقہی موضوعات پر مولانا نے جس سہولت سے لکھا ہے وہ قابلِ داد ہے اور یہ سب کچھ ایک نکھرے ستھرے اسلوب میں پیش کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا ندوی کی کتابیں فکر کو غذا مہیا کرتی ہیں اور اسلام کی بہتر تفہیم میں معاون ہوتی ہیں اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ مولانا لائقِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنی عمر طویل اعتزال اور گوشہ نشینی میں گزار دی اور یوں متنوع علمی کارنامے انجام دے سکے۔ مور لوگوں کی نظر میں آنے لگے تو اس کے پَر اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ مولانا اپنی روشنیٔ طبع کے باوجود دشمنوں کے شر سے محفوظ رہے اور دوستوں کی تحسینِ بے جا سے بے نیاز!

مولانا محمد حنیف ندوی

بحیثیت ریڈیو مقرر

عبدالحی قریشی

۱۹۶۳ میں مجھے ریڈیو پاکستان لاہور کے شعبۂ تقاریر کا انچارج پروڈیوسر بنایا گیا۔ اُن دنوں دینی تقاریر کا کوئی الگ شعبہ تو ہوتا نہیں تھا، بس ہفتے میں دو تقریریں اردو تقاریر کے جدول کا حصہ ہوتی تھیں۔ میرا شعبۂ تقاریر میں دوسرا ہی دن تھا، پروگرام میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ ایک بزرگ نہایت عمدہ سلی ہوئی علی گڑھ کٹ کی شیروانی، سفید پاجامہ اور چمک دار براؤن جوتا پہنے، سر پر جناح کیپ رکھے میری میز کے سامنے والی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ چہرے پر پاکیزگی کے آثار نمایاں تھے، مَیں ان سے نہایت متاثر ہوا۔ مَیں نے سلام عرض کیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس بزرگ سے عرض کیا "مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"؟ انھوں نے باریک خط میں لکھا ہوا دو صفحات پر مشتمل مسودہ اور اس کے ساتھ نتھی کیا ہوا کنٹریکٹ کا جوابی حصہ میری طرف بڑھا دیا۔ مسودے کے ایک کونے پر لکھا ہوا نام پڑھ کر مَیں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ادب سے سلام عرض کیا۔ یہ تھی میری حضرت مولانا محمد حنیف ندوی سے پہلی ملاقات ـــ ان کا نام مَیں نے سُن رکھا تھا اور تحریریں بھی پڑھی تھیں۔ اسلامی فلسفے کے موضوع پر اُن کی تحریروں سے مَیں بہت مرعوب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مَیں نے مولانا کا نام پڑھا تو ان کی عظمت و احترام نے مجھے کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس زمانے میں تقریریں ریکارڈ کرنے کا رواج نہ تھا اور نہ ریڈیو پاکستان کے پاس ٹیپیں اور ٹیپ ریکارڈ تھے، سارے ریڈیو اسٹیشن پر ایک ایمپکس ٹیپ ریکارڈ ہوتا تھا جو صدر، وزیرِ اعظم اور دیگر مقتدر حضرات کی تقریریں ریکارڈ کرنے اور نشر کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ کنٹریکٹ پر نظر پڑی تو ابھی اس تقریر کے نشر ہونے میں دس دن باقی تھے۔ مَیں نے عرض کیا، "حضور ابھی تو اس تقریر کے نشر ہونے میں دس روز باقی ہیں، آپ یہ مسودہ اور کنٹریکٹ کسی دوسرے

آدمی کے ہاتھ بھجوا دیتے، آپ نے خود زحمت کیوں کی۔" بڑی شفقت سے فرمانے لگے "کنٹریکٹ پر لکھا ہے کہ مسودہ تاریخ نشر سے دس روز پہلے بھجوا دیا جائے۔ خود لے کر اس لیے آگیا ہوں کہ آپ اُسے ایک نظر دیکھ لیں اور اگر اس میں کوئی تبدیلی کرنا مقصود ہو تو آپ کی مرضی کے مطابق کر دوں۔" میں تو مولانا کے سامنے ایک ادنیٰ درجے کا طالب علم تھا، میں ان کے مسودے میں کیا تبدیلی کر سکتا تھا۔ عرض کیا "آپ کا مسودہ یقیناً ٹھیک ہوگا، میں اُسے کیا دیکھوں؟" فرمانے لگے "ہم تو اپنے علم کے مطابق اس کو لکھ لائے ہیں، حکومت کی پالیسی کیا ہے، یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ آپ اس مسودے کو پالیسی کے نقطۂ نظر سے دیکھ لیں۔" میں نے مسودہ پڑھا، نہایت رواں اور سلیس اردو میں، موضوع سے متعلق اتنا خوب صورت اور مدلّل مسودہ میں نے کم ہی لوگوں کا دیکھا ہے۔

مولانا کو اپنے سامعین کا پورا خیال رہتا ہے۔ ان کی کتابیں بھی پڑھی ہیں، زبان و بیان نہایت عالمانہ۔ کتاب پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہوتی ہے لیکن ریڈیو کے سامعین میں تو ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، تعلیم یافتہ بھی اور ان پڑھ بھی، لیکن معلومات حاصل کرنا اور مختلف امور سے آگاہ ہونا ان پڑھوں کا بھی حق ہے، وہ بھی ریڈیو سے جو بات نشر ہو رہی ہو اس کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مولانا کو ان کا بھی خیال رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، آسان الفاظ، عمدہ استدلال اور زبان اس درجے آہستہ خرام کہ ایک کے بعد دوسری بات سامعین کے ذہن نشین ہوتی جاتی ہے، اور یہی کسی ریڈیو مقرر کا کمال سمجھا جاتا ہے کہ جب گفتگو ختم ہو تو ہر سننے والا نشر کی گئی بات اپنی ذہنی استعداد کے مطابق سمجھ چکا ہو۔ میرے خیال میں مشکل نویسی سہل ہے اور آسان و سلیس نویسی نہایت مشکل۔ مولانا محمد حنیف ندوی، اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔

اپنے دور کے علما میں مولانا اُن چند گنی چنی ہستیوں میں سے ہیں جن کی ہر بات سند کا درجہ رکھتی ہے۔ بعض لوگوں کو اس احساس نے کسی حد تک مغرور اور خود پسند بھی بنا دیا اور ان کے ذہن میں ہر وقت پروٹوکول رہتا ہے، مگر مولانا کو تو یہ بات چھو کر بھی نہیں گئی۔ وہ منکسر المزاج، خلیق، چھوٹے بڑے ہر ایک سے شفقت و محبت سے گفتگو کرتے ہیں۔

ریڈیو پاکستان کے پروگرام کا عملہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں سے منتخب کیا جاتا ہے اور ان میں بعض لوگ اپنے اپنے دائرۂ کار میں سند کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ پڑھے لکھے حضرات سے بے تکلفی سے بات کرتے ہیں۔ لیکن مولانا محمد حنیف ندوی جب بھی ریڈیو سٹیشن تشریف لائے ہر ایک نے ان کا احترام کیا اور ان کے مقام کا خیال رکھا۔ بعض اوقات یہ احترام سنجیدگی بھی اختیار کر جاتا تو مولانا اس بات کو بھانپ کر ماحول کو خوش گوار بنانے کے لیے نہایت شستہ اور شائستہ لطائف بھی سناتے، جس میں مزاح کے ساتھ اعلیٰ پائے کی علمی باتیں بھی سامعین کو میسر آتیں۔

مولانا مسلک کے اعتبار سے غیر مقلد ہیں اور یہ عام خیال اور تجربہ ہے کہ غیر مقلد حضرات بہت سختی سے اپنے مسلک کی پابندی اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر مولانا محمد حنیف ندوی اور مرحوم مولانا سید ابوبکر غزنوی یہ دو ایسے غیر مقلد میں نے دیکھے ہیں جو اپنے مسلک سے ہٹے بغیر دوسروں کی دل جوئی کا خیال رکھتے۔

ریڈیو پر ہر قسم کے دینی موضوعات پر مولانا حنیف ندوی نے تقریریں کی ہیں، مگر کبھی ایک فقرہ بھی ایسا نشر نہیں ہوا جو قابلِ گرفت ہو یا کسی دوسرے مسلک پر تنقید کا پہلو لیے ہوئے ہو۔

لاہور ریڈیو سٹیشن سے میں نے ایک نہایت جرأت مندانہ پروگرام "حی علی الفلاح" کا آغاز کیا۔ اس پروگرام میں زندگی سے متعلق نازک ترین موضوعات زیرِ بحث آتے، مقالہ نشر کرنے کے بعد مقالہ نگار کو وضاحتی سوالات کے جواب بھی دینا پڑتے۔ یہ مرحلہ مقالہ لکھنے سے زیادہ کٹھن ہوتا ہے کہ اچانک کوئی کتنا ٹیڑھا تنقیدی سوال کر دے۔ بڑے بڑے جید علما نے اکثر مجھے کہا کہ قریشی صاحب مقالہ لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا آپ کے وضاحتی سوالات کے جواب دینا مشکل ہوتا ہے۔ مگر مولانا موصوف نے نہ کبھی اس مشکل کا اظہار کیا اور نہ کبھی کسی پیچیدہ سوال سے گھبرائے، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ مولانا کو اس سوال کا پہلے سے علم تھا اور وہ اس سے متعلق ہوم ورک کر کے اور پوری طرح تیار ہو کر تشریف لائے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے صفر کے مہینے کے آخری آٹھ دنوں میں ایک گھنٹہ روزانہ کا پروگرام

"ہفتۂ حدیث" کے عنوان سے ترتیب دیا۔ اس میں ایک مقالہ حجیتِ حدیث کے موضوع پر مولانا محمد حنیف ندوی کے نام بھی رکھا۔ میں اس پروگرام کی اطلاع دینے خود بھونڈپورہ مزنگ میں مولانا کے گھر پر حاضر ہوا۔ مولانا موضوع سن کر خوش ہوئے اور فرمانے لگے، آپ نے ریڈیو پر بڑی جرأت مندی کے ساتھ یہ موضوعات شیڈول کر دیے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں ایک بہت مؤثر سول سروس کا طبقہ حدیث کے حجت فی الدین ہونے سے انکاری ہے۔ اور ایک اور طبقہ بھی اس کے بیشتر حصے کی صحت سے انکاری ہے۔ میں نے عرض کیا مولانا میں نے علمی سطح پر حدیث کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ہی یہ ہفتہ شیڈول کیا ہے اور آپ جیسے علما کا مجھے تعاون حاصل رہا تو مجھے یقین ہے کہ اس کی ہر جگہ پذیرائی ہوگی۔ مولانا نے نہایت مدلّل مقالہ لکھا اور اس سے متعلق وضاحتی سوالات کے جواب دیے۔ یہ سارے پروگرام مختلف سٹیشنوں سے کئی بار نشر ہو چکے ہیں اور بہت سے ایسے لوگ جو علمِ حدیث کے بارے میں شبہے میں مبتلا تھے، وہ راہِ راست پر آ گئے۔ یہ تمام پروگرام ریڈیو پاکستان کے سنٹرل پروڈکشن یونٹ میں محفوظ ہیں اور ایک علمی سرمائے کا درجہ رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں مولانا کی آواز میں شاید اس سے زیادہ طویل دورانیے کا کوئی پروگرام ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں محفوظ نہیں ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی

واقعات ولطائف کے آئینے میں

محمد اسحاق بھٹی

۳۰۔ جولائی ۱۹۸۴ کو ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے مولانا محمد حنیف ندوی کے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا گیا تو ہمارے ڈائریکٹر جناب سراج منیر صاحب نے مجھے فرمایا کہ مَیں مولانا کے واقعات و لطائف قلم بند کروں۔ چوں کہ عرصۂ دراز سے میرا مولانا سے تعلق ہے اس لیے خود مَیں بھی یہی چاہتا تھا اور یہ میرا دل پسند موضوع بھی ہے۔ پھر کسی دوسرے کے لیے اس فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہونا مشکل بھی ہے، لہٰذا

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

مَیں نے اس فریضے کو انجام دینے کے لیے اپنے ماضی قریب اور ماضی بعید کو آواز دی تو چھوٹے بڑے بے شمار واقعات قطار باندھ کر میرے سامنے آ کھڑے ہوئے اور مَیں نے فوراً اُن کو قلم اور کاغذ کی گرفت میں لے لیا۔ اُن واقعات میں لطائف کا عنصر زیادہ ہے اور ہر واقعہ کسی نہ کسی جہت سے لطیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔

لطائف کے لفظ سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ صوفیا کی طرف منسوب ہوں تو لطائفِ تصوف کہلائیں گے، علما سے متعلق ہوں تو لطائفِ علمیہ کے نام سے موسوم ہوں گے، ہمارے اکابر و اسلاف کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے ہوں تو انھیں اقوال و ملفوظات سے تعبیر کیا جائے گا اور اگر روزمرہ کی مجلسی زندگی میں بیان کیے جائیں تو ان پر ایسے لطائف و ظرائف کا اطلاق ہوگا جن میں ہلکا پھلکا مزاح بھی پایا جاتا ہو اور بے تکلفانہ پیرایۂ بیان میں اظہارِ واقعہ بھی ہو۔

لطیفے سے پتا چلتا ہے کہ کوئی شخص کتنا زندہ دل، کتنا خوش طبع اور کس قدر خوش مزاج ہے۔ تنگ دل یا تنگ حوصلہ نہیں ہے۔ خود بھی بات کہنے کا ڈھنگ

جانتا ہے اور دوسروں کی بات برداشت کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ میں اپنے قارئین کو اس نتیجے پر پہنچانے کی کوشش کروں گا کہ مولانا محمد حنیف ندوی میں وہ تمام اوصاف پوری طرح پائے جاتے ہیں جن کا ایک مجلسی اور سوشل آدمی میں پایا جانا ضروری ہے۔

مولانا سے میری آشنائی پینتالیس برس کے طویل لیل و نہار میں پھیلی ہوئی ہے۔

۱۹۳۹ سے (جب کہ میری عمر چودہ برس کی تھی) ۱۹۴۷ تک سال دو سال کے وقفے کے بعد مجھے ان کو دیکھنے، ان کی تقریریں سننے اور ان سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔

۱۹۴۹ سے وسط ۱۹۵۲ تک ان کے ساتھ بلکہ ان کے ماتحت کام کرنے اور کام سیکھنے کا شرف حاصل رہا۔ اس زمانے میں ہم زیادہ تر اکٹھا ہی رہتے تھے۔

۱۹۵۲ سے اکتوبر ۱۹۶۵ تک روزانہ شام کے بعد ہمارا ہوٹل بازی کا دور تھا۔

۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ سے (جب کہ میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہوا)

۲۔ اکتوبر ۱۹۸۴ تک (جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں) ہوٹل بازی متروک ہے اور روزانہ دفتر میں ملاقات بھی ہو جاتی ہے، لطیفے بازی کا "جھس" بھی پورا کر لیا جاتا ہے اور اِدھر اُدھر کی ضروری باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ مولانا سے بے پناہ تعلقِ خاطر اور بے حد عقیدت و محبت کے باوجود مجھے ان کی سب باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ اسی طرح مجھ پر انتہائی شفقت اور ہر اعتبار سے خیر خواہی کے باوصف وہ میرے سب خیالات سے متفق نہیں ہیں۔ بعض مسائل و معاملات میں نہ میں ان سے ہم آہنگ ہوں اور نہ وہ میرے ہم رائے ہیں، اور یہ ممکن بھی نہیں۔ یہ فطری امر ہے کہ کوئی دو آدمی فکر و عمل کے تمام گوشوں میں کبھی متحد اور متفق نہیں ہو سکتے۔ اس جہانِ رنگ و بو کی گہما گہمی اختلاف ہی کی رہینِ منت ہے:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن کسی اختلافِ رائے کو ہم نے کبھی یہ موقع نہیں دیا کہ وہ ہمارے باہمی تعلقات

پر ذرا بھی اثر انداز ہونے کی جرأت کرے۔ ہم نے اختلافِ رائے کی باگیں ہمیشہ کس کر رکھیں ہیں، کسی لمحے بھی انھیں ڈھیلا نہیں چھوڑا اور اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ ہمارے دلوں میں نقب لگا سکے۔

ایسا بھی ہوا کہ بعض اوقات مولانا نے کسی معاملے میں مجھے سخت ڈانٹ پلائی، حالاں کہ میں اس میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا تھا اور اس کے لیے دلائل بھی دے سکتا تھا، مگر میں نے سکوت کی چادر اوڑھ لی اور گردن نیچی کر کے ان کی ڈانٹ سہتا رہا۔
پھر ایسا بھی ہوا کہ مولانا سے تعلقِ عقیدت کی بنا پر کچھ لوگوں نے مجھے نشانۂ عتاب بنایا، جس کا مجھے خمیازہ بھی بھگتنا پڑا، اور اس کا مولانا کو علم تھا، لیکن میں نے کوئی پروا نہیں کی۔

ان سطور میں جو آپ آگے پڑھیں گے نہ میں نے مولانا کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، نہ ان کے علم و فضل کے حدود کی وضاحت کی ہے، نہ ان کے افکار و تصورات کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے، نہ ان کے فلسفہ و حکمت کی بات کی ہے، نہ ان کی زبان و انداز اور اسلوبِ تحریر سے متعلق گفتگو کی ہے اور نہ ان کے تدیّن و تقویٰ اور زہد و عبادت کی داستانیں بیان کی ہیں۔ میں نے ان کو ایک شگفتہ مزاج انسان کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اسی حیثیت سے وہ واقعات و لطائف حوالۂ قرطاس کیے ہیں جو میرے سامنے ظہور میں آئے۔

مولانا چھہتر سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، اس لحاظ سے بلاشبہ وہ ایک بزرگ عالمِ دین ہیں۔ وہ اصطلاحی معنوں میں "پیر" نہ سہی لغوی معنوں میں بہرحال "پیر" ہیں۔
ہمارے ہاں یہ رواج پیدا ہو گیا ہے کہ جو عالمِ دین عمرِ پیری کو پہنچ جاتا ہے، ہم اس کے صرف وہ واقعات قلم و زبان پر لاتے ہیں، جن کا تعلق ورع و عبادت، تقویٰ و تدیّن اور زہد و للہیت سے ہو، اور پھر اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک اُسے معصومین کی صف میں کھڑا نہیں کر دیتے۔ اس حقیقت کو قطعاً پیشِ نگاہ نہیں رکھتے کہ وہ ایک انسان ہے، اس کے بیوی بچے بھی ہیں، دوست احباب بھی ہیں اور لوگوں

سے اس کے روابط و مراسم بھی ہیں۔ وہ ہر ایک سے ملتا اور موقع و محل کے مطابق سب سے الگ الگ برتاؤ کرتا ہوگا۔ ہنستا بھی ہوگا، کسی سے بے تکلّف بھی ہوتا ہوگا اور لطائف و ظرائف بھی سنتا اور سناتا ہوگا۔ اس کے صفحاتِ زندگی سے ہم یہ سب باتیں حذف کر دیتے ہیں اور اس پر کشوف و کرامات کے غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی حیاتِ مستعار کے بے شمار انسانی پہلو پردۂ خفا میں چلے جاتے ہیں۔

کسی عالمِ دین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور نیک ہے، زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ایک عالمِ دین یہ کام کرتا ہی ہے۔ اس کے اظہار کی آخر کیا ضرورت ہے۔ کسی کو شبہ ہے کہ وہ یہ فرائض بجا نہیں لاتا اور اس شبہے کا ازالہ ضروری ہے؟۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا کے قدم بہ قدم میری "میں" بھی چلی ہے اور اس کا مجھے احساس ہے۔ لیکن اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ جب عام زندگی میں مولانا میرے بغیر نہیں چلتے تو یہاں مجھے چھوڑ کر اکیلے کیوں کر آگے بڑھ سکیں گے۔ اگر میں اپنی "میں" کو مولانا کے ساتھ نہ چلاؤں یا وہ اسے اپنے ساتھ لے چلنے پر آمادہ نہ ہوں تو میرا قلم ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ان کی زندگی کے اس پہلو کی وضاحت ہو سکتی ہے جو کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ میری "میں" کو نہ صرف برداشت کر لیا جائے بلکہ اس کا خیر مقدم کیا جائے۔ میری "میں" اور مولانا کے واقعات و لطائف کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہی ان کی زندگی کے اِس گوشے کی نقاب کشائی کا اصل اور واحد ذریعہ ہے۔ اس کو درمیان سے نکال کر "حقائق" کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔

یہاں یہ واضح کر دوں کہ "میں" سے عربی کی "انا" یا انگریزی کی "ایگو" مراد نہیں، جس کا مطلب اپنے متعلق آکڑ پھاکڑ یا تعلّی کا اظہار ہے، بلکہ اس سے فارسی کی "من" مراد ہے جو بے چاری بڑی ہی "معصوم" ہے۔

آئیے اب میری "میں" کی وساطت سے مولانا محمد حنیف ندوی کے واقعات و لطائف کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔

پہلی ملاقات اور قصہ چائے پینے کا

۱۹۳۹ کی سردیوں کا موسم تھا کہ میں اپنے استادِ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف کے ساتھ لاہور آیا۔ مغرب کی نماز ہم نے ایک مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد کچھ سفید اور کچھ کالی چھوٹی چھوٹی داڑھی والے ایک گورے چٹے خوب رو شخص جو شیروانی اور تنگ موری کا پاجامہ پہنے اور سر پر ٹوپی لیے ہوئے تھے، پہلی صف سے اٹھے اور مصلّے پر جا بیٹھے۔ ان کے سامنے اور دائیں بائیں چالیس پینتالیس آدمی، جن میں داڑھی والے کم اور منڈھی داڑھی والے زیادہ تھے، لکڑی کی لمبی لمبی تختیوں پر قرآنِ مجید کھول کر بیٹھ گئے۔ اس شخص نے قرآن مجید کھولا اور چند آیات کی تلاوت کر کے ان کا ترجمہ کیا اور پھر ان آیات کی تفسیر بیان کرنا شروع کی۔ میں اور مولانا عطاء اللہ حنیف مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے سنتے رہے۔ یہ سلسلہ تقریباً پون گھنٹے تک جاری رہا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی گئی۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس خوش پوش اور خوب رو شخص نے کیا کہا اور کن مسائل کو ہدفِ بحث ٹھہرایا۔

دعا کے بعد مولانا عطاء اللہ صاحب نے بتایا کہ یہ مسجد مبارک ہے اور اسلامیہ کالج کے میدان کے ساتھ واقع ہے اور یہ مولانا محمد حنیف ندوی ہیں جو اس مسجد میں جمعہ پڑھاتے ہیں اور ہر روز نمازِ مغرب کے بعد یہاں ان کا درسِ قرآن ہوتا ہے۔ ان کے سامعین زیادہ تر اسلامیہ کالج کے استاد اور طالب علم ہیں۔ یہ حضرات ان کے خطبۂ جمعہ میں بھی آتے ہیں اور درسِ قرآن میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا عطاء اللہ صاحب، جنھیں مولانا محمد حنیف ندوی پہلے سے جانتے تھے، اپنی جگہ سے اٹھے اور مولانا سے ملنے کے لیے ان کے پاس گئے۔ مولانا نے ان کو دیکھا تو کھڑے ہو کر نہایت تپاک سے ملے۔ میں بھی آگے بڑھا اور گردن جھکا کر مصافحہ کیا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے سے خیر خیریت پوچھی اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر مولانا عطاء اللہ صاحب نے جانے کے لیے اجازت چاہی تو مولانا ندوی نے کہا "اتنی جلدی؟ چلیے آپ کو چائے پلائیں۔"

مولانا نے دائیں ہاتھ میں چھڑی پکڑی اور ہم تینوں مسجد سے باہر نکلے۔ یہ دونوں آگے آگے اور میں مقتدی پیچھے پیچھے۔ ریلوے روڈ کی طرف اسلامیہ کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل کر سڑک پار کر کے ذرہ آگے بڑھے تو ایک عمارت پر بہت بڑا بورڈ آویزاں تھا، جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا "عرب ہوٹل"___!

ہم مولانا کے ساتھ ہوٹل کے اندر جا کر ایک کونے میں میز کے اِرد گرد پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بہرہ آیا اور مولانا نے اُسے تین چائے لانے کو کہا۔ وہ ایک ٹرے میں چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی تھالیوں میں رکھ کر لایا۔ پیالیوں کے ایک طرف چینی کی کنڈیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے نہ کبھی چائے دیکھی تھی، نہ پی تھی اور نہ یہ معلوم تھا کہ چائے پینے کے کیا ادب آداب ہیں؟ میں سمجھا یہ کوئی دوا یا بوٹی ہوگی جس کا نام چائے ہے اور لاہور کے لوگ اسے عرب ہوٹل کی "دکان" میں آکر پیتے ہوں گے، اسی لیے تو چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں لائی گئی ہے، ورنہ کھانے پینے کی چیزیں تو کانسی یا پیتل کے بڑے بڑے برتنوں میں لائی جاتی ہیں تاکہ اچھی طرح پیٹ بھر جائے۔

میں دیکھتا رہا کہ مولانا ندوی اور مولانا عطاء اللہ صاحب کس طرح یہ فریضہ انجام دینا شروع کرتے ہیں۔ جس طرح ان کو دیکھا، اسی طرح میں نے پیالی کی کنڈی میں انگشتِ شہادت ڈالی اور اُسے اٹھا کر مُنہ کو لگایا اور پھر گرم گرم چائے کا پانی کی طرح جو پورا گھونٹ بھرا تو وہ حلق کو چیرتی ہوئی معدے میں جا گری اور ایک ہی لمحے میں چودہ طبق روشن ہوگئے۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، زبان پر یکایک چھالے اُبھر آئے اور ایسا لگا جیسے پیٹ میں آگ ڈال دی گئی ہے۔ اندر کا سارا نظام آناً فاناً درہم برہم ہوگیا۔ یوں سمجھیے کہ:

برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہوگیا
ایمان دلوں میں لرزہ براندام ہوگیا

مولانا محمد حنیف ندوی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ صحیح لفظوں میں کہنا چاہیے کہ یہ پہلا دیدار تھا جو میں نے مولانا کا کیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ انھی کے ساتھ چائے پینے کا شرف حاصل ہوا۔ یا یوں کہیے کہ میری چائے نوشی کا افتتاح مولانا کے ہاتھوں ہوا اور انھی کی نیک کمائی سے ہوا۔ اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی۔

عرب ہوٹل کسی زمانے میں لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کا مرکز تھا اور اس کے ساتھ علم وادب اور لطائف وظرائف کی ایک تاریخ وابستہ تھی۔ اب کئی سال ہوئے عرب ہوٹل بھی ختم ہوگیا ہے، اس کے مالک بھی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں اور اس میں بیٹھنے والے بھی اکثر لوگ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

دوسری ملاقات

اس سے کم وبیش ایک سال بعد ۱۹۴۰ میں فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب) میں وہاں کی انجمن اہل حدیث کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم نے کی تھی جو مشہور ماہرِ قانون میاں محمود علی قصوری کے والدِ بزرگ وار تھے اور متحدہ ہندوستان کے ممتاز علمائے دین اور زعمائے سیاست میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مذاہب کانفرنسوں کے انعقاد کا بہت رواج تھا اور ایک ہی سٹیج پر "میرا مذہب مجھے کیوں پیارا ہے؟" کے موضوع پر مختلف مذاہب کے اہلِ علم باری باری اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ ہر مذہب کا ایک ہی مقرر ہوتا تھا اور تقریر کے لیے وقت متعین کر دیا جاتا تھا۔

فتح گڑھ چوڑیاں کے جلسے کے اشتہار میں لکھا تھا کہ اس موقعے پر مذاہب کانفرنس بھی ہوگی، جس کی صدارت مولانا ثناء اللہ امرتسری فرمائیں گے اور مسلمانوں کی طرف سے تقریر مولانا محمد حنیف ندوی کریں گے۔

میں ان دنوں فیروز پور میں علومِ عربیہ کا طالب علم تھا۔ میرے ایک استاد مولانا محمد شفیع صاحب ہوشیارپوری تھے، وہ اس جلسے میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی

تیار کر لیا۔

مولانا محمد شفیع صاحب نے ہرکلیس کا نیا نیا سائیکل خریدا تھا اور اس زمانے میں سائیکل کو امیرانہ سواری سمجھا جاتا تھا۔ مولانا نے مجھے سائیکل کے پیچھے بٹھایا اور خود چلانے لگے فیروز پور سے چل کر ہماری پہلی منزل امرتسر تھی۔ رات وہاں مدرسہ غزنویہ میں بسر کی اور دوسرے دن دس بجے کے قریب فتح گڑھ چوڑیاں پہنچے۔

جلسہ تین دن جاری رہا۔ آخری دن نمازِ عصر کے بعد مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کے زیرِ صدارت مذاہب کانفرنس منعقد ہوئی۔ مجھے یاد ہے مسلمان، ہندو اور سکھ کثیر تعداد میں جلسے میں موجود تھے۔ ہندوؤں کی طرف سے جس مقرر نے تقریر کی وہ گیروے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے مقرر مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا نے تقریر میں کیا کہا، یہ البتہ یاد ہے کہ سب مذاہب کے لوگوں نے مولانا کی تقریر نہایت توجہ اور غور سے سُنی اور اس کی تحسین کی۔ صدرِ جلسہ مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم نے اپنی صدارتی تقریر میں ہر مذہب کے مقرر کے افکار و ارشادات کا تجزیہ کیا اور اس موضوع پر مولانا ندوی کی تقریر کو بہترین تقریر قرار دیا۔۔۔۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میں مولانا کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوا۔

تیسری ملاقات اور واقعہ میرے امتحان کا۔

۱۹۴۲ میں، میں گوجرانوالہ میں مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم کے دارالعلوم کا طالب علم تھا اور درسِ نظامیہ کی انتہائی کتابیں پڑھتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ طلبا کے سالانہ امتحان کے لیے لاہور سے مولانا محمد حنیف ندوی کو یہاں بلایا جاتا ہے۔ یہ بھی پتا چلا کہ وہ اصلاً گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کے پرانے شاگرد ہیں۔ یہ بات بھی علم میں آئی کہ وہ قدیم و جدید عربی ادبیات کے ماہر ہیں، تفسیرِ قرآن ان کا خاص موضوع ہے اور کتبِ تفسیر و حدیث اور فقہ کے زبانی امتحان میں ایسے سوالات بھی پوچھتے ہیں جن کا تعلق نئے دور کے مسائل سے ہے۔

میں نصابی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنے کا بھی شوقین تھا۔ سوچا، دیکھا

جائے گا، ڈرنے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

امتحان کے دن آئے تو مولانا تشریف آئے۔ لباس اور وضع قطع میں عام حضراتِ علما سے مختلف۔ سفید کھدر کا تنگ موری کا پاجامہ، کھدر کا کرتہ اور شیروانی زیب تن، سر پر ٹوپی، خشخشی داڑھی جس کے سفید اور کالے بال برابر برابر ہوں گے یعنی ففٹی ففٹی۔ سرخ و سفید رنگ، چہرے پر وقار اور تمکنت، ہاتھ میں چھڑی۔

صحیح بخاری کا زبانی امتحان شروع ہوا۔ ہر طالب علم کو الگ الگ بلایا گیا۔ میری باری آئی تو تین چار سوال پوچھے، جن کے مَیں نے جواب دیے۔

اس دور میں علمائے دین میں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ لاؤڈ سپیکر یعنی آلۂ مکبر الصوت کا استعمال شرعی معاملات میں جائز ہے یا نہیں؟ اور امام اس کے ذریعے خطبۂ جمعہ دے سکتا اور نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ نیز ریڈیو اور ٹیلی فون کی وساطت سے رؤیتِ ہلال کی اطلاع کو صحیح تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے؟

علما کا ایک گروہ اسے صحیح مانتا اور اس کے دلائل دیتا تھا۔ دوسرا اسے غلط قرار دیتا تھا۔ مولانا نے مجھ سے یہی سوال پوچھا اور فرمایا وضاحت سے بتائیے کہ سائنس کی نئی ایجادات سے شرعی معاملات میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں اٹھایا جا سکتا؟ یہ سوال انھوں نے صحیح بخاری کی حدیث صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته (یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ رکھنا بند کرو) کے سلسلے میں پوچھا۔

ایک تو میں اس کا پہلے سے حامی تھا، دوسرے سوال کے تیور سے سمجھ گیا تھا کہ ممتحن کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ عرض کیا علوم و فنون میں ارتقا اور نئی سے نئی ایجاداتِ و اختراعات کا عمل حالات و مقامات کے مطابق ہمیشہ جاری رہتا ہے اور جاری رہے گا۔ اسلام دائمی مذہب ہے اور معاشرہ تغیر پذیر ہے۔ ان پیش آئند مسائل میں جو کتاب و سنت سے متصادم نہیں یا جن کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہیں، معاشرے کا اسلام کے ساتھ اور اسلام کا معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ مَیں نے یہ بات اپنے فہم کے مطابق تفصیل سے بتائی اور ساتھ ہی کہا کہ اصولِ فقہ کا مسئلہ

ہے کہ تتغیر الاحکام بتغیر الاحوال۔ یعنی عبادات کو چھوڑ کر باقی احکام جو انسانی زندگی میں ہر روز پیش آتے ہیں، احوال و مقامات کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔

آخر میں عرض کیا کہ خطبۂ جمعہ اور نماز کے لیے لاؤڈ سپیکر کا استعمال بھی جائز ہے اور ریڈیو اور ٹیلی فون کے ذریعے رؤیتِ ہلال کی اطلاع کو بھی شرعاً تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے جائز و عدم جواز کے متعلق اگر آج مولانا مجھ سے امتحاناً یہی سوال پوچھیں تو میں اصولِ فقہ کے اسی اصول کی روشنی میں کہ تغیرِ احوال سے تغیرِ احکام ہو جاتا ہے، دوسری قسم کا جواب دوں گا اور لاؤڈ سپیکر کے مسرفانہ استعمال پر پابندی لگانے کو دلائل سے ضروری قرار دوں گا۔

امام بخاری بہت بڑے فقیہ تھے اور ان کی فقاہت کے جوہر ان کے قائم کردہ تراجم الابواب سے کھلتے ہیں۔ مولانا نے اس ضمن میں بھی ایک دو سوال پوچھے۔

ہدایہ کے زبانی امتحان میں مولانا نے پوچھا کہ فقہا نے امام کے لیے کیا شرائط بیان کی ہیں؟ میں نے بتایا علم، عمر، نیکی، تقویٰ وغیرہ۔ ساتھ ہی تھوڑا سا مسکراتے ہوئے بصورت استفسار عرض کیا۔ حضرت! فقہائے کرام امامت کے بارے میں عمر کی قید لگاتے ہیں، لیکن کیا یہ قرینِ صحت نہیں کہ کم سن امام کی اقتدا میں نماز کا زیادہ ثواب ملنا چاہیے؟ کیوں کہ کم سِن امام کے گناہ کم ہوتے ہیں، جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے، گناہوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ فرمایا آپ کے اس "فقہی نکتے" پر مجھے تو ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں، فقہا سے پوچھ لیجیے یا خود فقیہ بن کر یہ فتویٰ جاری کر دیجیے۔

بہرحال مولانا نے نتیجہ سنایا تو مجموعی طور پر مجھے سب سے زیادہ نمبر ملے اور میں اوّل درجے پر رہا۔

بہ اعتبار ترتیب کے مولانا سے یہ میری تیسری ملاقات تھی۔ پہلے دو مرتبہ ان کی زیارت سے بھی مشرف ہوا تھا اور تقریر سننے کی سعادت بھی حاصل ہوئی تھی۔ اب تیسری مرتبہ ہم کلامی سے بھی بہرہ مند ہوا۔ بصورتِ سوال و جواب یہ ہماری پہلی باہم بات چیت تھی جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مجموعی لحاظ سے تقریباً تین گھنٹے جاری رہی۔

چوتھی ملاقات اور تشریف لے جانا میرے وطن میں

میرا سابق وطن کوٹ کپورہ ہے جو مشرقی پنجاب کی ریاست فرید کوٹ (اور اب ضلع فرید کوٹ) کا اُس نواح میں مشہور شہر ہے۔ اس شہر میں مسلمان خاصی بڑی تعداد میں آباد تھے اور بائیس مسجدیں تھی۔

کوٹ کپورے کی انجمن اصلاح المسلمین کے زیرِ اہتمام ہر سال تبلیغی جلسہ ہوتا تھا، جس میں برصغیر کے نامور علمائے کرام کو دعوتِ شرکت دی جاتی تھی۔ ان علمائے کرام میں مولانا سید سلیمان ندوی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد علی ایم اے کینٹب قصوری، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا اسماعیل غزنوی، مولانا حافظ محمد زکریا غزنوی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا محمد جوتا گڑھی دہلوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ، مولانا عبدالمجید سوہدروی اور جماعتِ مجاہدین کے رکن صوفی ولی محمد فتوحی والا کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب حضرات سفرِ آخرت اختیار کرچکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اس بزمِ اہلِ علم میں جو حضرات زندہ ہیں، ان میں مولانا حافظ محمد[1] گوندلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی شامل ہیں۔ مولانا عطاء اللہ حنیف تو تین چار سال (۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک) وہاں خطابت و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو تادیر سلامت رکھے اور لوگ ان کے علم و فضل سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

انجمن اصلاح المسلمین کا آخری جلسہ جو چھبیسواں سالانہ جلسہ تھا، مارچ ۱۹۴۷ء میں

---

[1] افسوس ہے حضرت حافظ صاحب ۴۔جون ۱۹۸۵ء (۱۴۔رمضان ۱۴۰۵ھ) کو گوجرانوالہ میں وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

منعقد ہوا۔ اس وقت میری عمر بائیس تیئس برس کی تھی اور میں اس انجمن کا سیکرٹری تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی اس جلسے میں مدعوّ تھے اور میں نے سیکرٹری کی حیثیت سے ان کو جلسے میں دعوتِ شرکت دی تھی، اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو خط لکھا۔ ان کی تقریر کا موضوع تھا، "اسلام اور دیگر مذاہب"

مولانا شام کو چھ بجے کی گاڑی سے لاہور سے کوٹ کپورے پہنچے، میں اپنے رفقا کے ساتھ استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ جلسے کے آخری دن اتوار کو دس بجے اُن کی تقریر ہوئی۔ مسلمان، ہندو اور سکھ اچھی خاصی تعداد میں جلسے میں شریک تھے۔ مولانا کی تقریر اس قدر جامع، مدلّل اور زوردار تھی کہ سب مذاہب کے لوگ اس سے یکساں متاثر ہوئے۔ مولانا نے ہندو، عیسائی اور سکھ مذاہب کا اسلام سے مقابلہ کیا اور جو باتیں ان میں مشترک ہیں، ان کی وضاحت کی اور پھر اسلام کو جن امور میں دیگر مذاہب پر فوقیت حاصل ہے، انھیں تفصیل سے بیان کیا۔ کسی مذہب کی تنقیص نہیں کی اور کسی مذہب کے ماننے والوں کو نشانۂ تنقید نہیں بنایا۔

تقریر میں ہندوستان کے موجودہ صدر گیانی ذیل سنگھ بھی موجود تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو گیانی جی نے مجھ سے کہا، "اسحاق جی! یہ مولانا صاحب کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ یہ بہت بڑے عالم ہیں اور انھوں نے بہت اچھی تقریر کی ہے۔ میں انھیں سلام کرنا چاہتا ہوں"۔ میں ان کو مولانا کے پاس لے گیا، انھوں نے مولانا کو سلام کیا اور ان کی تقریر کی تعریف کی۔

گیانی ذیل سنگھ خود بھی اچھے مقرر تھے اور میرے دوست تھے۔ اب بھی ہندوستان کے صدر ہونے کے باوجود میرے دوست ہیں اور ہماری باہم خط و کتابت بھی ہے۔ میرے شہر سے دو میل کے فاصلے پر ان کا گاؤں تھا، جس کا نام "سندھواں" ہے۔

مولانا سے یہ میری چوتھی ملاقات تھی۔

آجانا میرا لاہور میں اور ملنا مولانا سے

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ کے اکتوبر میں ہم ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) کی

تحصیل جڑانوالہ کے ایک گاؤں چک ۵۳۳ گ ب منصور پور میں آباد ہوئے جو جڑانوالہ سے تین میل کے فاصلے پر فیصل آباد روڈ پر واقع ہے۔

۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو لاہور میں مرکزی جمعیۃ اہلِ حدیث مغربی پاکستان قائم ہوئی۔ اس کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور ناظمِ اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم تھے جو اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبۂ عربی کے صدر تھے اور اب اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) کے سینئر ایڈیٹر ہیں۔ مجھے جمعیۃ اہل حدیث کا ناظم دفتر مقرر کیا گیا اور میں اس خدمت کی انجام دہی کے لیے ۸۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو لاہور آگیا۔ جمعیۃ کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا۔ اس کی مجلسِ عاملہ اس دور کے ممتاز اہلِ علم پر مشتمل تھی۔ اس کے ایک رکن مولانا محمد حنیف ندوی تھے جو ان دنوں مسجدِ مبارک میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے تھے اور نمازِ مغرب کے بعد روزانہ درسِ قرآن دیتے تھے۔

میری یہاں آمد کے دو ماہ بعد (فروری ۱۹۴۹ء میں) مرکزی جمعیۃ اہلِ حدیث کی مجلسِ عاملہ کا جو پہلا اجلاس ہوا، میں نے ناظم دفتر کی حیثیت سے، صدر جمعیۃ مولانا سید داؤد غزنوی اور ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم کی ہدایت کے مطابق ارکانِ عاملہ کو اس میں شرکت کے لیے دعوت نامے بھیجے۔ مقررہ وقت پر سب سے پہلے مولانا محمد حنیف ندوی تشریف لائے۔ میں نے اُٹھ کر سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ پھر عرض کیا:

"کیا نوش فرمائیں گے"؟

بولے "چائے"!

مجھے فوراً عرب ہوٹل کی وہ چائے یاد آگئی جو دس سال پہلے انھوں نے پلائی تھی اور جس کے پہلے ہی گھونٹ سے میرے باطن کی دنیا میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔

مولانا داؤد غزنوی علمی اور جماعتی معاملات میں مولانا حنیف ندوی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ان کے مشوروں کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اس لیے کہ یہ ہر معاملے میں صاف اور واضح بات کرتے اور ہمیشہ صائب مشورہ دیتے تھے۔ مولانا ندوی اکثر مولانا غزنوی کے ہاں تشریف لے جاتے تھے اور ان بزرگوں کی باہمی گفتگو میں بسا اوقات مجھے بھی شامل

ہونے کا موقع ملتا تھا۔ بعض دفعہ لطائف و ظرائف کا دور بھی چل پڑتا۔ لیکن میں چپ چاپ بیٹھا سنتا رہتا، کسی بات میں دخل نہ دیتا۔ مجھے مولانا ندوی کی باتوں سے پتا چل گیا تھا کہ یہ بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج عالم اور صاحبِ لطائف و ظرائف ہیں اور اس فنِ لطیف کی نزاکتوں کے تمام پہلوؤں سے باخبر ہیں۔

لطیفہ بیان کرنا، کسی سے سننا اور آگے سنانا اور اس کے لیے موقع و محل کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ایک خاص انداز کے ساتھ ان الفاظ کو زبان سے ادا کرنا سب فنونِ لطیفہ میں شامل ہے اور مولانا ندوی اس سے خوب آگاہ ہیں۔ یہ "علم وہبی" ہے جو اللہ کی ایک دین ہے۔ مولانا اپنی اُردو میں جو پورے عربستان کا چکر کاٹتی ہوئی ان کے پاس پہنچی ہے، اسے غالباً "موہبتِ الٰہیہ" سے تعبیر فرمائیں گے۔

چھوٹا ہونا خطیب کی داڑھی کا

مولانا اس زمانے میں مسجدِ مبارک میں خطبۂ جمعہ دیتے تھے، میں بھی وہیں جاتا اور پہلی صف میں بیٹھتا تھا۔ مولانا کا خطبہ نہایت توجہ بلکہ کہنا چاہیے کہ انتہائی "خشوع و خضوع" کے ساتھ سنتا تھا، اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک مولانا کی باتیں ذہن و دماغ کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے نہ سنی جائیں، کچھ پلے نہیں پڑتا۔ اس لیے یہ ایک مجبوری ہے کہ انسان ذہنی اعتبار سے تمام اطراف سے کٹ کر مولانا کی طرف متوجہ ہو یعنی ان حنیف کے ساتھ خود بھی حنیف ہو جائے۔

مولانا کے بالکل سامنے منبر کے قریب علامہ حسین میر کاشمیری مرحوم بیٹھتے تھے۔ علامہ مرحوم کی داڑھی لمبی اور گھنی تھی اور وہ جسمانی لحاظ سے فربہ تھے۔ خطبے کے دوران وہ اپنی موٹی موٹی قدرے سرخ آنکھیں مولانا کے چہرے پر گاڑے رکھتے اور کامل انہماک سے خطبہ سنتے۔ مولانا کی داڑھی چھوٹی تھی اور یہی انداز تھا جواب ہے۔ داڑھی منڈے تو اس کو واقعی داڑھی سمجھتے ہیں، لیکن بعض علمائے کرام کے نزدیک یہ داڑھی کسی شمار قطار میں نہیں آتی۔ ایسی داڑھی کے بارے میں وہ صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ یہ بھی کوئی داڑھیوں میں داڑھی ہے۔

مولانا ایک دن خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے کہ صحنِ مسجد سے ایک عالمِ دین اٹھے

اور خطیب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"خطیب صاحب آپ کی داڑھی چھوٹی ہے۔"

علامہ حسین میر نے یہ الفاظ سنتے تو وہ دایاں ہاتھ زمین پر اور بایاں ہاتھ گھٹنے پر رکھ کر اپنے بوجھل جسم کے ساتھ اٹھے اور مولانا کے برابر کھڑے ہو کر بلند آواز میں داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

"حضرات! خطبہ ان کا سنیے، داڑھی میری دیکھیے۔"

ظاہر ہے علامہ صاحب کے ان الفاظ سے ان عالمِ دین کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔ جمعے کی نماز ختم ہوئی تو وہ عالم مولانا کے پاس آئے اور فرمایا:

"میں آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

مولانا اس سے بچنا چاہتے تھے۔ کہا:

"اب میں جلدی میں ہوں اور جانا چاہتا ہوں، آپ پھر کسی وقت تشریف لائیے۔"

انھوں نے بات کرنے پر اصرار کیا، مولانا نے معذرت چاہی، لیکن وہ نہ ٹلے اور کہا:

"مسلمان، مسلمان کا آئینہ ہوتا ہے۔"

مولانا نے جواب دیا: "آئینہ ہوتا ہے، مرسیش نہیں ہوتا۔"

پہلا مشورہ جو لیا مولانا نے مجھ سے

اب میرے اور مولانا کے درمیان تعلقات مراسم پیدا ہو گئے تھے اور میل جول کافی بڑھ گیا تھا۔ بعض جماعتی امور میں بھی مولانا مجھ سے مشورہ لیتے تھے۔ ۲۷، ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۴۹ کو لاہور میں جمعیۃ اہل حدیث کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کانفرنس کی صدارت کے لیے مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مرحوم کا اسمِ گرامی سامنے آیا اور مجلسِ استقبالیہ کے صدر مولانا محمد حنیف ندوی کو بنایا گیا۔ مولانا خطبۂ استقبالیہ لکھنا چاہتے تھے۔ علیحدگی میں مجھ سے فرمایا:

"آپ ہماری جماعت کے مزاج کو جانتے ہیں، مجھے مشورہ دیجیے، خطبۂ استقبالیہ میں کیا باتیں لکھی جائیں اور موجودہ دور کے کن کن مسائل کی طرف کس پیرایۂ بیان میں اُن کو

توجہ دلائی جائے ۔"

میں لفظِ "مشورہ" سے خوش بھی ہوا اور حیران بھی ۔ نہایت نیاز مندی سے عرض کیا:

"مولانا ۔ ! میں اس سلسلے میں آپ سے کیا عرض کر سکتا ہوں، آپ مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جماعت کے مزاج کو جانتے ہیں ۔"

یہ مولانا کی مہربانی اور شفقت تھی کہ تعلقات کے ابتدائی دور ہی میں انھوں نے مجھے مشورے کے قابل گردانا۔ ان کے اس فرمان سے میں بہت متاثر ہوا اور میرے دل میں ان کا احترام پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔

بیمار ہو جانا میرا

یہاں یہ واقعہ بھی لائق تذکرہ ہے کہ کانفرنس کے فوراً بعد مجھے ٹائی فائیڈ ہو گیا اور میں سخت بیمار پڑ گیا ۔ مولانا کو پتا چلا تو تشریف لائے، میرا حال پوچھا اور کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں مولانا داؤد غزنوی سے میری حقیر کوششوں کو سراہا اور مجلسِ عاملہ سے منظور کرایا کہ میرا علاج اچھے ڈاکٹر سے کرایا جائے اور علاج کا خرچ جمعیۃ ادا کرے ۔کیوں کہ بیماری کی وجہ کانفرنس کے سلسلے میں ان کی بھاگ دوڑ اور بے حد محنت ہے ۔میں مہینہ بھر چارپائی پر پڑا رہا اور مولانا کی تجویز کے مطابق علاج کا خرچ مرکزی جمعیۃ نے برداشت کیا۔

چلے جانا مولانا کا لاہور سے گوجرانوالے

اس سے کچھ عرصے بعد مولانا لاہور کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی شہر گوجرانوالہ چلے گئے ۔ "مالِ عرب پیشِ عرب" کے محاورے کے مطابق اہل و عیال بھی ساتھ تھے۔ مولانا اپنا جدّی مکان بہت پہلے اپنی غربت کی نذر کر چکے تھے۔ وہاں جا کر سسرال کے ہاں ٹھہرے ۔ان کے سسر، ان کے ماموں تھے ۔ایک دن انھوں نے پوچھا :

"یہاں آپ کی رہائش کا کیا انتظام ہو گا ۔؟"

فرمایا: "یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے ۔"

پوچھا: "کیسے ؟"

جواب دیا : " میری بیوی اپنے میکے میں رہیں گی، بچے اپنے ننھیال میں رہیں گے

اور میرا قیام اپنے ماموں کے گھر ہو گا۔"

جاری ہونا اخبار "الاعتصام" کا اور ایڈیٹر بننا مولانا کا۔

اگست ۱۹۴۹ میں گوجرانوالہ سے ہفت روزہ "الاعتصام" جاری ہوا۔ مولانا کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ یہ اخبار چھپتا لاہور میں تھا اور حوالۂ ڈاک گوجرانوالہ سے کیا جاتا تھا۔ مولانا اس کی طباعت کے لیے ہر منگل کو لاہور آتے تھے اور بدھ کو اخبار بوریوں میں ڈال کر گوجرانوالہ لے جاتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ لاہور آتے ہی بس سے اُتر کر سیدھے میرے پاس شیش محل روڈ آتے، یہاں آکر چائے پیتے، باتیں کرتے اور پھر ہم دونوں پریس جا کر اخبار چھپنے کے لیے دے دیتے۔ ابتدا میں اخبار اردو بازار کے باہر حجازی پریس میں چھپتا تھا، اس کے بعد ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس میں چھپوانا شروع کر دیا گیا تھا۔ یہ پریس حافظ عبدالقادر روپڑی کے بڑے بھائی مولوی محمد احمد کا تھا اور موہن لال روڈ پر تھا۔ موہن لال روڈ کا نام بعد کو اُردو بازار رکھا گیا اور اب یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

جانا میرا گوجرانوالہ میں

"الاعتصام" کے اجرا کے بعد میں بھی اس میں لکھنے لگا تھا، لیکن میرا قیام لاہور ہی میں تھا۔ تھوڑے عرصے بعد مولانا داؤد غزنوی سے کہہ کر مولانا ندوی نے مجھے بھی گوجرانوالہ بلا لیا۔ میں اخبار میں مولانا کا چپڑاسی بھی تھا، خاکروب بھی تھا، کلرک بھی تھا، مینجر بھی تھا اور معاون ایڈیٹر بھی۔ چوبیس پچیس برس کی عمر تھی، جوانی کا زمانہ تھا، نہ دن کا پتا تھا نہ رات کا، ہر وقت کام میں جُتا رہتا۔ میری یہ کوشش ہوتی کہ مولانا کو کوئی تکلیف نہ ہو، تمام کام خود ہی کر لوں۔

کہنا مجھ کو "آپ" یا "تُسیں"

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا سے تعلقات کے آغاز ہی میں بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ میرے استاد بھی ہیں، رہنما بھی ہیں، بزرگ بھی ہیں، بہی خواہ بھی ہیں، گہرے دوست بھی ہیں۔ ان کی ذاتی یا گھر کی کوئی بات ایسی نہیں جس کا مجھے علم نہ ہو۔ بچوں کی ملازمت اور کاروبار کے سلسلے میں بھی مجھ سے مشورہ لیتے ہیں، اور ان کی منگنی اور شادی بیاہ کے بارے میں بھی ازراہِ کرم

مجھ سے بات کرتے ہیں۔ کسی رشتے دار سے کوئی جھگڑا ہو جائے اس کا بھی مجھے علم ہے اور کسی علمی مسئلے میں کسی سے بحث و مباحثہ چل پڑے اس سے بھی میں آگاہ ہوں۔ یعنی اُن کی کوئی بات مجھ سے چھپی یا پنجابی میں کہنا چاہیے کہ "گجھی" نہیں ہے۔ اگر کوئی بات کبھی مجھ سے چھپانا بھی چاہی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، چند روز بعد ہتھیار ڈال دیے اور ساری بات یہ کہہ کر بتا دی کہ کچھ عرصے سے یہ بات آپ سے چھپا رکھی تھی، اب کر رہا ہوں۔ یعنی گھر کی یا باہر کی کوئی اہم بات ہضم نہیں کر سکے، جلد یا بدیر اُگل ہی دی۔ لیکن اس بے پناہ تعلق اور بے تکلفی کے باوجود مجھے کبھی "تو" یا "تم" کہہ کر خطاب نہیں کیا۔ اُردو میں بات کی تو ہمیشہ "آپ" کہا اور پنجابی میں کچھ ارشاد فرمایا تو "تسیں" کہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے گزشتہ سطور میں بھی اپنے لیے مولانا کے یہی الفاظ "آپ کریں" اور "کیجیے" وغیرہ استعمال کیے ہیں، آئندہ سطور میں بھی اس کا التزام کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ "تو" یا "تم" وغیرہ کے جو الفاظ مولانا نے میرے لیے نہیں استعمال کیے، ان کی زبان پر لاؤں۔

"تمباکو دی ہٹی"

مولانا گوجرانوالہ میں "الاعتصام" کے ایڈیٹر تھے، میں بھی ان کے ساتھ بحیثیت خادم کے کام کرتا تھا، لیکن مولانا کے بعض ملنے والوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ مولانا کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ ایک دن ہم دونوں کہیں جا رہے تھے کہ ایک صاحب مولانا کو دیکھ کر دوڑتے ہوئے آئے، بڑے احترام سے مصافحہ کیا اور پوچھا:

"مولوی جی، خیر نال اج کل کتھے او"؟

فرمایا "یہیں گوجرانوالہ میں"۔

"ایتھے کی کردے او"؟

فرمایا: "تمباکو دی ہٹی پائی اے، بڑا ودھیا تمباکو ویچداں"۔

انھوں نے دعا دی اور کہا: "اچھا جی! اللہ برکت دے، بپار بڑی چنگی شے اے"۔

تنگ دستی اور غربت

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں آنے سے پہلے مولانا کا اور غربت کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ "الاعتصام" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس زمانے میں ان کی سو روپے تنخواہ تھی۔ نوّے روپے مجھے ملتے تھے۔ مولانا سو میں سے سولہ روپے مکان کا کرایہ دیتے تھے۔ اس مکان میں بجلی نہ تھی۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے پہلی کتاب "مسئلۂ اجتہاد" انھوں نے اسی مکان میں شدید گرمی کے موسم میں لالٹین کی روشنی میں لکھی تھی۔ یہ ان کی انتہائی تنگ دستی کا دور تھا۔ لیکن ان کی شگفتگی، بذلہ سنجی اور لطیفے بازی اس حالت میں بھی پورے جوبن پر تھی۔ قلم بھی خوب جولانیاں دکھاتا تھا اور فکر و اسلوب کی دنیا بھی نرالی تھی۔ پھر مہمان نواز بھی تھے۔ گوجرانوالہ لسی اور دودھ کا شہر تھا۔ چائے اس زمانے میں وہاں بہت مشکل سے ملتی تھی۔ چار بجے سہ پہر کی چائے ہم مولانا کے گھر باجماعت پیتے تھے۔ جو شخص ان سے ملاقات کے لیے آتا اس کو بھی حسبِ توفیق کھانے پینے کو پیش کیا جاتا۔

ایک دفعہ کسی دوست نے ان کو شان دار چُغہ تحفۃً دیا۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم کسی علمی کام کے سلسلے میں ان کے گھر گئے تو مولانا وہ چُغہ پہنے ہوئے تھے۔ صدیقی صاحب کو چائے پیش کی۔ انھوں نے کہا۔ مولانا! معلوم ہوتا ہے آج کل آپ امیر ہو گئے ہیں، بہت عمدہ چغہ پہن رکھا ہے۔ مولانا نے چُغہ اتارا اور ہنس کر پھٹی ہوئی قمیص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اس کو چھپانے کے لیے ایک دوست کی طرف سے تحفے میں دیا ہوا یہ چغہ پہن لیا ہے۔"

یہ الفاظ سُن کر اور قمیص کو دیکھ کر عبدالحمید صدیقی مرحوم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر صدیقی صاحب نے مجھ سے کہا: "دیکھیے یہ کتنے بڑے عالم ہیں اور تنگ دستی کی گرفت میں ہیں۔ کبھی ہماری قوم اہلِ علم کی طرف بھی توجہ کرے گی؟"

مولانا کا ایک ہی جوڑا تھا جو ایک پاجامے اور ایک قمیص پر مشتمل تھا۔ اسی کو دوسرے تیسرے دن اُتار کر دھلا لیتے تھے۔

گوجرانوالہ میں ایک بزرگ سیٹھ نظام الدین مرحوم تھے جو بہت نیک اور مخیّر آدمی

تھے اور بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے ۔ انھوں نے ایک دن دیکھا کہ مولانا کا پاجامہ پھٹا ہوا ہے ۔ وہ اسی وقت اُٹھ کر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد کورے لٹھے کا ایک تھان بغل میں دبائے ہوئے آئے ۔ مولانا اس وقت گھر جا چکے تھے ۔ سیٹھ صاحب مرحوم نے مجھے علیحدہ کر کے وہ تھان دیا اور آہستہ سے کہا : " یہ تھان مولوی حنیف کے گھر دے آؤ ، کسی کو بتانا نہیں کہ کس نے دیا ہے ۔"

گوجرانوالہ میں ان دنوں ایک صاحب صوفی نذیر حسین مرحوم تھے جو کشمیری تھے اور اگست ۱۹۴۷ میں امرتسر سے نقل مکانی کر کے گوجرانوالہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے ۔ مرحوم بہت خوش مزاج اور شگفتہ طبیعت آدمی تھے ۔ مولانا سے ان کا دوستانہ تھا ، مجھ سے بھی محبت کا برتاؤ کرتے تھے ۔ ہم دونوں عصر کے بعد بعض اوقات ان کے گھر جاتے تو وہ بہت خوش ہوتے تھے ۔ مولانا کے وہ خاص معاون تھے ۔ جب ضرورت پڑتی مولانا ان کے نام رقعہ لکھ کر مجھے بھیج دیتے اور وہ مولانا کے حکم کی تعمیل کرنے میں ذرا دیر نہ لگاتے ۔ صوفی صاحب مرحوم نے ۲۷ ۔ فروری ۱۹۵۴ کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک وفات پائی ۔

بڑھا لینا داڑھی کا اور رکھ لینا پٹوں کا

اخبار " الاعتصام " کی ادارت کے تین چار مہینے بعد مولانا نے داڑھی بڑھا لی تھی اور پٹے بھی رکھ لیے تھے ۔ عجیب سی وضع قطع ہو گئی تھی ۔ اس زمانے میں یہ اخبار لاہور میں چھپتا تھا ۔ میں اس کی طباعت کے لیے سوموار کو گوجرانوالہ سے لاہور آتا اور دو دن کے بعد بدھ کی شام کو واپس جاتا ، جمعرات کو اخبار حوالۂ ڈاک کیا جاتا تھا ۔ ایک دن مولانا نے فرمایا اب کی ہم دونوں لاہور جائیں گے اور میں اپنے بعض دوستوں سے آپ کو ملاؤں گا ۔

ہم بذریعہ بس گوجرانوالہ سے لاہور آ رہے تھے کہ کالا شاہ کاکو کے قریب سیلاب آ گیا اور آناً فاناً سڑک پانی سے بھر گئی ۔ لیکن ہم لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ۔ شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں ایک کمرہ میرے قبضے میں تھا اور میں اس سے پیشتر لاہور کے زمانۂ قیام میں اسی کمرے میں رہتا تھا ۔ ہم نے اس کمرے میں سامان رکھا اور چائے پی کر کشمیری بازار کو روانہ ہوئے ۔ سنہری مسجد کے قریب پہنچے تو سامنے سے مشہور شاعر اور ادیب عبدالمجید بھٹی مرحوم آ رہے تھے ۔ میں نے دور سے دیکھا کہ ان کی

نظریں مولانا کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں اور ایسے معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ مولانا کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ مولانا کے قریب آکر رُکے اور نہایت ادب سے مصافحہ کیا۔ مولانا کی وضع قطع پہلے سے بالکل مختلف تھی۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ دو تین منٹ خاموش کھڑے مولانا کی داڑھی اور سر کے بالوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ پھر مُسکرائے اور اجازت لے کر چلے گئے۔ ان کی خاموشی میں بہت سی باتیں چُھپی ہوئی تھیں۔

سیلاب کی وجہ سے لاہور اور گوجرانوالے کا راستہ بند ہو گیا تھا اور ہمیں چھ سات دن یہاں ٹھہرنا پڑا۔ دوسرے دن ہم ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کے ہاں گئے۔ وہ مولانا کے بے تکلّف دوستوں میں سے تھے اور میرے مہربان تھے۔ اس زمانے میں وہ سہ روزہ "کوثر" نکالتے تھے اور گوال منڈی میں ان کا دفتر تھا، سکونت بھی وہیں تھی۔ وہ مولانا کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "آپ تو دیوندر ستیارتھی معلوم ہو رہے ہیں" مولانا کی داڑھی اور پٹوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات انھوں نے اپنے اخبار "کوثر" کے فکاہی کالم "سیروسفر" میں لکھ بھی دی۔

دیوندر ستیارتھی لاہور کے مشہور ادیب و شاعر اور افسانہ نگار تھے اور ان کی داڑھی اور سر کے بال بہت لمبے لمبے تھے۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز نے مولانا کی ان کے چہرے اور سر کے بالوں سے تشبیہ دی تھی، ورنہ ان کا باطن کچھ اور ہی قسم کا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ادیبوں کے حلقے میں دیوندر ستیارتھی فراڈ مشہور تھے۔ یوں سمجھیے کہ "فراڈ" کے لفظ نے ان کے تخلص کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جناب احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب اور دوسرے ادیب و شاعر حضرات جن کو دیوندر ستیارتھی سے تعلق رہا ہے، ان کی بہت سی باتیں بیان کرتے ہیں، پچھلے دنوں معلوم ہوا تھا کہ دیوندر ستیارتھی دہلی میں مقیم ہیں۔

ملک نصر اللہ خاں عزیز سے ملنے اور چائے پینے کے بعد ہم مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کے پاس پہنچے۔ اس وقت ان کا اخبار "انقلاب" بند ہو چکا تھا اور اس کا دفتر میکلوڈ روڈ پر ہفت روزہ "چٹان" کی بلڈنگ میں تھا۔ وہ بھی بہت تپاک سے ملے۔ سالک صاحب مرحوم کی میز پر اتفاق سے اس وقت "الاعتصام" پڑا تھا۔ انھوں نے اخبار ہاتھ

میں پکڑ کر کہا: "یہ تو ہوا الاعتصام" اور پھر مولانا کی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بصورتِ سوال فرمایا: "یہ حبل اللہ ہے؟" ـــــ یہ الفاظ نہایت برمحل تھے اور جو لوگ وہاں بیٹھے تھے، وہ اس سے بہت محظوظ ہوئے۔

الاعتصام ان دنوں ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپتا تھا۔ اُس کے مالک مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی کے بڑے بھائی مولوی محمد احمد تھے۔ اس زمانے میں ان کی داڑھی بھی چھوٹی چھوٹی تھی۔ (زندگی کے آخری دور میں کافی بڑھالی تھی) انھوں نے مولانا کو اتنی لمبی داڑھی میں دیکھا تو فریادی کی سی شکل بنا کر اور وہی لب و لہجہ اختیار کر کے کہا:

"مولانا اب ہمارا کیا بنے گا، آپ ہمارا سہارا تھے۔ جو شخص ہماری چھوٹی داڑھی پر اعتراض کرتا، ہم آپ کو بطور سند پیش کر دیتے تھے۔ اب کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور ہمارا والی وارث کون ہو گا؟"

مولانا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"ہم بہت دیر تک آپ کا سہارا بنے رہے۔ اب آپ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ جتنی مدد ممکن تھی، ہم نے کی۔ اب اللہ پر بھروسا کریں، وہی آپ کا حامی و ناصر ہو۔"

مولوی محمد احمد بھی دلچسپ آدمی تھے۔ لمبے تڑنگے، سرخ و سفید رنگ اور خوش لباس، سواری کے لیے موٹر کار جسے وہ خود چلاتے تھے۔ ان کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنا نام "محمد احمد خان" لکھتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا: "آپ ارائیں ہیں اور اپنے نام کے ساتھ لفظ "خان" لکھتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟" بولے: "کیا ارائیں کے لیے اپنے نام کے ساتھ لفظِ "خاں" لکھنا خلافِ شرع ہے؟ یہ کوئی شریعت کا حکم ہے کہ ارائیں، خان نہ کہلائیں؟ میں ارائیں برادری میں یہ جرأت پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ جس برادری یا جس قوم میں جو اچھا وصف پایا جاتا ہے یا جو اچھا لفظ وہ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں، اسے اپنا لیں۔ لفظِ "خان" مجھے پسند آیا اور میں نے اپنا لیا" ـــــ پھر ہنس کر بولے، "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا" ـــــ میں نے کہا: "بالکل ٹھیک"۔

لیکن اب معاملہ "خان" سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ حافظ عبدالقادر روپڑی کے صاحب زادوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہاشمی سید کہلاتے ہیں اور جو اُن کو ایسا نہیں کہے، اس پر خفا ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ مولانا نے داڑھی کیوں بڑھائی؟ یہ عجیب بات ہے کہ مولانا نے مسجد مبارک کے زمانۂ خطابت میں تو داڑھی نہ بڑھائی حالانکہ خطیب کے لیے اکثر اوقات ایسا کرنا ضروری ہوجاتا ہے، لیکن "الاعتصام" کے زمانۂ ادارت میں داڑھی بڑھالی، جب کہ میرے خیال میں اس کے بغیر بھی گزارہ ہوسکتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گوجرانوالہ مذہبی شہر ہے اور وہاں اہل حدیث بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں اور ان کی اکثریت "اصحاب اللّحی" یعنی داڑھیاں والوں کی ہے۔ کسی عالم دین کی چھوٹی داڑھی وہاں کے ذہنی مزاج اور ماحول سے واقعی مطابقت نہیں رکھتی۔ پھر وہاں مولانا کے استادِ محترم مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم قیام فرما تھے اور وہ تدیّن و تقویٰ اور وضع قطع میں خالص سلفی تھے، ان سے مولانا کا ہر وقت کا رابطہ تھا، وہ مولانا سے کہتے تو کچھ نہ تھے لیکن خود مولانا کو اپنی اس "کمزوری" کا احساس تھا۔ علاوہ ازیں الاعتصام میں داڑھی کی مقدار پر مضامین بھی شائع ہونے لگے تھے اور خود مولانا اسماعیل مرحوم نے بھی اس موضوع پر ایک مضمون اشاعت کے لیے دیا تھا جو مولانا ندوی نے روک لیا تھا اور وہ اس وقت شائع کیا جب انھوں نے خود اپنی داڑھی مضمون سے ہم آہنگ کرلی ــــ صحیح لفظوں میں کہنا چاہیے کہ یہ "تغیرِ احکام، تغیرِ احوال" کا نتیجہ تھا۔

مولانا ندوی کی داڑھی کی یہ کیفیت تھی کہ مولانا اسماعیل صاحب سے بھی بڑھ گئی تھی، داڑھی بھی بکھری ہوئی سی تھی اور پٹوں کا بھی یہی معاملہ تھا۔ پھر داڑھی سفید اور سر کے بال سیاہ کالے۔ ان کی داڑھی اور سر کے بکھرے ہوئے بال دیکھ کر میں نے ایک دن بے تکلفی سے کہا:

زلفیں بکھیر دے کہ زمانے کو علم ہو
ظلمت حسین تر ہے شبِ ماہتاب سے

مولانا نے شعر سن کر فرمایا، اب کیا زلفیں ہیں اور کیا ان کا بکھیرنا ہے۔ جو ہے سو

ٹھیک ہے۔

ملاقات کرنا ہمارا سید سلیمان ندوی مرحوم سے

۱۹۵۱ میں مولانا محمد اسماعیل مرحوم حجِ بیت اللہ کے لیے گئے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم بھی یہ فریضہ انجام دینے کی غرض سے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ مولانا اسماعیل مرحوم کی ملاقات ارضِ حجاز میں سید صاحب سے ہوئی۔ سید صاحب اس زمانے میں اعظم گڑھ (ہندوستان) کی سکونت ترک کر کے کراچی تشریف لے آئے تھے اور "الاعتصام" ان کی خدمت میں پہنچتا تھا۔ حج سے واپسی پر مولانا اسماعیل مرحوم نے بتایا کہ سید صاحب الاعتصام کے مضامین کی تحسین فرماتے تھے اور پوچھتے تھے کہ "حنیف صاحب مولوی ہوئے یا نہیں ہوئے؟"

اسی زمانے میں لاہور میں جامعہ اشرفیہ کا جلسہ ہوا، جس میں سید صاحب بھی مدعو تھے۔ مولانا حنیف ندوی نے سید صاحب سے ملاقات کے لیے لاہور آنے کا پروگرام بنایا تو مجھے بھی ساتھ لے آئے۔ جامعہ اشرفیہ ان دنوں نیلہ گنبد میں قائم تھا۔ ہم سید صاحب کی قیام گاہ پر گئے تو وہ مولانا سے بغل گیر ہو کر ملے۔ مولانا نے میرا تعارف بھی ان سے کرایا۔ انھوں نے خیر خیریت پوچھی اور الاعتصام کی تعریف فرمائی۔ مولانا کی داڑھی کافی بڑھی ہوئی تھی، سید صاحب دیکھ کر خوش ہوئے اور فرمایا:

"آپ تو ماشاء اللہ بالکل بدل گئے ہیں۔"

مولانا نے جواب دیا: "جی ہاں، ظواہر کی حد تک۔"

فرمایا: "ظاہر کی تبدیلی سے باطن بھی متاثر ہوتا ہے۔"

مولانا نے کہا: "خدا کرے ایسا ہو۔"

مَیں سب باتیں بیٹھا سنتا رہا۔ مَیں نے دیکھا کہ نہ سید صاحب کو مولانا سے کوئی تکلّف تھا اور نہ مولانا کو سید صاحب سے۔! دونوں حضرات صاف صاف لفظوں میں بغیر کسی ذہنی تحفظ کے بات کرتے تھے۔ ندوی حضرات کی یہ روایت چلی آرہی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے برابر کی سطح پر ملتے اور گفتگو کرتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں تکلّف سے کام نہیں لیتے۔ نہ کوئی کسی کو حضرت صاحب کہتا ہے اور نہ مولانا صاحب، نہ علامہ اور

فہامہ صاحب کہہ کر مخاطب ہوتا ہے۔ بس حنیف صاحب، رئیس صاحب، مسعود صاحب، شاہ صاحب، علی میاں صاحب کہہ کر بلانے کے عادی ہیں۔ سید سلیمان ندوی صاحب کو بھی سب ندوی "سید صاحب" کہہ کر پکارتے تھے۔ مولانا حنیف ندوی بھی ان کو سید صاحب کہتے تھے اور بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔

سید صاحب دنیائے اسلام کے بہت بڑے عالم اور محقق تھے۔ ان پر ایک دور آیا کہ وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے۔ اس سے دبستانِ ندوہ کے بعض حضرات کو اتفاق نہ تھا۔ وہ دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ ندوہ اور دار المصنفین کی ایک خاص روایت ہے کہ اس کے ارکان علم و تحقیق کے میدان میں ہمیشہ غیر جانب دار رہے ہیں۔ بیعت و ارادت سے انسان ایک خاص حلقے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ مولانا حنیف ندوی کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا۔ چنانچہ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد مولانا نے سید صاحب سے اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ اس وقت ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مولانا نے سید صاحب سے کہا:

"آپ نے سیرۃ النبی کو بہشتی زیور کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔"

سید صاحب نیچے دری پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے ان کو پہلی دفعہ دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ سر پر عمامہ اور پوری داڑھی۔ مولانا کا یہ بہت بڑا طنز انھوں نے نہایت فراخ دلی سے برداشت کیا۔ وہ ذرا سا ناک میں بولتے تھے۔ جسم کو تھوڑی سی حرکت دی اور مُسکراتے ہوئے فرمایا:

"آپ ہماری عمر کو پہنچیں گے تو آپ بھی یہی کریں گے۔"

مولانا نے جواب دیا: "میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ پر عمر کا اثر ہے۔"

سید صاحب یہ وار بھی سہہ گئے۔ ان کے چہرے پر اور مُسکراہٹ پھیل گئی اور خاموشی اختیار فرمالی۔

اسی کمرے کی دیوار پر جس میں سید صاحب کا قیام تھا، جامعہ اشرفیہ کے اُس جلسے کا اشتہار لٹک رہا تھا۔ مولانا کی اس پر نگاہ پڑی تو دیکھا کہ ہر عالم کے نام کے ساتھ "حضرت"

کا لفظ مرقوم ہے، لیکن سید صاحب مرحوم کو "مورخِ اسلام سید سلیمان ندوی" لکھا گیا ہے۔ مولانا نے کہا: "یہ اشتہار دیکھیے، اس حلقے میں آپ ہمیشہ "مورخ اسلام" ہی رہیں گے "حضرت" بننے کی خواہش پوری نہ ہوگی۔ "حضرت" وہی لوگ ہوں گے جو اس حلقے سے پہلے سے وابستہ ہیں، یہ اعزاز آپ کو نہیں ملے گا۔"

سیّد صاحب نے ہلکے سے دلآویز تبسم کے سوا اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

سید صاحب مرحوم اس وقت کے وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے بہت قریب تھے اور بعض سرکاری کمیٹیوں کے رکن بھی تھے۔ مولانا نے کہا:

"آپ کا ارکانِ حکومت سے قریبی تعلق ہے، ان سے کہیے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مخلصانہ قدم اٹھائیں اور اچھے لوگوں کو آگے لائیں۔"

سید صاحب بولے: "کس سے کہوں؟"

کہا: "لیاقت علی سے!"

فرمایا: "اچھے لوگ آپ کے خیال میں مثلاً کون ہیں؟"

جواب دیا: "مثلاً آپ ہیں۔"!

فرمایا: "میں تو نہیں ہوں۔"

مولانا نے زور دے کر کہا: "اگر آپ نہیں ہیں تو میں ہوں۔ آپ انکسار سے کام لیتے ہیں، میں تو اس کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔"

سید صاحب نے فرمایا: "میں بہت سے لوگوں سے مل کر اور ان سے بات چیت کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومتوں کی مصلحتیں کچھ اور ہوتی ہیں اور بات کرنے کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔"

مولانا نے کہا: "اگر معاملہ یہی ہے تو آپ ان کی کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں میں شامل ہو کر کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

سید صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور گفتگو کا یہ سلسلہ یہیں ختم ہو گیا۔

اس کے بعد سید صاحب نے مولانا سے پوچھا:

"پاکستان کے دینی مدارس کا کیا حال ہے؟"

مولانا نے جواب دیا: "یہاں ندوۃ العلما کی طرح کا ایک دارالعلوم قائم کرنا چاہیے جس میں ایسے اہلِ علم تیار کیے جائیں جو صاف ذہن اور بلند فکر ہوں۔ آزادی کے بعد علما کی ذمے داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ انھیں نئے حالات میں نئے عزائم کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لیں اور علما کی رہنمائی کریں۔"

یہ دلچسپ گفتگو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔

ہم سید صاحب مرحوم سے اجازت لے کر رخصت ہونے لگے تو انھوں نے ازراہِ کرم شکریہ ادا کیا، دعا دی اور مولانا کی بڑھی ہوئی داڑھی پر دوبارہ اظہارِ مسرت فرمایا:

پھر چھوٹا کرا لینا داڑھی کا اور ناکام ہو جانا تجربے کا

تقریباً ایک سال بعد مولانا نے پھر بے چاری بے زبان داڑھی کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی اور اسے دوبارہ پہلی حالت پر لے آئے، جسے وہ "مسلکِ اعتدال" سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسی نے پوچھا:

"آپ نے داڑھی بڑھالی تھی، اب پھر چھوٹی کر لی ہے۔"

فرمایا "وہ ایک تجربہ تھا جو کامیاب نہ ہو سکا۔"

واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے داڑھی پر دوبارہ "عملِ مقراض" کا سلسلہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں آنے کے بعد شروع کیا تھا۔ یعنی یہاں کے ماحول کے مطابق پھر "تغیرِ احوال" ہوا اور اس کے ساتھ ہی "تغیرِ احکام" بھی ہو گیا۔

جانا ہمارا اوڈاں والا ضلع لائل پور میں

فروری ۱۹۵۰ میں مجھے اور مولانا ندوی کو ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) کی تحصیل سمندری کے ایک گاؤں چک نمبر ۴۹۳ گ ب اوڈاں والا سے دعوت نامہ آیا۔ اس گاؤں میں ایک اچھا خاصا دارالعلوم تھا جو جماعت مجاہدین کے ایک رکن صوفی عبداللہ مرحوم نے ۱۹۳۳ میں قائم کیا تھا۔ وفات سے کئی سال قبل انھوں نے یہ دارالعلوم اوڈاں والا سے

تین میل کے فاصلے پر ماموں کانجن میں منتقل کر لیا تھا۔ تاہم یہ مدرسہ اوڈاں والا میں بھی بدستور قائم ہے۔ صوفی صاحب کا انتقال ۲۸۔ اپریل ۱۹۷۵ء (۱۳۔ ربیع الاوّل ۱۳۹۵ھ) کو ہوا۔ وہ اپنے قائم کردہ دار العلوم (ماموں کانجن) کے احاطے میں مدفون ہیں۔

صوفی صاحب مرحوم علومِ قرآن میں مولانا کی مہارت اور وسعتِ نظر کے بہت مداح تھے۔ ان کی آخر دم تک یہ خواہش رہی کہ مولانا ان کے دار العلوم میں تشریف لے آئیں اور طلبا کو صرف تفسیرِ قرآن کا درس دیں، ان کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے زیادہ مراعات دی جائیں گی۔

اس دار العلوم کے ناظم ہمارے دوست مولانا عبدالقادر ندوی ہیں جو اپنا کاروبار کرتے ہیں، اور بہت زندہ دل اور خوش مزاج آدمی ہیں۔ دار العلوم کا شاندار کتب خانہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی کو جب میں نے بتایا کہ اوڈاں والا میں بھی ایک ندوی عالم ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ وہاں پہنچے تو مولانا کو کچھ پتا نہ چلا کہ یہاں ندوی کون صاحب ہیں۔ سب دیہاتی لباس میں اور تہمند باندھے ہوئے۔ مولانا اپنے ذہن میں پاجاموں اور شیروانیوں کا تصوّر کیے بیٹھے تھے۔ فرمایا:

"مولانا عبدالقادر ندوی کہاں ہیں؟"

عرض کیا "یہی تو ہیں جو آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں اور جن کا میں نے آپ سے ابھی تعارف کرایا ہے۔"

انھیں غور سے دیکھا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آپ ندوی کم ہیں اور عبدالقادر زیادہ ہیں۔"

وہ بھی دلچسپ آدمی ہیں فوراً بولے

"ندوے سے فارغ ہو کر یہاں پہنچا تو ن، ب سے بدل گیا اور ماحول نے ندوی بدوی بنا دیا۔"

میں نے عرض کیا، "ندویت کا ایک مطلب زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی بھی ہے اور

ماشاء اللہ یہ جوہر مولانا عبدالقادر میں موجود ہے۔

عبدالقادر ندوی ہمارے ان دوستوں میں ہیں جو صرف باتیں ہی نہیں کرتے، ملنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لاہور آئیں تو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں بھی تشریف لاتے ہیں، ادارے کی کتابیں باقاعدہ خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ دارالعلوم ماموں کانجن کی لائبریری کے لیے بھی ہماری تمام مطبوعات خرید کر لے گئے ہیں۔

جانا گاؤں کی سیر کو

ایک مرتبہ مولانا اپنے عزیزوں سے ملنے ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں گئے۔ خیال یہ تھا کہ ملاقات کے بہانے گاؤں کی سیر بھی ہو جائے گی۔ چار پانچ دن کا کہہ کر گئے تھے، لیکن دوسرے دن واپس آ گئے۔ پوچھا، اتنی جلدی واپس آ گئے، خیریت تو رہی؟ فرمایا غروب آفتاب کے تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچا۔ گاؤں کے حساب سے اس وقت رات ہو چکی تھی۔ جس گھر میں مجھے جانا تھا، وہ اندر سے دروازے کو تالا لگا کر سو چکے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ دوسری دفعہ کھٹکھٹایا، پھر بھی کوئی نہیں بولا۔ تیسری مرتبہ پہلے سے زیادہ زور سے کھٹکھٹایا تو گھر کے سربراہ نے اپنے جوان بیٹوں کو جگایا اور کہا، "جاؤ کیڈلو، ایس ویلے ادھی رات باہر کون اے۔" ساتھ ہی آواز آئی:

"کون اے؟"

جواب دیا: "محمد حنیف!"

لیکن میری کمزور آواز کون سنتا تھا۔

اتنے میں ایک شخص نے اندر سے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا:

"کون اے؟"

نام بتایا تو اس نے دروازہ کھولا، اندر لے گیا، خیر خیریت پوچھی اور کھانا کھلایا۔ کھانا کھا چکے تو چائے کی طلب ہوئی۔ میزبان نے پوچھا:

"خیر تو ہے آپ چائے مانگ رہے ہیں، چائے تو بخار وغیرہ کی حالت میں پی

جاتی ہے، آپ تو ماشاء اللہ تندرست معلوم ہوتے ہیں۔ پھر اس وقت چائے پئیں گے تو رات کو نیند کیسے آئے گی؟

بہرحال ایک آدمی نے ہاتھ میں لاٹھی پکڑی اور دکان پہ چائے کی پتّی لینے گیا، لیکن دکان بند۔ بڑی مشکل سے دکان دار کو جگا کر چائے کی پتّی لائی گئی۔ چائے پک کر تیار ہوئی تو دودھ ہی دودھ۔!

صبح اُٹھے تو میزبان حوائجِ ضروریہ کے لیے کھیتوں میں لے گئے۔ چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا تو اس کام میں آنے جانے والوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ مولانا نے بتایا کہ میرے رہنما نے کماد کے ایک کھیت کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اُس میں چلے جایے، یہ باپردہ جگہ ہے۔"

اگست کا مہینہ تھا اور کماد میں تھوڑا تھوڑا پانی کھڑا تھا۔ ذرا آگے قدم رکھا تو جوتا زمین میں دھنس گیا۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کیا کریں اور کس طرح اس اہم مسئلے سے فراغت حاصل ہو۔

باہر نکلے تو سر سے پاؤں تک پسینے سے شرابور اور گھٹنوں تک کیچڑ سے لت پت۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچے اور ہاتھ پاؤں صاف کیے۔ پھر چائے کی پیالی پی، ناشتہ کیا اور صاحبِ خانہ سے اجازت لے کر وہاں سے بھاگے اور گوجرانوالے آکر دم لیا۔

فرمایا گاؤں جانے اور اس قسم کے حالات سے دوچار ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ سوچتا ہوں گاؤں کے لوگ بڑے ہی دل گردے کے مالک ہیں جو ہر روز اس آزمائش سے گزرتے ہیں۔

مطب قریب قبرستان کے

مولانا کے ایک عزیز عبدالمجید مرحوم تھے۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے اور اکثر خود ہی لطیفہ بن جاتے تھے۔ مولانا کو ازراہِ ادب "بھاجی" کہتے تھے۔ انھوں نے طب کے چند نسخے یاد کر لیے اور اپنا مطب کھول لیا۔ ان کا مطب گوجرانوالہ میں قبرستان کے بالکل قریب تھا۔ مولانا ان سے ملنے گئے تو حدودِ اربعہ دیکھ فرمایا:

"یہ بہت اچھی جگہ ہے، اِدھر مریض آیا، اُدھر آپ کی دوا سے ختم ہوا، اور اٹھا کر فوراً قبرستان پہنچا دیا۔"

۱۹۵۱ کے صوبائی انتخاب

مارچ ۱۹۵۱ میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ جو جماعتیں اس دنگل میں حصّہ لے رہی تھیں، ان میں مُسلم لیگ، جناح عوامی لیگ، آزاد پاکستان پارٹی اور جماعتِ اسلامی قابلِ ذکر ہیں۔ گوجرانوالے کی ان جماعتوں کے مقامی ارکان اور امیدوار اکثر "الاعتصام" کے دفتر تشریف لاتے اور اس موضوع پر گفتگو فرماتے جو ہمیں صبر شکر کر کے سُننا پڑتی۔

اس زمانے میں جماعتِ اسلامی نے ایک پنچایت سسٹم ایجاد فرمایا تھا اور مختلف حلقوں میں انتخاب لڑنے کے لیے اس کی پنچایت ہی لوگوں کو چُنتی تھی۔ جس شخص کو مقامی پنچایت انتخاب کے لیے نامزد کر دیتی، اسے "صالح نمائندہ" کہا جاتا تھا۔ نہ وہ امیدوار کہلا سکتا تھا اور نہ اپنے لیے ووٹ مانگ سکتا تھا، کیوں کہ یہ طریقہ اس جماعت کے نزدیک اسلام میں "ممنوع" تھا۔ اس کے لیے دوسرے لوگ بھاگ دوڑ کرتے تھے۔ وہ لوگوں سے ووٹ مانگتے تھے اور اللہ سے دعا مانگتے تھے کہ وہ اس صالح نمائندے کو کامیابی عطا فرمائے۔ ہم نے اس اندازِ سیاست کا نام "سیاسی تصوف" رکھا تھا۔

گوجرانوالہ کے شہری حلقے کے لیے مقامی جماعت اسلامی کی پنچایت کی نگاہِ انتخاب وہاں کے مشہور دیوبندی عالم مولانا محمد چراغ پر پڑی (اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، بلاشبہ وہ اس دور کے جیّد عالم اور ممتاز مدرس ہیں) وہ مولانا ندوی کے بے تکلّف دوست اور میرے کرم فرما تھے۔ ان کے حواری ان کو ہمارے دفتر لے آتے تو وہ بے چارے معصوم پردہ دار خاتون کی طرح نگاہیں نیچی کر کے چُپ چاپ بیٹھے رہتے۔ انتخاب کی باتیں کرنے اور لوگوں کے سوالات کے جواب دینے کا فریضہ وہ حضرات انجام دیتے جو انھیں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے تھے۔ یہ ایک عجیب سا منظر ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ مولانا محمد چراغ کے رفقائے کار ان کو ہمارے دفتر بٹھا کر ووٹ مانگنے چلے جاتے۔ اس وقت مولانا ندوی ان سے کہتے، سب لوگ چلے گئے ہیں، کوئی سننے اور دیکھنے والا

نہیں، اب موقع ہے باتیں بھی کر لیجیے اور ہنس بھی لیجیے۔ مولانا محمد چراغ شگفتہ مزاج عالم ہیں، وہ اس قسم کی باتوں سے محظوظ بھی ہوتے اور جو دھندا اُن سے کرایا جا رہا تھا، اس پر پریشانی کا اظہار بھی کرتے کہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انتخاب اُن کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کو دیکھ کر ترس آتا تھا اور ایسے معلوم ہوتا تھا کہ شیر پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ایک اچھے بھلے ہنستے کھیلتے آدمی کو جبراً چُپ کرا دینا واقعی بہت بڑی ستم ظریفی ہے۔

اس دور میں حسین شہید سہروردی مرحوم پاکستان جناح عوامی لیگ کے صدر تھے اور پنجاب میں انتخابی دورہ کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ گوجرانوالے بھی گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ جماعتِ اسلامی اور دوسری جماعتوں کے امیدوار جناح عوامی لیگ کے اُمیدوار کے حق میں انتخاب سے دست بردار ہو جائیں تاکہ متحد ہو کر مُسلم لیگ کے اُمیدوار کا مقابلہ کیا جائے۔ اس ضمن میں انھوں نے جماعت اسلامی کے مقامی ارکان سے بھی بات کی، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جماعتِ اسلامی کے نزدیک یہ اللہ کے دین کی خدمت تھی اور یہ خدمت صالح نمائندہ ہی انجام دے سکتا تھا اور صالح نمائندہ وہ کہلاتا تھا جسے کسی پنچایت نے نامزد کیا ہو، اور پنچایت کے نامزد نمائندے کا دست بردار ہونا ان کی شرع میں جائز نہ تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنی شرع کے مقابلے میں سہروردی یا کسی اور شخص کی بات نہیں مان سکتے تھے۔

گوجرانوالہ میں اس وقت ایک ہی اچھا ہوٹل تھا، جس کا نام تھا ویسٹ اینڈ ہوٹل۔ مَیں اور مولانا ندوی عام طور پر چار بجے کی چائے اسی ہوٹل میں پیتے تھے۔ ایک دن سہروردی مرحوم بھی اپنے مقامی اور غیر مقامی رفقا کے ساتھ وہاں آ گئے اور ہماری داڑھیاں دیکھ کر ہمارے پاس ہی آ بیٹھے۔ سہروردی صاحب نے ہمیں جماعتِ اسلامی کے آدمی سمجھا اور یہی مسئلہ چھیڑ دیا اور کہا کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے امیدوار کو ہمارے امیدوار کے حق میں بیٹھ جانا چاہیے۔ مَیں نے ان سے عرض کیا، معاف کیجیے گا، ایک تو ہمارے دین میں مصلحت نام کی کوئی شے نہیں ہے، دوسرے ہمارے آدمی کو امیدوار نہ کہیے، نمائندہ کہیے۔ اس لیے کہ اس کو اسلامی اور سیاسی اعتبار سے بہت ہی دور رس نگاہ رکھنے

والی پنچایت نامزد کرتی ہے۔ اس پر سہروردی صاحب مُسکرائے اور بات آگے چلائی۔ مولانا کو اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن انھوں نے اس اسلوب سے جماعتِ اسلامی کے حق میں دلائل دیے کہ خود جماعتِ اسلامی کے لوگ بھی نہیں دے سکے تھے۔ سہروردی صاحب جھگڑنے کے موڈ میں نہیں تھے، وہ خاموش ہو گئے۔

بات ختم ہوئی تو مولانا کے بارے میں سہروردی مرحوم سے کسی نے کہا کہ یہ تو جماعت اسلامی سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ حیران ہوئے اور کہا جماعت سے تعلق نہ ہونے کے باوجود اس کے حق میں آپ نے ایسے دلائل دیے کہ خود جماعت والے بھی نہ دے سکے تھے۔

ووٹ دینے کا وقت آیا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا:

"مولانا محمد چراغ ہمارے دوست ہیں، لیکن ہماری خواہش کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔"

پھر ہنس کر کہا

"ان کو ووٹ دینا ووٹ کا جھٹکا کرنا ہے۔"

میں نے عرض کیا، "میں اس میں ترمیم کی اجازت چاہتا ہوں۔"

فرمایا "کیا ترمیم؟"

عرض کیا، "مولانا محمد چراغ نیک اور عالم آدمی ہیں، ان کو ووٹ دینا، ووٹ کو شہید کرانا ہے، ہم اپنے ووٹ کو شہادت کا درجہ دیں گے۔"

مولانا نے ازراہِ کرم میری ترمیم منظور فرمائی اور اس کا ذکر انتخاب کے بعد مولانا محمد چراغ سے بھی کیا اور کہا "ہم نے اپنا ووٹ شہید کر دیا ہے۔"

قیام کرنا ضیاء الاسلام انصاری کا گوجرانوالہ میں

اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کے حلقہ ہائے انتخابات میں کام کرنے کے لیے کراچی اور سندھ کے مختلف شہروں سے بہت سے نوجوان کارکن پنجاب آئے تھے، ان میں سے چھ سات کارکن گوجرانوالے بھی آئے جن میں ایک ضیاء الاسلام انصاری تھے، جو اَب روزنامہ "مشرق" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

ان دنوں عربی کے مشہور ادیب مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم گوجرانوالہ میں اقامت گزیں تھے۔ وہاں انھوں نے عربی کی نشرواشاعت کے لیے " دار العروبہ " کے نام سے ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ مولانا مسعود عالم ندوی مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ میرا قیام ایک اچھی خاصی بلڈنگ میں تھا، جو چوک بیری والا میں تھی اور اس میں میرے بعض مخلص دوستوں (جناب اسماعیل ضیا اور ان کے ساتھیوں) نے ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی اور میں تنہا اس میں رہتا تھا۔ مولانا مسعود عالم ندوی کو اس کا علم تھا۔ ضیاء الاسلام انصاری اور چند اور نوجوان جماعت اسلامی کی انتخابی مہم کے سلسلے میں گوجرانوالے گئے تو مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم میرے پاس الاعتصام کے دفتر تشریف لائے اور فرمایا کہ ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں ہے، اگر ہو سکے تو چند روز کے لیے تم ان کارکنوں کو اپنے ہاں ٹھہرالو۔ چنانچہ یہ تمام نوجوان میرے پاس آ گئے۔ مجھے ان کے سیاسی رجحانات سے تو کوئی تعلق نہ تھا، لیکن پڑھنے لکھنے اور لطائف و ظرائف میں ان سے ہم آہنگی تھی۔ انتخاب کے بعد دوسرے لوگ تو چلے گئے مگر ضیاء الاسلام انصاری اتفاق سے پورے نو مہینے میرے پاس رہے۔ نو مہینے کی اس اتفاقیہ مدتِ قیام کا اب تک ضیاء صاحب کو علم ہے اور کبھی اس کا ذکر ہو تو اس پر خوش ہوتے ہیں۔ ضیاء صاحب الاعتصام میں بھی ہمیں مدد دیتے تھے۔

اس دور میں گوجرانوالہ میں چائے تلاش کرنا ایک اہم کام تھا، اس لیے کہ وہاں کے باشندوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن ضیاء صاحب اس میں بہت تیز تھے۔ انھوں نے بعض ایسے ایسے مقامات میں چائے خانوں کا سراغ لگایا کہ ہم نہیں لگا سکتے تھے۔ مگر ہم نے ضیا صاحب کو مایوس نہیں کیا، وہ جہاں ہمیں لے گئے، ہم بلا تامّل وہاں گئے۔ اس میں اپنے مقام اور مرتبے کی پروا نہیں کی۔

قیامِ گوجرانوالہ کا ذکر ضیاء الاسلام انصاری صاحب نے اپنی یادداشتوں میں بھی کیا ہے جو پروفیسر شفیق جالندھری (شعبۂ صحافت پنجاب یونیورسٹی) نے مرتب کی تھیں اور ۱۹۷۹ء کے " بادبان " (لاہور) میں شائع ہوئی تھیں۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ جس لائبریری میں میرا قیام تھا اس کے چیئرمین اسماعیل ضیاء

تھے جو ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۷ تک پنجاب اسمبلی کے رکن رہے۔ وہ اور اُن کے ساتھی (یعنی لائبریری کے منتظمین) اُس وقت بھی جماعتِ اسلامی کے مخالف تھے، اب بھی مخالف ہیں۔ خود میرا بھی یہی حال تھا، نہ میں اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کا حامی تھا، نہ اب ہوں۔ لیکن اس لائبریری کے اربابِ انتظام کی عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اشارۃً یا کنایۃً مجھے کبھی یہ نہیں کہا کہ جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کو یہاں کیوں ٹھہرا رکھا ہے۔ خود میرے دل میں بھی ایک لمحے کے لیے یہ خیال نہیں گزرا تھا کہ جو لوگ ہمارے ہم رائے نہیں ہیں ان کو یہاں قیام کی سہولت کیوں دی جائے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ ہوتا کہ اسماعیل ضیا صاحب اور ان کے رفقا ہمارے ہاں آتے اور کھلے دل سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے، سیاسیات کو بھی موضوعِ بحث ٹھہراتے اور لطائف و ظرائف میں بھی حصہ لیتے۔ ضیاء الاسلام انصاری اس زمانے میں بھی جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے کارکن کی حیثیت ہی سے گوجرانوالے گئے تھے، اب بھی وہ اسی فکر و رائے کے حامل ہیں۔ اسماعیل ضیا مسلکاً اہلِ حدیث ہیں، گوجرانوالہ میں کاروبار کرتے ہیں اور شرافت و متانت کے اعتبار سے اپنے شہر میں بہت اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ ضیاء الاسلام انصاری اور ان کے رفقا انتخابات میں جن حضرات کی حمایت کے لیے آئے تھے، یہ ان کے مخالف تھے۔ اس واقعے پر چونتیس برس گزر چکے ہیں۔ آپ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کیا کسی اور جماعت یا جماعتِ اسلامی کے ارکان اور متعلقین بھی یہ حوصلہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مخالفوں کو کسی قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں؟ مجھے تو اب اس قسم کے نہ افراد نظر آتے ہیں، نہ جماعتیں۔

پڑھنا میرا حجۃ اللہ البالغہ مولانا سے

اسی زمانے میں میں نے مولانا سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ پڑھی۔ اس کے لیے مولانا شام کے بعد دفتر تشریف لاتے اور نہایت اہتمام سے یہ کتاب پڑھاتے۔ اس کے مشکل مقامات کی اس انداز سے تشریح فرماتے کہ بغیر کسی دِقّت کے ذہن کی گرفت میں آجاتے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ دورانِ درس مجھے نیند آگئی، مولانا تقریر فرما رہے تھے اور میں سو رہا تھا۔ فرمایا:

”سو رہے ہو، سن نہیں رہے ہو؟“

میں فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ عرض کیا

"پہلے بھی سن رہا تھا، اب بھی سن رہا ہوں، بس دورانِ سبق میں نیند آگئی تھی"

فرمایا اس کی سزا یہ ہے کہ دو پیالیاں چائے لاؤ، ایک خود پیو، ایک مجھے پلاؤ۔

چنانچہ ہم نے یہ سزا بھگتی اور چائے کی دو پیالیوں پر چار آنے خرچ کیے۔

گوجرانوالہ کی محفلیں

گوجرانوالہ کے دورانِ قیام میں جن حضرات سے مولانا کے تعلقات تھے وہ میرے بھی کرم فرما تھے۔ مثلاً حضراتِ علما میں مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد چراغ، مولانا ابوالبرکات احمد، مولانا محمد اسماعیل، قاضی عبدالرحیم، مولانا نور حسین گھرجاکھی، مولانا عبدالرحیم (حسین خانوالہ) اور مولانا مسعود عالم ندوی سے صحبتیں رہتیں۔ ان بزرگوں میں سے اب صرف مولانا حافظ محمد گوندلوی[1]، مولانا محمد چراغ اور مولانا ابوالبرکات احمد اس دنیا میں موجود ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو تا دیر سلامت رکھے اور لوگ ان سے استفادہ کرتے رہیں ــــ مولانا محمد اسماعیل مرحوم، مولانا ندوی کے بھی استاد تھے اور میرے بھی استاد تھے۔ مولانا ندوی نے ان سے ۱۹۲۱ سے ۱۹۲۵ تک تحصیلِ علم کی اور اس عاجز کو اس سے تقریباً بیس سال بعد ۱۹۴۱ اور ۱۹۴۲ میں ان کے حلقۂ شاگردی میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس طرح میں اور مولانا ندوی استاد بھائی بھی ہیں ــــ مولانا حافظ محمد گوندلوی میرے استاد ہیں، مولانا نے ان سے کچھ پڑھا تو نہیں البتہ ان کے فضل و کمال اور کتابوں پر عبور و استحضار سے بہت متاثر ہیں۔

گوجرانوالہ کے دوسرے حضرات میں سے میاں غلام محمد ڈار، بابا عبداللہ اہل حدیث، چوہدری علی احمد خاں، منشی محمد یوسف، خواجہ عبدالعزیز اور بابو نصیر الدین کے نام قابلِ ذکر

---

[1] ستمبر ۱۹۸۴ میں یہ سطور لکھی گئی تھیں۔ اس وقت حضرت حافظ صاحب زندہ تھے۔ اب جون ۱۹۸۶ کو مسودہ کاتب کے حوالے کر رہا ہوں تو ان کی وفات پر پورا ایک سال گزر چکا ہے۔ ۴ جون ۱۹۸۵ کو ان کی وفات ہوئی ــــ

ہیں۔ ان میں سے اب صرف بابو نصیرالدین (اللہ ان کو خیریت سے رکھے) زندہ ہیں۔ نصیرالدین صاحب اس وقت گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ کوآپریٹو بنک کے منیجر تھے۔ یہ مولانا ندوی کے قریب کی رشتے داری میں چھوٹے بھائی ہیں۔

مرحوم غلام محمد ڈار، عجائب گھر (لاہور) کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر سیف الرحمن ڈار کے والد تھے۔ بہت سنجیدہ، صاف دل اور معاملہ فہم بزرگ تھے۔ ہمارے نہایت مخلص دوست تھے۔

منشی محمد یوسف سبزی منڈی میں آڑھتی تھے۔ چوہدری علی احمد خاں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی زمانے میں پولیس آفیسر رہے تھے اور ہوشیار پور کے باشندے تھے، آزادی کے بعد گوجرانوالے آگئے تھے۔ کمیونزم کے بارے میں ان کا اچھا خاصا مطالعہ تھا، جماعت اسلامی کے بعض پرانے حضرات نے اس موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں، وہ انھی سے معلومات حاصل کر کے لکھی ہیں۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس موضوع سے متعلق ان کی رائے مستند ہے۔ لیکن جب مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے مکان پر اس سلسلے میں ان کی گفتگو مولانا حنیف ندوی سے ہوئی تو جماعتِ اسلامی کے رکن ہونے کے باوجود وہ اپنے اس خیال سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ اس موضوع کے مختلف پیچیدہ پہلوؤں کو سمجھنے اور مخالف و موافق لوگوں کے نقطۂ نظر کو حیطۂ فہم میں لانے کے لیے اکثر مولانا کے پاس آتے۔ وہ جب ہمارے دفتر تشریف لاتے تو یہی مسئلہ شروع کر دیتے، کیوں کہ ان کا اصل موضوع یہی تھا۔ وہ بعض امور میں ذہنی اعتبار سے جماعتِ اسلامی کے اکثر دوستوں سے مختلف تھے۔ جب کوئی بات ان کی سمجھ میں آجاتی تو اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ بات سمجھنے کے لیے کرتے تھے، ہر وقت سمجھانے کے موڈ میں نہیں رہتے تھے۔

غلام محمد ڈار، بابا عبداللہ اہل حدیث، منشی محمد یوسف اور بابو نصیر الدین دس پندرہ دن بعد حلوہ پوری یا کھیر، سردیوں میں سنگترے مالٹے اور گرمیوں میں آم لے کر آجاتے اور ہم سب مل کر کھاتے اور صحت بناتے۔ مولانا محمد اسماعیل بھی اس مجلس میں شریک ہوتے۔ مولانا ندوی آم اور مالٹے میں تو شرکت کرتے، لیکن حلوہ پوری، لسی اور کھیر سے انھیں رغبت نہ تھی۔ یہ فریضہ ہم لوگ انجام دیتے۔ ان دنوں کھانے پینے میں ہم سب "آل راؤنڈر" تھے۔

گوجرانوالہ میں ان دونوں گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ نوجوانوں کا تھا، جو میرے

ہم عمر یا تھوڑے بہت بڑے چھوٹے تھے۔ ان میں اسماعیل ضیا، عزیز انصاری، خواجہ محمد یوسف، راسخ عرفانی، چوہدری محمد رمضان، عبدالعزیز اور پروفیسر معراج الدین تھے۔ (ان میں عبدالعزیز کئی سال ہوئے ایک حادثے میں وفات پا گئے ہیں، اللہ ان کی مغفرت کرے، مرحوم نہایت زندہ دل اور دوستوں کے دوست تھے) یہ حضرات متعدد مسائل میں ایک دوسرے کے ہم خیال نہ تھے، لیکن ہمارے ساتھ ان سب کے گہرے مراسم تھے جو بحمد اللہ اب تک قائم ہیں۔

گوجرانوالہ میں اُن دنوں مولانا اسماعیل مرحوم کے مدرسے کے دو طالب علم ہماری بڑی خدمت کرتے تھے۔ اب وہ ماشاء اللہ موج میں ہیں۔ ایک مولانا عطاء اللہ ثاقب جو پاکستان کے کامیاب ناشر کتب ہیں اور دوسرے پروفیسر غلام نبی عارف جو لاہور کے ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ اللہ ان کو ہمیشہ خوش رکھے۔

بیس داڑھیوں کے برابر داڑھی

یہاں ایک لطیفہ بھی سنتے جایئے۔ ایک دن مولانا حنیف ندوی، عزیز انصاری اور یہ بندۂ عاجز (تینوں) الاعتصام کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں کاموں کی گئے۔ عزیز انصاری ان دنوں چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھتے تھے (اب تو ماشاء اللہ معاملہ صاف ہے) اور میری داڑھی بھی ایسی ہی تھی (یعنی بعض علما کے نزدیک نہ ہونے کے برابر) مولانا ندوی کی داڑھی خدا جھوٹ نہ بلوائے، ہم سے کوئی بیس گنا بڑی تھی۔ ہم واپس آکر مولانا اسماعیل مرحوم کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے لگے تو انھوں نے میرے اور عزیز انصاری کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے کہا:

"ایہ گھسیاں داڑھیاں والے بھی گئے سن۔"

عزیز انصاری نے جواب دیا:

"جناب! ہم مولانا حنیف ندوی کی قیادت میں گئے تھے، جن کی داڑھی کم از کم ہمارے جیسی بیس داڑھیوں کے برابر ہے اور پھر وہاں ہمیں ایسے حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو مولانا سے بھی بازی لے گئے تھے۔"

مطمئن ہماری

گوجرانوالہ میں ہمارے ایک دوست حاجی عنایت اللہ تھے جو کاروبار کرتے تھے، اور بہت نیک، مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ وہ کبھی ہمیں دودھ پلاتے اور کبھی چائے۔

جب ملتے، یہ ضرور پوچھتے کہ "آپ کے کام کاج کا کیا حال ہے"؟ ہم جواب دیتے، "اللہ کا فضل ہے، بہت اچھا ہے" اس سے وہ خوش ہوتے اور کہتے، "تہانوں اپنے کم توں مطمنی اے نا" (یعنی آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں) یہ الفاظ وہ انتہائی مخلصانہ انداز میں کہتے۔

مولانا جب کسی کام کے لیے مجھے فرماتے تو میں کام مکمل کرنے کے بعد نعرہ لگاتا:
"کام ٹھیک ٹھاک اور مکمل ہو گیا ہے، مجھے مطمنی ہے"
مولانا جواب میں فرماتے: "بس ٹھیک ہے، اگر آپ کو مطمنی ہے تو مجھے بھی مطمنی ہے۔ اصل شے تو مطمنی ہے"

اگر ہم کسی صاحب کی موجودگی میں لفظ "مطمنی" بولتے تو وہ حیران ہوتے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں، "مطمنی" آخر کیا بلا ہے۔ لیکن ہم نے کسی کو نہیں بتایا کہ یہ گوہر نایاب ہمیں کہاں سے ملا۔ ہم نے بعض طبیبوں کی طرح اس نسخہ فرحت بخش کو اپنے سینے میں محفوظ رکھا۔ یعنی یہ "صدری نسخہ" تھا اور ہمارے نزدیک یہ بہت بڑی متاع تھی جو ہمیں ذہنی طور سے مطمئن رکھتی اور دل کو آرام پہنچاتی تھی۔

قصہ ایک حقہ توڑنے کا

ایک دن ہم نے مغرب کی نماز مولانا اسماعیل مرحوم کی جامع مسجد میں پڑھی۔ گرمیوں کا موسم تھا، نماز کے بعد اچانک ایک شور بپا ہوا۔ بات یہ تھی کہ ایک دیہاتی مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ مغرب کی اذان کی آواز اس کے کان میں پڑی۔ وہ بے چارا بازار سے نیا حقہ خرید کر لایا تھا۔ حقہ بہت اچھا تھا اور اس کے تمام اجزا الگ الگ تھے۔ اس کی قسمت نے جو چکر دیا تو اذان سن کر اس نے مسجد کا رُخ کیا، حقہ ایک کونے میں رکھا جہاں جوتے رکھے جاتے ہیں اور خود وضو کر کے جماعت میں شامل ہو گیا۔ نماز ختم ہوئی تو ایک نمازی کی نظر اس پر پڑی، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، حقہ توڑ ڈالا، اور پھر اسی پر بس نہیں کیا، اس کے ٹوٹے ہوئے اجزا مسجد کے باہر سڑک پر پھینک دیے، اور ساتھ ہی بلند آواز سے پکارنے لگا کہ اس پلید اور ناپاک شے کو کون مسجد میں لایا ہے۔ اور بھی بہت سے

نمازی اس کے ہم نوا ہو گئے۔ حقّے کا بے چارہ دیہاتی مالک یہ منظر دیکھ کر سہم گیا، وہ کانپتا ہوا اٹھا اور کہا:

”یہ حقہ میرا ہے اور بالکل نیا ہے اور مسجد کے اندر نہیں، باہر جوتوں کی جگہ پر رکھا تھا۔“

بعض نمازی اس قدر جوش میں آئے کہ اسے مارنے کو دوڑے۔

ہمیں نمازیوں کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ مولانا ندوی نے میری طرف دیکھا، مَیں نے کچھ کہنے کا اشارہ کیا تو مولانا اُٹھے اور ان لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا: ”تم اپنے کاروبار میں دن رات غلط بیانی کرتے ہو، جھوٹ بولتے ہو، گاہکوں کو دھوکا دیتے ہو، ماپ تول میں کمی بیشی کرتے ہو اور ہزاروں برائیوں کے مرتکب ہوتے ہو، تمھیں یہ حرکت کرنے کی کیسے جرأت ہوئی؟ حقہ نوشی کا جائز یا ناجائز ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک عادت ہے جو اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی۔ لیکن تم تو برملا برائیاں کرتے ہو۔“ مولانا نے کہا، ”جس کا حقہ توڑا ہے، اس سے معافی مانگو اور جو اس کا نقصان ہوا ہے وہ پورا کرو۔ تم اپنے عمل و حرکت سے نمازیوں کو مسجد میں آنے سے روکتے ہو، تمھیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔“

مرحوم غلام محمد ڈار نے بھی اپنے دھیمے مگر مؤثر لہجے میں مولانا کی تائید کی اور مولانا اسمٰعیل مرحوم نے بھی حقہ توڑنے والے اور اس کی تائید کرنے والوں کو ڈانٹا۔ بالآخر جس کا حُقّہ توڑا گیا تھا، اس کو حقّے کی قیمت دلائی گئی۔

مَیں نے مولانا کے اس کلمۂ حق بلند کرنے کی تائید کی اور پھر باہر جا کر اس خوشی میں ہم نے چائے پی۔

قصہ میری گھڑی ٹوٹنے کا ہاتھوں عزیز انصاری کے

مَیں ایک دن اپنے دفتر کے صحن میں چارپائی پر بیٹھا کام کر رہا تھا اور گھڑی کلائی سے اُتار کر چارپائی پر رکھی تھی کہ عزیز انصاری آئے اور قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے میری گھڑی اٹھالی اور اسے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے گھمانا شروع کر دیا۔ یہ حرکت مجھے عجیب سی لگی، لیکن مَیں کچھ نہ کہہ سکا۔ بولے۔

"یہ گھڑی آپ کی ہے ؟"

عرض کیا، "جی ہاں !"

کہا، "اگر آپ اجازت دیں تو میں اُسے چارپائی کے پائے پر مار کر دیکھوں کہ ٹوٹتی ہے یا نہیں ٹوٹتی ؟"

عرض کیا، "اگر آپ کے نزدیک اس کا یہی مصرف ہے اور آپ کے فہم و فراست کا یہی فیصلہ ہے کہ اس کو پائے پر مارنا ضروری ہے تو ٹھیک ہے !"

کہا، "مَیں اسے ٹیسٹ کرنا چاہتا ہوں !"

عرض کیا، "آپ گھڑی کو اس طرح ٹیسٹ کرتے ہیں" ـــــ ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے دایاں ہاتھ سر سے اوپر اٹھایا اور زور سے گھڑی پائے پر دے ماری اور پھر آناً فاناً

اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

ہم دونوں حیران کہ یہ کیا ہو گیا۔ وہ اپنی حرکت پر اور مَیں ان کی عقل پر ـــــ !

اتنے میں مولانا ندوی بھی آ گئے اور مولانا اسماعیل بھی تشریف لے آئے۔ یہ حضرات ہنس بھی رہے تھے اور تعجب بھی کر رہے تھے۔ ہنسی تو مجھے اور عزیز انصاری کو بھی آ رہی تھی، لیکن ہنسی ہنسی میں فرق تھا، ان کی ہنسی ندامت کی تھی اور میری افسوس کی۔

مولانا اسماعیل مرحوم نے فیصلہ دیا کہ عزیز انصاری مجھ کو نئی گھڑی لا کر دیں۔ مولانا حنیف ندوی نے فرمایا، دو گھڑیاں دی جائیں، ایک گھڑی کے بدلے میں اور ایک اس خوشی میں کہ عزیز انصاری کی پروازِ فہم کتنی اونچی ہے۔

گھڑی ٹوٹنے کا قصہ اور اس فیصلے کا علم ہمارے تمام حلقہ تعارف میں پھیل گیا۔ لینے دینے کا معاملہ تو ختم ہوا لیکن اس کے بعد عزیز انصاری سے ہماری دوستی ہو گئی جو اب تک قائم ہے، اور جب بھی ہماری کہیں ملاقات ہوتی ہے، مَیں گھڑی کی بات کروں یا نہ کروں، انصاری صاحب سب کو یہ قصہ تفصیل سے سناتے ہیں اور اس وقت ہم

دونوں پر جو کیفیت طاری تھی، اس کا بے تکلفی سے اظہار کرتے ہیں۔

دھوکا

مولانا نستعلیق عالم ہیں۔ وضع قطع اساتذۂ فن سے ملتی ہوئی۔ شکل و تصویر دیکھیے تو غالب، حالی، نذیر احمد اور شبلی کے مشابہ، لباس اور رہن سہن کے اعتبار سے ایک خاص تہذیب و ثقافت کے پیکر۔ زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اور اس میں گنگ و جمن کی سی روانی۔ لب و لہجہ لکھنوی، اسلوبِ کلام میٹھا اور پیارا۔ بسا اوقات لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ یوپی کے کسی علاقے اور شہر کے رہنے والے ہیں۔ بعض لوگ تو لکھنؤ کا باشندہ سمجھتے ہیں بارہا ایسا ہوا کہ مولانا کہیں بیٹھے ہیں، پنجابیوں سے اُکتایا ہوا کوئی شخص آیا، جُھک کر آداب بجالایا اور پنجابیوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔ مولانا مروت سے سنتے رہے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر ارشاد ہوا "ماشاء اللہ کس قدر مہذب ہیں آپ، یہ ہے ہماری اصل تہذیب۔ کس شہر سے تعلق ہے آپ کا؟ لکھنؤ سے ہوگا۔!"

مولانا کے بعض قریبی دوستوں کو بھی عرصے تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ دراصل کہاں کے رہنے والے ہیں۔ وہ انھیں یوپی کے باشندے سمجھتے رہے۔ چنانچہ ان کے ایک پرانے دوست مرحوم محمد رفیق ملک تھے جن سے میرے بھی گہرے مراسم تھے "ادبستان" کے نام سے لاہور میں انھوں نے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا جو اب بھی قائم ہے۔ ایک مرتبہ وہ مولانا سے ملاقات کے لیے گوجرانوالہ گئے۔ مجھ سے پوچھا،

"مولانا حنیف ندوی یوپی کے کس شہر سے تعلق رکھتے ہیں؟"

رفیق ملک مرحوم کے اس سوال سے مجھے تعجب ہوا اور کہا:

"آپ کو ان کے وطن کا علم نہیں؟"

بولے "نہیں"

مَیں نے کہا، "خالص پنجابی ہیں اور گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں"

اس پر وہ مجھ سے بھی زیادہ متعجب ہوئے اور بولے "تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے، یہ گوجرانوالہ کے نہیں ہو سکتے"

پھر پوچھا، "یہ پنجابی جانتے اور بولتے ہیں؟"
مَیں نے کہا، "ہاں! خوب جانتے ہیں اور اچھی طرح بولتے ہیں، گھر میں پنجابی بولتے ہیں"۔
رفیق ملک نے ہنس کر کہا، "جے پنجابی نے تو پھر سانوں اردو بول بول کے کیوں اوکھا کردے نے"۔

اسی طرح مولانا کے استادِ مکرم مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ "مولوی حنیف سانوں اُردو بول کنے ڈرالیندا اے"۔

مولانا پنجابی بولتے تو خوب ہیں لیکن پنجابی میں زیادہ علمی باتیں کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ ایک دفعہ گوجرانوالہ کے کچھ دوستوں نے انھیں پنجابی میں قرآنِ مجید کا درس دینے کو کہا۔ پہلے تو معذرت کی، پھر اصرار بڑھا تو قرآنِ مجید کھول کر بیٹھ گئے۔ ایک آیت پڑھی، اس کا پنجابی میں ترجمہ کیا اور پھر تفسیر بیان کرنا شروع کی۔ بڑی مشکل سے پانچ منٹ تقریر کی ہوگی کہ بولے "میرا علم مُک گیا اے، جے تسیں کہوتاں اردو چ تقریر کراں، ورنہ اینی بس"۔
میرا لب و لہجہ خالص پنجابی ہے۔ مولانا نے کئی مرتبہ فرمایا، اپنا لب و لہجہ ٹھیک کرو۔ لیکن کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک دن عرض کیا، "لب"، تو ٹھیک کرسکتا ہوں، جتنی آپ چاہیں ان پر سُرخی لگالوں گا، لیکن "لہجہ" ٹھیک کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

وابستہ ہونا ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے

مئی ۱۹۵۱ کی بات ہے، دن کے دس بجے ہوں گے، مَیں دفتر الاعتصام میں تنہا بیٹھا کام کررہا تھا کہ ایک لمبے تڑنگے آدمی آئے، جن کی داڑھی منڈی ہوئی تھی اور کھلے پائنچے کا پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ آتے ہی کہا:
"السلام علیکم"۔
مَیں نے "وعلیکم السلام" کہا اور احتراماً کھڑا ہوگیا۔ عرض کیا:
"تشریف رکھیے"۔
وہ بیٹھے نہیں، کھڑے کھڑے پوچھا

"مولانا حنیف صاحب کہاں ہیں؟"

عرض کیا، "وہ گھر پر ہیں، بس تشریف لانے ہی والے ہیں، آپ بیٹھیے۔"

وہ جلدی میں تھے، بولے "میرا نام رشید اختر ندوی ہے، لاہور سے آیا ہوں، مجھے مولانا سے ضروری کام ہے، مہربانی کرکے ان سے میرا رابطہ کرا دیجیے۔"

مَیں نے آدمی بھیجا اور تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لے آئے۔ رشید اختر صاحب نے مولانا کو بتایا، لاہور میں ایک ادارہ قائم ہوا ہے، جس کا نام ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اس کے بانی اور ڈائریکٹر ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے مقاصد بیان کیے اور بتایا کہ خلیفہ صاحب سے آپ (مولانا ندوی) کا ذکر کیا گیا تو وہ بہت متاثر ہوئے اور اب انھوں نے آپ کو یاد فرمایا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ آپ اس ادارے میں تصنیفی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد رشید اختر صاحب تو چلے گئے۔ مولانا نے مجھ سے مشورہ کیا، مَیں نے عرض کیا، آپ کو ضرور لاہور جانا چاہیے۔ چنانچہ مولانا تشریف لائے اور خلیفہ صاحب سے ابتدائی گفتگو کے بعد ۱۵ رمئی ۱۹۵۱ کو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے۔ تین سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ مولانا روزانہ گوجرانوالہ سے لاہور آتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔ کھانا ساتھ لاتے تھے۔ اس اثنا میں آٹھ دس مہینے الاعتصام کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے مولانا نے پہلی کتاب "مسئلۂ اجتہاد" لکھی جو ۱۹۵۲ میں شائع ہوئی۔ تصنیف کا زیادہ کام ادارے میں نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ گوجرانوالہ سے لاہور آنے جانے میں تقریباً چار گھنٹے صرف ہو جاتے تھے اور مصنفین کے لیے دفتر کا وقت ایک بجے تک تھا۔ تصنیفی کام رات کو گھر میں لالٹین کی روشنی میں کرتے تھے، اس لیے کہ گھر میں بجلی نہ تھی۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، الاعتصام سے مولانا کو سو روپے تنخواہ ملتی تھی اور یہ ان کی عسرت کا دور تھا۔ اس سے پہلے مسجد مبارک کی خطابت اور درس کا زمانہ اس سے بھی زیادہ تنگ دستی کا تھا۔ مسجد کی انجمن کی طرف سے جو کچھ دیا جاتا تھا، وہ عام طور پر یک مشت

نہیں ملتا تھا، کبھی دو روپے، کبھی پانچ روپے اور کبھی دس روپے۔ یعنی غریب کی چھت کی طرح ہر روز تنخواہ ٹپکتی رہتی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی ضرورت پوری نہ ہوتی تھی۔

خریدنا بھینس کا

اب ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے مولانا کو تین سو روپے تنخواہ ملتی تھی اور وہ "امیر" ہو گئے تھے۔ ادھر رمضان کا مہینہ بھی آ رہا تھا۔ مولانا نے بھینس خریدنے کا فیصلہ کیا۔ گوجرانوالہ دودھ اور لسیّوں کا شہر ہے، مولانا اس نعمت سے محروم کیوں رہتے؟

بھینس خریدنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوئی تو میں نے عرض کیا:

"حضور بھینس ضرور خرید لیے، لیکن گستاخی معاف، میراثی کی بھینس کا سا معاملہ نہ ہو۔"

فرمایا: "وہ کیا؟"

عرض کیا: "میراثی نے بھینس خرید لی اور پڑوسیوں سے کہہ دیا کہ ہم نے بھینس خریدی ہے، ہمارے ہاں لسّی لینے آیا کرو۔ اب لوگ لسّی لینے آتے ہیں، لیکن انھیں لسّی نہیں ملتی، اس لیے کہ بھینس اس انتظار میں ہے کہ میراثی چارہ ڈالے تو دودھ دوں، اور میراثی اس سوچ میں ہے کہ بھینس دودھ دے تو اُسے چارہ ڈالوں، نہ میراثی نے چارہ ڈالا، نہ بھینس نے دودھ دیا۔"

لطیفہ سن کر مولانا ہنسے اور فرمایا: "ایسا نہیں ہوگا۔"

بہرحال ہم نے چند روز لسیّاں پیں اور پھر بھینس کا وہی حال ہوا جو مولانا کے گھر میں ہونا چاہیے تھا۔

"ایک مصرع طرح پر دو شاعروں نے گرہ لگائی"

مولانا کے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں آنے کے چند ماہ بعد "الاعتصام" کی ادارت جو پہلے بے قاعدہ طور پر میرے سپرد تھی، اب باقاعدہ طور پر میرے سپرد ہوئی اور اخبار گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا۔ شیش محل روڈ پر اس کا دفتر تھا۔ مولانا بھی گوجرانوالہ سے لاہور آ گئے تھے اور مستقل طور سے یہیں اقامت اختیار کر لی تھی۔ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی بھی مولانا سے صرف ایک مہینہ بعد ۱۵ جون ۱۹۵۱ کو ادارے سے منسلک ہو گئے تھے۔

دونوں میرے کرم فرما تھے۔ بعدازاں شاہد حسین رزاقی صاحب اور رئیس احمد جعفری مرحوم بھی یہاں آگئے۔ ان سب سے میرے مراسم تھے اور کبھی کبھی مَیں ادارے آتا بھی تھا۔

ان دنوں یہاں دس بجے سے گیارہ بجے تک "باجماعت سرکاری" چائے ہوتی تھی۔ اس میں لطائفِ علمیہ بھی ہوتے تھے اور لطائفِ تصوّف بھی، تنقیدات بھی ہوتی تھیں اور مختلف واقعات بھی بیان کیے جاتے تھے۔ اُسے "خلیفہ صاحب کا دربار" کہا جاتا تھا۔

ایک دن خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے مشہور شاعر اصغر گونڈوی کے بارے میں بتایا کہ وہ جگر مراد آبادی کے اُستاد تھے۔ جس لڑکی سے جگر صاحب شادی کرنا چاہتے تھے، اُسے اصغر گونڈوی اپنے حبالۂ عقد میں لے آئے۔ ظاہر ہے اس سے جگر صاحب کو سخت ذہنی اذیت ہوئی، لیکن استاد کو کچھ نہ کہہ سکے۔ پھر جب اصغر گونڈوی کا انتقال ہوگیا تو وہ خاتون جگر صاحب کے نکاح میں آگئیں۔ خلیفہ صاحب نے یہ واقعہ سنایا تو مولانا حنیف ندوی کی رگِ ظرافت پھڑکی اور فرمایا:

"شاعری کی اصطلاح میں کہنا چاہیے کہ دو شاعروں نے ایک ہی مصرعِ طرح پر گرہ لگائی۔"

معاصر علمائے کرام کے بارے میں چند لطائف

جب کوئی لطیفہ یا برمحل بات مولانا کے ذہن میں آجائے تو اُسے روک نہیں سکتے۔ کوئی گھر کا فرد ہو، بڑا ہو، چھوٹا ہو، کوئی بھی لطیفے کی زد میں آتا اور اُن کی برجستہ گوئی کا نشانہ بنتا ہو، اس کی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ بے جھجک اور بلا تامل بات کہہ دیتے ہیں۔ پھر اس کے لیے الفاظ ایسے منتخب کرتے اور انداز ایسا اختیار فرماتے ہیں کہ خود وہ شخص بھی محظوظ ہوتا ہے جو اُن کے لطیفے کی زد میں آتا ہے اور یہی بات کہنے کا کمال ہوتا ہے۔ لطیفے کو "طنز" نہیں سمجھنا چاہیے، طنز اور لطیفے میں بہت فرق ہے۔ طنز سے قرآن وحدیث میں سختی سے روکا گیا ہے۔ "لطیفہ" لطیف پیرایۂ بیان میں اظہارِ واقعہ کا نام ہے اور ہلکا پھلکا مزاح بھی۔

ذیل میں مولانا کے چند لطائف ان کے معاصر علمائے کرام کے بارے میں بیان کیے

جاتے ہیں جن کا وہ بے حد احترام کرتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان حضرات کے باہمی تعلقات کتنے گہرے تھے اور یہ آپس میں کس درجے بے تکلف تھے۔ یبوست یا عبوست ان میں نام کو نہ تھی۔

۱۔ مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا ندوی کا بہت احترام کرتے تھے اور مولانا ندوی بھی ان سے انتہائی عقیدت سے پیش آتے تھے۔ مولانا غزنوی کہا کرتے تھے کہ میں ان سے دورانِ گفتگو یوں محسوس کرتا ہوں کہ گویا غزالی کی صحبت میں بیٹھا ہوں۔ مولانا غزنوی ایک زمانے میں داڑھی پر خضاب کرتے تھے اور مولانا ندوی ان سے بیس بائیس سال چھوٹے تھے، لیکن داڑھی سفید تھی۔ ایک دن چینیاں والی مسجد میں دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک اور صاحب آ گئے اور شریکِ گفتگو ہو گئے۔ باتوں باتوں میں ان صاحب نے مولانا ندوی سے کہا:

"آپ مولانا غزنوی سے عمر میں چھوٹے ہیں اور داڑھی سفید ہو گئی ہے، آپ بھی خضاب کر لیا کریں۔"

مولانا ندوی نے جواب دیا، "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میری بیوی کو مجھ پر اعتماد ہے۔"

اس سے خود مولانا غزنوی بھی بہت محظوظ ہوئے۔

مولانا ندوی میں یہ عجیب بات دیکھی کہ داڑھی ایک عرصے سے سفید ہے اور سر کے بال چند سال پہلے تک بالکل سیاہ تھے۔ ان کے بعض قریبی دوستوں کو بھی شبہ تھا کہ مولانا سر پر خضاب لگاتے ہیں۔ ایک دن ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے جو اُن کے بہت قریبی اور بے تکلّف دوستوں میں سے تھے، مجھ سے کہا "حنیف صاحب سر پر خضاب لگاتے ہیں، حالاں کہ داڑھی پر خضاب کرنا چاہیے۔"

سفید داڑھی سے متعلق خود مولانا کے گھر میں کئی لطیفے پیدا ہوئے اور محلے کی ان عورتوں نے جو اُن کے باہم رشتوں سے واقف نہ تھیں، بعض نازک تریں رشتوں کو بدل ڈالا اور وہ محرم کو نامحرم اور نامحرم کو محرم سمجھ بیٹھیں۔

۲۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم (گوجرانوالہ) مولانا کے استاد اور جلیل القدر عالم تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ شیروانی اور شلوار پہنے ہوئے ہیں، سر پر بہت اچھا عمامہ ہے، لیکن جوتا اس لباس کے مطابق نہیں، یا جوتا اس کے مطابق ہے مگر سر پر کپڑے کی یا ناریل کی ٹوپی رکھے ہوئے ہیں، یا تہمند باندھ کر تشریف لائے ہیں۔ ایک دن مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی کہ مولانا محی الدین احمد قصوری نے مولانا داؤد غزنوی سے کہا، "جناب صدر! اپنے ناظم اعلیٰ کی ٹوپی مبارک پر نظر ڈالیے اور تہمند بھی ملاحظہ فرمایئے۔"

مولانا غزنوی نے مولانا اسماعیل صاحب کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"میں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ آپ تہمند باندھ کر تشریف نہ لایا کریں، شلوار پہن کر آیا کریں اور یہ کہ لباس میں یکسانی ہونی چاہیے۔"

مولانا ندوی بولے: "جناب صدر! یہ "نظر وٹو" ہے جو قائم رہنا چاہیے"۔

اس پر دوسرے حضرات کے علاوہ خود مولانا اسماعیل مرحوم بھی ہنس پڑے اور فرمایا:

"واقعی "نظر وٹو" رہنا چاہیے۔"

۳۔ مولانا عطاء اللہ حنیفؒ صاحب بہت عرصہ پیشتر مولانا سید داؤد غزنوی کے دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے۔ آپ تہمند باندھتے ہیں جو قدرے چھوٹا ہوتا ہے، اس سے ان کا مطلب دراصل یہ ہوتا ہے کہ ٹخنے سنت کے مطابق ننگے رہیں۔ ایک میٹنگ میں مولانا ندوی نے مولانا غزنوی سے فرمایا:

"اپنے شیخ الحدیث سے کہیے صحیح بخاری کا کتاب اللباس پڑھیں۔ اس جملے سے مجلس میں ایک خوش گوار قہقہہ بلند ہوا۔

۴۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی بھی تھے اور رئیس احمد جعفری بھی۔ کوئی بے تکلف دوست ان سے ملاقات کو آتے تو مولانا فرماتے:

"ہم نے کبوترا اور کبوتری کی طرح جوڑا رکھا ہے، جعفر بھی اور جعفری بھی۔ آپ کو

کس کی ضرورت ہے۔"

۵۔ جعفر شاہ صاحب پھلواروی قمیص، پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے اور سر پر کالی قراقلی ٹوپی رکھتے تھے۔ لیکن شادی بیاہ کے مواقع پر میں نے دیکھا کہ انگریزی سوٹ زیب تن کر کے اور سر پہ ہیٹ رکھ کر آتے۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی صاحب زادی ڈاکٹر رفیعہ حسن کی شادی میں بھی وہ اسی لباس میں تھے۔ نکاح کا وقت ہوا تو خلیفہ صاحب نے مولانا ندوی سے کہا، "نکاح پڑھنے کے لیے کسی مولوی صاحب کو بلا لیجیے۔" مولانا ندوی شاہ صاحب کو لے گئے۔ فرمایا:

"مولوی تو ملا نہیں، پادری لے آیا ہوں۔"

شاہ صاحب کی وضع قطع، داڑھی کی تراش خراش اور رنگ روپ ایسا تھا کہ اس لباس میں واقعی پادری معلوم ہوتے تھے۔

۶۔ جعفر شاہ صاحب مرحوم کسی وقت بعض مسائل کی تعبیر میں بہت آگے نکل جاتے تھے، اسے ہم "شاہ صاحب کے اجتہادات" کہا کرتے تھے اور ان "اجتہادات" میں انھیں "انفرادیت" حاصل تھی۔ خالص فقہی زبان میں کہنا چاہیے کہ بعض مسائل میں وہ "متفرد" تھے اور ان کے "تفردات" نہایت عجیب و غریب تھے۔ ایک دن انھوں نے ایک مسئلے کی تعبیر میں کچھ ایسے ہی اجتہاد سے کام لیا تو میں نے ادب سے عرض کیا

"اس پر آپ کو دوبارہ غور فرمانا چاہیے۔"

مولانا بھی تشریف فرما تھے۔ بولے، "سیّد کے گھر کا دین ہے، یہ اس کے جس پہلو کی جو چاہے تعبیر کریں، ہم کون ہوتے ہیں، اس میں دخل دینے والے؟"

۷۔ ایک دن ہم ایک دینی مدرسے میں گئے۔ اس کے شیخ الحدیث صاحب نے ہمیں نہایت اعزاز کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ دورانِ درس میں انھوں نے ایک حدیث کا کچھ ایسا مطلب بیان کیا جو ہمارے نزدیک بالکل نیا تھا۔ ہم حیران کہ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ جب وہ فارغ ہوئے تو مولانا نے فرمایا:

"شیخ الحدیث وہ ہوتا ہے جو حدیث پڑھاتے پڑھاتے بوڑھا ہو جائے اور اُسے

حدیث پڑھانا نہ آئے۔"

۸۔ ایک مرتبہ ایک عالمِ دین کو عید ملنے گئے۔ وہ اگرچہ بہت مہمان نواز ہیں اور مولانا کا بالخصوص خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اس دن معلوم نہیں کیا بات ہوئی، نہ پانی پوچھا نہ چائے پلائی اور نہ کوئی چیز پیش کی۔ بس باتیں کرتے رہے۔ مولانا کو سخت پیاس لگی تھی۔ کافی دیر تک کوئی چیز نہ آئی تو فرمایا: "مولانا! آپ کے روزے ابھی ختم نہیں ہوئے۔"

۹۔ کئی سال پیشتر مولانا اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن تھے اور سابق چیف جسٹس مرحوم حمود الرحمٰن اس کے چیئرمین تھے۔ مولانا محمد بخش مُسلم بھی اس کونسل کے رُکن تھے۔ کوئی مسئلہ زیرِ بحث آیا تو مولانا محمد بخش مُسلم نے اُس کے متعلق اپنی رائے دی۔ مولانا حنیف ندوی نے بھی اس پر اظہارِ رائے کیا۔ چیئرمین صاحب نے مولانا سے کہا "مُسلم صاحب کی رائے آپ کی رائے کے خلاف ہے۔" مولانا نے فرمایا۔ "یہ صحیح مُسلم نہیں ہیں۔"

۱۰۔ ہمارے ایک محترم دوست پروفیسر غلام احمد حریری ہیں جو زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں شعبۂ اسلامیات کے صدر تھے۔ ایک مرتبہ فیصل آباد گئے تو حریری صاحب سے ملنے کو جی چاہا۔ متعدد مقامات پر انھیں تلاش کیا گیا مگر وہ نہ ملے۔ بالآخر یونیورسٹی میں انھیں جا پکڑا۔ انھوں نے اپنی یونیورسٹی کی سیر کرائی اور اس کے مختلف مقامات دکھائے۔ مولانا نے فرمایا "حریری کو تو ہم جانتے تھے، لیکن "مقاماتِ حریری" کا آج پتا چلا۔"

"مقاماتِ حریری" عربی ادبیات کی ایک کتاب کا نام ہے جو ابو محمد قاسم بن علی بن محمد بن عثمان حریری کی تصنیف ہے۔ مولانا نے "مقاماتِ حریری" کہہ کر اسی کتاب کی طرف اشارہ کیا تھا، جو موقع کے عین مطابق تھا۔

۱۱۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ہمارے مخلص ترین دوستوں میں سے تھے۔ ایک دن مغرب کے بعد ہم انارکلی سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے ملک صاحب مرحوم نے ہمیں دیکھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا "مَیں ایک سلسلے میں پریشان ہوں، میرے ساتھ چلیے۔"

ہم اس وقت اپنا چکر پورا کر کے نیلہ گنبد کی طرف آ رہے تھے۔ پوچھا :

"خدانخواستہ کس سلسلے میں پریشان ہیں ؟"

بولے! "ساتھ چلیں گے تو بتاؤں گا"

ہم پیچھے کو لوٹے اور وہ ہمیں جوتوں کی ایک دکان میں لے گئے۔ کہا :

"بیوی کے لیے جوتا لینا ہے۔"

کچھ جوتے نکلوائے اور فرمایا :

"بتایے کون سا جوتا لوں ؟"

اس کا جواب تو مجھے بھی سوجھا تھا، لیکن میں دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ فرض مولانا نے ادا کیا اور کہا :

"اپنا کاسۂ سر دیکھ کر لے لیجیے، بیوی کے جوتے کا اصل ناپ یہی ہے۔"

ملک صاحب چوں کہ خود بھی لطیفہ گو اور مزاح نگار تھے، اس سے انتہائی محظوظ ہوئے اور پھر یہ لطیفہ انھوں نے باقاعدہ حوالے کے ساتھ آگے چلایا۔

۱۲۔ آج کل "علاموں" کی بہت کثرت ہے۔ ہر شخص "علامہ" بنا ہوا ہے، علامہ فلاں اور علامہ فلاں۔ اسی قسم کے ایک "علامہ" کی بات ہوئی جو اذیت ناک حد بے باک ہیں، تو فرمایا، یہ ع سے نہیں الف سے "الآمہ" ہیں — یعنی بہت زیادہ تکلیف پہنچانے والے۔

۱۳۔ ایک دن ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر سراج منیر صاحب نے مولانا سے پوچھا "اگر مسجد کا امام گناہ گار ہو تو مقتدی کی نماز پر اس کا اثر پڑتا ہے یا نہیں ؟" اس وقت ایک شیعہ دوست بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا نے جواب دیا، "آئمہ معصوم ہوتے ہیں۔"

۱۴۔ ۱۹۵۷ء کے مئی میں تقریباً تمام رسائل و جرائد کے ۱۸۵۷ نمبر شائع ہوئے تھے، اور ان میں ملک کے مشہور اہلِ قلم اور اصحابِ علم نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کے مجاہدین کے حالات و سوانح تحریر کیے تھے۔ میں نے بھی اپنے اخبار "الاعتصام" کا ۱۸۵۷ نمبر شائع کیا تھا۔ میں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک سے مضامین

لینا چاہتا تھا۔ مہر صاحب سے تو وہ مضمون لے آیا۔ سالک صاحب مرحوم کے لیے میں نے مولانا ندوی سے عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم ان کے ہاں گئے تو چند اور حضرات بھی موجود تھے اور سالک صاحب پلنگ پر بیٹھے لکھ رہے تھے۔ حسبِ عادت نہایت تپاک سے ملے۔ حاضرینِ مجلس میں سے کسی صاحب نے سالک صاحب مرحوم سے کہا،

"مولانا! آپ پلنگ پر بیٹھ کر لکھتے ہیں، میز کرسی پر کیوں نہیں بیٹھتے؟"

سالک صاحب تو ابھی خاموش ہی تھے لیکن مولانا ندوی نے فوراً جواب دیا۔

"ہر کرری ایٹو کام پلنگ پر ہوتا ہے"۔

یہ جواب سالک صاحب کے ذوقِ مزاح کے عین مطابق تھا، فرمایا:

میں بھی یہی جواب دینا چاہتا تھا۔

لطیفے میں محاورے کا استعمال

مولانا ندوی بعض اوقات لطیفے میں محاورے کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے چند دوستوں کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ مولانا بیمار تھے، لیکن میری درخواست پر تشریف لے آئے۔ کھایا کچھ نہیں۔ بیٹھے باتیں کرتے رہے اور ہنستے رہے۔ آخر میں میٹھی ڈش آئی تو فرمایا:

"میں طبیعت پر جبر کر کے آپ کو کھاتے ہوئے دیکھتا رہا، یہ کیا ہے؟

عرض کیا "کھیر ہے، کھا لیجیے"۔

بولے "اچھا کھا لیتا ہوں بشرطیکہ ٹیڑھی نہ ہو"——

محاورے کا یہ برمحل استعمال لطف دے گیا۔

لطیفے میں فقہی اصطلاح

۳۰—جولائی ۱۹۸۴ کو واپڈا آڈیٹوریم میں مولانا کے ساتھ جو ایک شام منائی گئی، اس میں غلطی سے جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کو دعوتی کارڈ نہ پہنچ سکا، حالاں کہ ان کا نام مدعوین کی فہرست میں شامل تھا۔ تقریب سے دوسرے دن قاسمی صاحب ہمارے دفتر تشریف لائے اور دوستانہ شکوہ کیا۔ اس کے بعد میں اور مولانا ندوی قاسمی صاحب کے پاس گئے میں

نے عرض کیا، یہ فقہی مسئلہ ہے کہ نماز میں ترکِ واجب ہو جائے تو سجدۂ سہو لازم آتا ہے۔ آپ کو دعوت دینا واجبات میں سے تھا اور غلطی سے یہ واجب ترک ہو گیا ہے، اب "سجدۂ سہو" کے لیے آئے ہیں۔ مولانا نے فرمایا، یہ بات تو میں کرنا چاہتا تھا، جو آپ نے کر دی۔ قاسمی صاحب بولے۔ یہ آپ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

بیوی قسم کی بیگم

ایک عید کے موقع پر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے سابق فیلو جناب شاہد حسین رزاقی صاحب اپنی مرحومہ بیگم کے ساتھ جن کا نام افسر بیگم تھا، مولانا کو عید کی مبارک باد دینے گئے۔ مولانا نے رزاقی صاحب کی بیگم سے کہا، "ہماری بیگم تو بیوی قسم کی ہیں" وہ مسکرائیں اور مولانا کی اہلیہ کے پاس چلی گئیں۔ فرمایا "آپ بلائیں گی تو یہ بولیں گی ورنہ گفتگو پر خاموشی کو ترجیح دیں گی۔"

دو مسئلے

ایک دن ہمارے ایک مرحوم دوست نے مولانا سے انارکلی میں دو مسئلے پوچھے۔ ایک یہ کہ "سینما دیکھنا جائز ہے یا نہیں"؟ مولانا نے جواب دیا، "انارکلی میں گھومنا جائز ہے؟ جب کہ حدیث میں بازار کو بُری جگہ قرار دیا گیا ہے۔"

دوسرا مسئلہ جو اُن کے نزدیک بڑی "اہمیت" رکھتا تھا، یہ تھا کہ "فلم ختم ہونے کے بعد پاکستان کا ترانہ پڑھا جاتا اور جھنڈا لہرایا جاتا ہے، اس موقعے پر احتراماً کھڑا ہونا ضروری ہے۔" ساتھ ہی فرمایا، "لیکن میں کبھی کھڑا نہیں ہوا، اس لیے کہ میرے نزدیک کھڑا ہونا جائز نہیں۔"

مولانا نے جواب میں فرمایا، "آپ کے نزدیک سینما دیکھنا جائز ہے؟ اگر سینما دیکھنا جائز ہے تو ترانہ پڑھنے اور جھنڈا لہرانے کے وقت کھڑا ہونا کیوں جائز نہیں؟"

ہمارے یہ مرحوم دوست دلچسپ آدمی تھے۔ ہمارا انارکلی میں روزانہ انتظار کرتے اور ہم ان کے پاس کچھ دیر بیٹھتے۔ ایک مرتبہ چائے بھی وہاں ہوتی۔ ان کو لطیفے سننے کی عادت تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عادت بھی تھی کہ آج ایک لطیفہ ہم سے سنا اور کل وہی

لطیفہ ہمارے سامنے اپنی طرف سے دھڑلے سے بیان فرما دیا اور ہمیں " ان کا یہ لطیفہ" بڑے شوق سے سننا بھی پڑتا اور اس پر ہنسنا بھی پڑتا۔ وہ یہ بھی فرماتے "کیسا لطیفہ ہے؟" ہم جواب میں کہتے بہت اچھا ہے۔

وہ (مرحوم) ہمارے مخلص دوست تھے۔ سیاسیات، اسلامیات، تاریخ اور علما کے واقعات و لطائف وغیرہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے۔ وہ ممکن کو مُمکن، ملتوی کو مَلتوی اور مَذاق کو مِذاق کہا کرتے تھے۔

ملنا "بصیرت" پروگرام کا

لاہور میں ٹیلی ویژن سٹیشن قائم ہونے کے چند روز بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دن عشا کے قریب ہم دونوں بھائی دروازے کے باہر کھڑے تانگے کا انتظار کر رہے تھے جس میں سوار ہو کر مولانا کو اپنے گھر جانا تھا۔ اتنے میں مولانا نے مجھ سے کہا، وہ دیکھو "دارالماہی" کی چھت پر ٹیلی ویژن چل رہا ہے اور تصویریں حرکت کر رہی ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ٹیلی ویژن نہیں دیکھا تھا، بڑا حیران ہوا کہ یہ تصویریں کیوں کر بولتی اور حرکت کرتی ہیں۔ اس سے کچھ دن بعد ٹیلی ویژن والوں کی طرف سے مولانا کو "بصیرت" پروگرام کرنے کی دعوت دی گئی۔ ان دنوں سوموار کو ٹیلی ویژن میں چھٹی ہوتی تھی اور باقی چھ دنوں میں دو دن مولانا نصیر اجتہادی، دو دن مولانا کوثر نیازی اور دو دن مولانا حنیف ندوی بصیرت پروگرام کرتے تھے۔ مولانا ندوی کا پروگرام ہفتے اور اتوار کو ہوتا تھا۔ اُن دنوں کسی پروگرام کی ریکارڈنگ نہیں ہوتی تھی، ہر پروگرام ڈائریکٹ کیا جاتا تھا۔ بصیرت پروگرام کا معاوضہ اس زمانے میں اڑتالیس روپے ملتا تھا۔

مولانا ندوی نے مجھ سے کہا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس پروگرام کا جو معاوضہ ملے گا، اسے جمع کرتا جاؤں گا اور اپنی بیٹی وردہ کی شادی پر خرچ کروں گا۔ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے، خدا کرے آپ اس فیصلے پر قائم رہیں۔ وردہ کی شادی تک تقریباً چار ہزار روپے جمع ہوئے۔ شادی اتوار کے دن ہوئی تھی۔ اس دن شادی سے فارغ ہو کر مولانا ٹیلی ویژن سٹیشن گئے اور پروگرام کیا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہوا کہ اس کے بعد

انھیں کوئی پروگرام نہ ملا۔ دو تین ہفتے اسی طرح گزر گئے تو میں نے عرض کیا:

"آپ کا بصیرت پروگرام بند کیوں ہو گیا؟"

پنجابی میں جواب دیا، "ہن کسے ہور نے کڑی دا ویاہ کرنا ہووے گا۔"

مولانا کی یہ صاحب زادی اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان رہتی ہیں اور ماشاء اللہ چار پانچ بچوں کی ماں ہیں۔

پروگرام بند ہونے کی وجہ

جی چاہتا ہے مولانا کا یہ پروگرام بند ہونے کی وجہ بھی بیان کر دی جائے تاکہ یہ واقعہ بھی محفوظ ہو جائے۔

پروگرام بند ہونے کے ڈیڑھ مہینے بعد میں مولانا کوثر نیازی سے ملا اور ان سے پروگرام بند ہونے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا "مجھے کچھ پتا نہیں، میں خود حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ لاہور کے متعلقہ حلقوں سے پتا کیا ہے، لیکن کوئی واضح بات معلوم نہیں ہو سکی۔ اب اسلام آباد جاؤں گا تو اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کروں گا۔"

اس سے دس بارہ دن بعد انھوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ "آج شام چھ بجے انڈس ہوٹل آئیے اور میرے ساتھ چائے پیجیے۔"

میں وہاں پہنچا تو وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ چائے کے دوران مجھ سے پوچھا:

"دو تین مہینے پہلے مولانا نے جمعیۃ اہل حدیث کی اس کانفرنس کی صدارت کی تھی جو موچی دروازے کے باہر منعقد ہوئی تھی؟"

میں نے جواب دیا "کی تھی۔"!

کہا: "ان کی صدارت میں جو قراردادیں منظور ہوئی تھیں حکومت کے نزدیک وہ سیاسی نوعیت کی قراردادیں تھیں، اسی وجہ سے ان کا بصیرت پروگرام بند کیا گیا ہے۔"

یہ صدر ایوب خاں کا دورِ حکومت تھا، مولانا کوثر نیازی نے کہا: "یہ بات ان کو خود صدر ایوب کے دفتر سے معلوم ہوئی ہے۔"

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا ندوی کو جب جمعیۃ اہل حدیث کے بعض حضرات

نے کانفرنس کی صدارت کے لیے کہا تو مولانا نے مجھ سے مشورہ کیا کہ انھیں یہ صدارت قبول کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے؟ میں نے عرض کیا:

"بالکل نہیں کرنی چاہیے۔"

فرمایا: "کیوں؟"

عرض کیا: "اس لیے کہ علما کا ایک طبقہ بعض امور میں صدر کا حامی نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی مقرر تقریر میں بے قابو ہو جائے اور پھر اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلے۔" میں نے یہ بھی کہا کہ مقرر کی زبان صدرِ جلسہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مقرر جوش میں آتا ہے تو ہوش کھو بیٹھتا ہے اور پھر اُسے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔

بہرحال مولانا وعدہ کر چکے تھے، انھوں نے کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اس کے نتیجے میں ان کا بصیرت پرور پروگرام بند ہوا، جو لوگ اس مفید پروگرام سے مستفید ہو رہے تھے، وہ ان کے افکار سے محروم ہوئے۔ لیکن جن لوگوں کی وجہ سے یہ پروگرام بند ہوا تھا، ان کو اس کا نہ علم تھا، نہ احساس۔

پڑھی نمازِ جنازہ ہماری غیروں نے
مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

مولانا بلاشبہ عالی دماغ اور بلند فکر عالم ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ جن معاملات سے متعلق میں نے ان کی رائے کے خلاف رائے ظاہر کی اور انھوں نے نہیں مانی، اس کا نتیجہ عام طور پر وہی نکلا جو میری رائے سے ہم آہنگ تھا۔

"کھدر کی گٹھڑی میں ریشمی رومال"

تقریر، تنقید اور مناظرے میں مولانا خوب چہکتے ہیں، اور بولتے ہیں تو خوب صورت الفاظ اور ادب سے بھرپور جملے خاص تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مقابلے میں اگر کوئی کھلے دل کا آدمی ہو اور ذوقِ سلیم رکھتا ہو تو وہ بھی خوش ہوتا ہے۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں ایک مرتبہ بعض موضوعات پر مختلف اہلِ علم کے لیکچروں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مولانا ان دنوں بیمار تھے، لیکن اس کے باوجود لیکچروں میں شامل

ہوتے اور دوائیں ساتھ لے کر آتے۔ ایک موضوع مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو بھی دیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم اپنے رفقائے جماعت کے ساتھ تشریف لائے اور تقریر کی۔ لیکن بعض حضرات نے ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ اختلاف کرنے والوں میں مولانا محمد حنیف ندوی بھی تھے۔ مولانا ندوی بیمار تھے، مگر زیرِ بحث موضوع سے متعلق اتنی مدلّل تقریر کی کہ خود مولانا مودودی مرحوم نے اس کا اعتراف کیا اور فرمایا کہ مولانا ندوی میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مجھے فلسفے کے دقیق مباحث میں الجھا رہے ہیں۔

جلسہ ختم ہوا تو مولانا مودودی واپس جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھے اور بھی کئی لوگ ان کے ساتھ تھے۔ اتنے میں ان کی نظر مولانا ندوی پر پڑی، جلدی سے نیچے اترے اور مولانا کے پاس آئے۔ فرمایا:

"آپ تشریف لے جانا چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ چلیے۔"

مولانا ندوی نے کہا: "آپ کے ساتھ تو بہت سے لوگ ہیں، میرے لیے کہاں گنجائش ہوگی؟"

مولانا مودودی نے فرمایا: "کھدر کی گٹھڑی میں ریشمی رومال کے لیے ہر وقت گنجائش رہتی ہے۔"

مولانا مودودی مرحوم سے مجھے بھی چند لطیفے سننے کا موقع ملا ہے۔ مثلاً کوئی پنجابی دودھ والا آیا، دھوبی آیا، یا کوئی دکان دار آیا۔ مولانا کو اس نے کس طرح خطاب کیا اور اپنی ضرورت جن الفاظ میں بیان کی ان میں پنجابی کے لفظ کون سے تھے اور اردو کے کون سے۔! پھر ان الفاظ میں اپنی ضرورت کا اظہار کس لب و لہجے اور اسلوب میں کیا۔ مولانا نے اس کو کیا جواب دیا اور اس نے کیا اثر لیا۔ اس قسم کے لطیفے مولانا مودودی مرحوم نے ایک یا دو مرتبہ بڑا لطف لے کر بیان کیے۔ بعض واقعات کے سلسلے میں خود اُن کا اسلوبِ بیان بھی لطیفے کے قالب میں ڈھل جاتا تھا۔

یہاں ان کا ایک لطیفہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جن صاحب کے بارے میں لطیفہ بیان ہوا ہے، ان کی ذہنی کیفیت کی پوری تفصیل اس میں موجود ہے ــــ کئی سال کی بات ہے

ضلع فیصل آباد کی جماعتِ اسلامی کے ایک رکن جو میرے دوست ہیں، تشریف لائے۔ مَیں نے ان سے کہا:

"لاہور کب آئے؟"

بولے: "جماعتِ اسلامی کی میٹنگ تھی، اس میں شرکت کے لیے کل آیا تھا اور تم سے ملے بغیر جانا ممکن نہ تھا۔"

مَیں نے شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے۔ "ایک لطیفہ سنو جو تمھیں سنانا ضروری ہے۔"

مَیں نے کہا "ضرور سنایے، لطیفہ سننا اور سنانا ہمارا پیشہ ہے۔"

بولے "کل مولانا مودودی صاحب کی صدارت میں ہماری میٹنگ ہو رہی تھی کہ میاں طفیل محمد صاحب کسی کام کے سلسلے میں چند منٹ کے لیے میٹنگ سے اُٹھ کر باہر گئے۔ مولانا نے حاضرین سے فرمایا:

"جو صاحب ہنسنا چاہتے ہیں ہنس لیں، پھر میاں صاحب آجائیں گے اور ہنسی کا دروازہ بند ہو جائے گا۔"

ماسٹر طالع محمد کا خطبہ

مولانا ندوی کے ملنے والوں میں ایک صاحب ماسٹر طالع محمد تھے۔ وہ عام طور پر مسجد مبارک میں جمعہ پڑھتے تھے اور مولانا کے مقتدی تھے۔ اب عرصے سے ان کے دیدار نہیں ہوئے۔ معلوم نہیں کس حال میں ہیں۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ انھیں خوش رکھے اور سفرِ آخرت اختیار کر گئے ہیں تو خدا اُن کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

وہ کسی مجلس میں ہوں، مسلسل باتیں کرتے جاتے تھے۔ وہ شنید کے قائل نہ تھے، گفت کے عادی تھے۔ جو شخص ان کے اڑنگے میں آجاتا، اُسے آسانی سے چھوڑتے نہیں تھے۔ ایک مرتبہ مسجدِ مبارک میں نمازِ جمعہ کے بعد سیّد محمد طلحہ مرحوم ان کے قابو میں آ گئے۔ سید محمد طلحہ اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور نہایت متین اور کم گو تھے۔ ہندوستان کے مشہور عالم و مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اقربا میں سے تھے، غالباً ان کے خالو ہوتے تھے۔ وہ نمازِ جمعہ مسجدِ مبارک میں ادا فرماتے تھے۔

ایک دن نماز جمعہ کے بعد ماسٹر جی کی نظر جواُن پر پڑی تو انھیں جا پکڑا۔ اب ماسٹر جی لہر میں آکر بول رہے ہیں اور سید طلحہ قہر درویش برجانِ درویش سن رہے ہیں۔ کہیں کاما اور کہیں فل سٹاپ نہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے عصر کی اذان ہوگئی۔ عصر کے بعد سید طلحہ مرحوم جوتا پکڑ کر مسجد سے باہر نکلنے لگے تو ماسٹر جی نے پھر آگھیرا اور ان کے ساتھ ہی چل پڑے۔ سید صاحب مرحوم بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ماسٹر جی نے فرمایا: "چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔" چلتے چلتے بھاٹی دروازے آ گئے۔ سید صاحب وہاں آکر رُک گئے کہ یہ جائیں تو وہ گھر کا رُخ کریں۔ لیکن ماسٹر جی کی رام کہانی ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ اب ماسٹر جی نے کہا، "چلیے میں آپ کا گھر دیکھ آؤں۔" بڑی مشکل سے چھ سات بجے سید صاحب کی جان بخشی ہوئی۔

اس کے بعد سید طلحہ مرحوم جمعے کے لیے مسجد مبارک نہیں گئے۔ کسی نے پوچھا، "آپ مسجد مبارک کیوں نہیں جاتے؟" فرمایا "وہاں ماسٹر طالع محمد کا پھیرا ہے۔"

ان ہی ماسٹر طالع محمد کے ہتھے ایک دن میں اور مولانا بھی چڑھ گئے۔ ہوا یہ کہ ہم دفتر سے نکلے اور بس سٹاپ پر پہنچے۔ جمعے کا دن تھا۔ اتفاق سے ماسٹر طالع محمد بھی وہاں آگئے۔ انھوں نے جو باتیں کرنا شروع کیں، ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ایک بس آئی اور نکل گئی، دوسری آئی وہ بھی نکل گئی۔ تیسری بھی چلتی بنی۔ مولانا بھی پریشان اور میں بھی حیران۔ لیکن ماسٹر جی کو اس کا کچھ احساس نہیں ہے، وہ اپنی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ گھر جا کر روٹی بھی کھانی تھی اور پھر جمعہ بھی پڑھنا تھا۔ میں نے مولانا سے عرض کیا:

"جمعے کا دن ہے اور جمعہ پڑھنا ہے، اب چلنا چاہیے۔"

فرمایا "خطبہ ماسٹر جی کا سُن لیا ہے، اب دو رکعتیں پڑھنی ہیں، کہیں جا کر پڑھ لیں گے۔"

مولانا اس قسم کے لوگوں کو "سریش" سے تعبیر کرتے ہیں، جو انسان کو چپک جاتے ہیں۔ ان کی "سریشیت" اور "چپکیت" کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس انگلی سے اُتاریں تو اس سے چپک جائیں گے اور اس سے اتاریں تو اس سے چپک جائیں گے۔

قصہ ایک ڈاکٹر صاحب کا

ایک دن لاہور کے ایک بہت بڑے کالج کے ایک پروفیسر صاحب ہمارے دفتر

تشریف لائے۔ خیر سے وہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں اور اپنے شعبے کے صدر رہ چکے ہیں۔ اب ریٹائر ہوگئے ہیں۔ انھوں نے نیاز مندانہ انداز میں مولانا سے سلسلۂ گفتگو شروع کیا اور فرمایا:

"مولانا! ماشاء اللہ آپ ندوی ہیں؟"

جواب دیا: "جی ہاں!"

"سید سلیمان بھی ندوی تھے؟"

"جی ہاں۔!"

"جعفر شاہ پھلواروی بھی ندوی تھے؟"

"جی ہاں!"

"رئیس احمد جعفری بھی ندوی تھے۔؟"

"جی ہاں!"

"سید ابوالحسن علی بھی ندوی ہیں؟"

"جی ہاں، وہ بھی ندوی ہیں"

چند اور ندوی حضرات کے بارے میں دریافت فرمایا، مولانا نے "جی ہاں" کہہ کر جواب دیا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا: "ماشاء اللہ یہ خاندان کتنا خوش قسمت ہے کہ اس کا ہر فرد پڑھا لکھا اور بے حد لائق ہے۔ برّصغیر کا کوئی خاندان علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف میں اس خاندان کا مقابلہ نہیں کر سکتا"

ان ہی ڈاکٹر صاحب کا ایک اور لطیفہ سنیے جو مولانا سے نہیں اس بندۂ عاجز سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک دن میں ویگن میں سوار تھا اور دفتر جا رہا تھا کہ ایک سٹاپ سے یہ ڈاکٹر صاحب بھی میرے پاس ہی آکر تشریف فرما ہوگئے ——— کہا

"السلام علیکم"

عرض کیا "وعلیکم السلام"

فرمایا، "آپ نے "فقہائے ہند" کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ بہت سے معلومات پر مشتمل ہے۔ اردو میں اس قسم کی کوئی کتاب نہ تھی۔ یہ ایک تحقیقی کام ہے۔"

میں نے اس حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کیا۔

فرمایا: "آپ کا اسمِ گرامی؟"

عرض کیا "محمد اسحاق بھٹی۔"

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ فقہائے ہند کی اب تک کتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔"

عرض کیا، "نو جلدیں۔"

ارشاد ہوا، "یہ سلسلہ جاری رکھیے گا، اب تک جتنے فقہائے کرام پاک و ہند میں پیدا ہوئے ہیں، سب کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ اس کا اسلوبِ تحریر بہت اچھا اور بہت موثر ہے"۔۔۔۔۔ "اسم گرامی؟"

پھر اپنا نام عرض کیا۔

فرمایا۔ "المعارف کے ایڈیٹر بھی تو آپ ہی ہیں، میں "المعارف" باقاعدہ پڑھتا ہوں، اس میں بہت علمی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ میں بھی آپ کو مضمون بھیجا کروں گا"۔۔۔۔۔ "اسم گرامی؟"

یہ دلچسپ باتیں سن کر ارد گرد بیٹھے ہوئے بعض لوگ مسکرانے لگے۔ ایک صاحب تو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اتنے میں ان کا کالج آگیا اور وہ ویگن سے اتر گئے۔ دس منٹ کی اس رفاقت میں انھوں نے ہماری بہت تعریف کی اور ساتھ ہی تین بار ہمارا "اسمِ گرامی" دریافت فرمایا۔

قصہ ایک وکیل صاحب کا

اسی طرح کا قصہ ایک وکیل صاحب کا سنیے جس میں مولانا نے خاص طور پر مجھے شامل کیا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم کی وفات کے بعد ایک صاحب نے جو وکیل بھی تھے اور اردو اور انگریزی کے رسائل و جرائد میں ماشاء اللہ مضامین بھی لکھتے تھے، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی ڈائریکٹرشپ کے لیے درخواست لکھی اور مرحوم جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب کو اُن کے مکان پر دستی دے کر آئے۔ اس کے بعد ہمارے دفتر تشریف لائے اور فرمایا:

"میں آپ کے ادارے کا ڈائریکٹر مقرر ہو جاؤں گا، اس لیے کہ میں اردو اور انگریزی میں مضمون بھی لکھتا ہوں اور وکیل کی حیثیت سے ایس۔اے رحمٰن صاحب کی عدالت میں پیش بھی ہوتا رہا ہوں۔ انھیں میری صلاحیتوں کا علم ہے اور چونکہ وہ جج ہیں، اس لیے وکیل کو دوسرے لوگوں پر ترجیح دیں گے"۔ پھر فرمایا:

دیکھیے جناب! مجھے ڈائریکٹر بننے کی نہ خواہش ہے، نہ شوق۔ میری آمدنی اللہ کے فضل سے کافی ہے، میں نے تو "اتمامِ حجت" کے لیے درخواست دی ہے —— اس موقعے پر "اتمام حجت" کا لفظ سن کر مولانا نے ان سے پنجابی میں کہا: "ستّے خیراں نے، تسیں ضرور ساڈے ڈائریکٹر ہو جاؤ گے۔ تہاڈی قابلیت دے آدمی دی سانوں بہت ضرورت اے"۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر مولانا نے کہا: "کیوں مولوی اسحاق! انھاں نوں ساڈا ڈائریکٹر بن جانا چاہیدا اے نا"۔ میں نے عرض کیا "ضرور بن جانا چاہیدا اے، بورڈ دے ممبر درخواست منظور کرن یا نہ کرن، میری رائے ایہ اے کہ ایہ ایتھے آکے ڈائریکٹر بن کے بہہ جان"۔

اس کے بعد اسی مجلس میں کسی اور صاحب کے بارے میں کوئی بات ہوئی تو یہی وکیل صاحب بولے: "ان کے کیا کہنے جی، وہ بہت فارسی وان ہیں"—— مولانا "فارسی وان" کے لفظ پر مسکرائے اور فرمایا: "حضور! آپ ضرور یہاں آجائیں، یہاں جائے اُستاد خالیست والا معاملہ ہے"۔

وکیل صاحب مولانا کی حوصلہ افزائی سے خوش ہوئے، ان کا شکریہ ادا کیا اور کئی روز متواتر تشریف لاتے اور اپنے علمی کارناموں کی تفصیلات بیان فرماتے رہے۔

لطیفے میں توارد

بعض دفعہ لطیفے میں "توارد" ہو جاتا ہے، یعنی ایک ہی لطیفہ مجھے بھی سوجھا اور مولانا کو بھی ——! اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ۱۹۶۷ میں پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے لیے "ارمغانِ حالی" کے نام سے کتاب لکھ رہے تھے۔ مولانا حالی نے "الکاسب حبیب اللہ" کے الفاظ کے بارے میں لکھا ہے

ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ حمید احمد خاں مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں؟ مولانا بھی موجود تھے۔ حمید احمد خاں مرحوم کی اس کتاب کے کاتب کا نام اتفاق سے حبیب اللہ تھا۔ میں نے عرض کیا، "الکاسب حبیب اللہ" تو صحیح نہیں، البتہ "الکاتب حبیب اللہ" بالکل صحیح ہے۔

مولانا نے فرمایا: یہی لطیفہ مجھے سوجھا تھا۔ خاں صاحب نے لقمہ دیا، "لطیفے میں توارد ہو گیا ہے۔"

تاریخ سے عدم دلچسپی

مولانا کو علم تاریخ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ تاریخ سے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ ہر دور میں اپنی مصلحتوں کے مطابق بنائی جاتی ہے۔ اس کی وہ مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن مولانا کا یہ نقطۂ نظر تاریخ کے ہر مسئلے کے متعلق صحیح نہیں ہے۔

قلمی کتابیں

اسی طرح پرانی قلمی کتابوں سے بھی مولانا کو رغبت نہیں ہے بلکہ ان پر کام کرنے والوں کا بعض اوقات مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ کتابیں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتیں تو اب تک چھپ جاتیں، قلمی صورت میں باقی نہ رہتیں۔

۱۹۷۲-۷۱ کی بات ہے کہ میں "برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ" کے نام سے کتاب لکھ رہا تھا۔ یہ کتاب علمِ فقہ کی بعض ان مشہور کتابوں کے تعارف اور تجزیے پر مشتمل ہے جو برصغیر پاک و ہند میں لکھی گئیں اور قلمی یا مطبوعہ شکل میں مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں میرا زیادہ وقت پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور لاہور کی بعض دوسری لائبریریوں میں صرف ہوتا تھا۔ میں دفتر آتا تو مولانا جعفر شاہ پھلواروی مرحوم اور مولانا حنیف ندوی از راہِ مذاق مجھ سے پوچھتے، آج کتنی قلمی کتابوں کی گرد جھاڑی؟ کتنی کتابوں کے سوراخ گنے؟ کتنی کتابوں کے پھٹے ہوئے اور بوسیدہ اوراق کا شمار کیا؟ کتنے مخطوطے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا؟ ایک دن میں نے کہا کہ یہ مخطوطات کیا ہیں، "مخبوطات" ہیں۔ اور پھر لفظ "مخطوطہ" کو "مخبوطہ" میں بدل دیا گیا۔ مثلاً کون کون سا "مخبوطہ" دیکھا اور مخبوط الحواس ہوئے۔

لفظ "مخبوطہ" میری زبان پر بھی چڑھ گیا۔ اس زمانے میں ہمارے ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام تھے۔ انہی نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا اور یہ ان کی دلچسپی کا موضوع تھا۔ ایک دن میں اُن کے پاس بیٹھا مخطوطات کی ورق گردانی کے سلسلے میں اپنی "فتوحات" بیان کر رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر میرے منہ سے "مخطوطہ" کی بجائے "مخبوطہ" نکل گیا۔ اس غلطی کا مجھے فوراً احساس ہو گیا اور اکرام صاحب بھی چونکے۔ پھر ہنسے اور بولے "آپ نے بالکل صحیح کہا، یہ "مخبوطہ" ہی ہے اور انسان ان کو دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے واقعی مخبوط الحواس ہو جاتا ہے"۔ یہ لطیفہ میں نے مولانا کو اور شاہ صاحب کو سنایا اور اس کے بعد باقاعدہ "مخبوطہ" چل نکلا۔

جب میری یہ کتاب "برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ" چھپ کر آئی تو مولانا نہایت خوش ہوئے، مجھے مبارک باد سے نوازا اور کندھے پر ہاتھ پھیر کر "اشیرباد دی" اور فرمایا "ہم تو آپ کا مذاق اڑاتے تھے، یہ تو بہت عمدہ کتاب ہو گئی ہے"۔ میں نے عرض کیا، پنجابی محاورے کے مطابق "ہاسے دا منڈا سا" ہو گیا ہے۔ فرمایا، بالکل ایسا ہی ہوا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولانا قلمی کتابوں کو اگرچہ زیادہ اہمیت نہیں دیتے، لیکن اگر سلیقے سے ان پر کام کیا جائے تو مسرت کا اظہار فرماتے ہیں۔

ایک پادری صاحب کا واقعہ

بعض مسائل میں مولانا انتہائی متشدد ہیں اور یہ تشدد بالکل صحیح ہے۔ مثلاً مسئلہ توحید کے بارے میں اُن کے احساسات نہایت نازک ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے اپنی بعض کتابوں میں تفصیل سے لکھا ہے اور بہ اسلوبِ جدید لکھا ہے۔ یہ ان کا ایسا موضوع ہے، جس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ قابلِ بیان ہے۔ ۱۹۸۱ میں مولانا سخت بیمار پڑ گئے بہت علاج کرائے مگر افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر بعض دوستوں کے مشورے سے یو، سی، ایچ (یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال) لاہور میں داخل ہو گئے۔ میں دوسرے یا تیسرے دن مزاج پرسی کو جاتا، ایک دن ہسپتال کے پادری صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے مولانا سے خیریت پوچھی تو آپ نے فرمایا، "دعا کریں"۔ دعا کی درخواست ایک عام سی بات ہے اور مریض ہر عیادت

کرنے والے سے کرتا ہے، لیکن پادری صاحب نے اس کو واقعی "درخواست" پر محمول کیا اور ہاتھ اٹھا کر اپنے خاص الفاظ میں دعا فرمانا شروع کر دی ۔" اے خداوند یسوع مسیح اس مریض کو . . . " پادری صاحب ابھی دعائیہ جملہ مکمل نہیں کر پائے تھے کہ مولانا بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا، " بس اس سے آگے کچھ نہ کہیے گا۔ میں ایسی دُعا نہیں کرانا چاہتا جس میں غیر اللہ کو پکارا جائے "۔

پادری صاحب نے جواب دیا "خداوند اور یسوع مسیح تو ایک ہی ہیں "۔

فرمایا "آپ انھیں ایک سمجھتے رہیے، میرے لیے اُن کے دروازے پر دستک نہ دیجیے۔ میں اس زندگی پر جو غیر اللہ سے مانگی جائے، اس موت کو ترجیح دیتا ہوں جو اللہ کو پکارتے ہوئے آئے۔ تمام عمر سب کچھ اللہ سے مانگا، اس عمر میں یسوع مسیح سے مانگنے لگوں، یہ ممکن نہیں "۔

پادری صاحب نے تثلیث کے بارے میں مولانا سے کچھ کہنا چاہا تو فرمایا:

" میں یہ سب باتیں جانتا ہوں اور آپ سے زیادہ جانتا ہوں، مجھے سمجھانے کی تکلیف نہ کریں، افسوس ہے بیماری کی وجہ سے زیادہ بول نہیں سکتا، ورنہ اثباتِ توحید اور تردید تثلیث پر ضرور گفت گو کرتا۔"

پادری صاحب خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد وہ آتے اور سلام تو کرتے رہے لیکن اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی۔

تفسیر "ترجمان القرآن" کی تیسری جلد

مولانا کی فراوانی علم اور وسعتِ معلومات کا ان سے ملنے والے تمام اصحابِ علم کو اعتراف ہے۔ جن حضرات کو ان کے درسِ قرآن میں شرکت کے مواقع میسر آئے ہیں، وہ ان کی قرآن فہمی اور علومِ قرآن سے ان کے گہرے شغف و تعلق سے خوب آگاہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ مولانا تمام امور سے منقطع ہو کر اپنے آپ کو خدمتِ قرآن کے لیے وقف کر دیں۔ اس کا اظہار مجھ سے بھی اور خود مولانا سے بھی متعدد حضرات نے کئی مرتبہ کیا۔ مولانا کے دوستوں میں سے اکثر بزرگ میرے اور مولانا کے باہمی تعلقات سے باخبر ہیں، اس لیے زیادہ تر مجھ

ہی سے کہتے ہیں کہ مَیں مولانا سے تفسیرِ قرآن کی خدمت انجام دینے کے لیے عرض کروں۔

ہمارے ایک بزرگ اور مشفق دوست ملک حسن علی جامعی ہیں جو شرق پور میں اقامت گزیں ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ دہلی کے فارغ التحصیل ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ نئے دور کے احباب سے ان کا تعارف اس طرح کرایا جائے گا کہ وہ جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک اور میو ہسپتال (لاہور) کے مشہور ڈاکٹر پروفیسر محمود علی ملک کے والدِ محترم ہیں۔ پہلے بیٹوں کا تعارف باپ کے نام سے کرایا جاتا تھا، اب باپ کا تعارف بیٹوں کے نام سے کرایا جا رہا ہے۔ مَیں ملک صاحب سے کہا کرتا ہوں، آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے دونوں بیٹے ڈاکٹر ہیں، ایک علم کا ڈاکٹر اور ایک جسم کا۔ علم اور جسم کا آپس میں گہرا تعلق ہے جو آپ نے اپنے گھر میں قائم کر رکھا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا، مَیں ملک صاحب سے ملاقات کے لیے شرق پور گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے، حسبِ عادت بڑی خاطر مدارات کی اور فرمایا:

"مَیں تمھیں کئی دنوں سے بہت یاد کر رہا تھا۔"

عرض کیا "کوئی خاص بات تھی"؟

بولے "ہاں، خاص بات تھی"۔

فرمایا "ہماری علمی تاریخ میں متعدد ایسے اہلِ علم گزرے ہیں جنھوں نے کوئی تصنیفی کام شروع کیا، لیکن کسی وجہ سے اسے مکمل نہ کر سکے اور وفات پا گئے۔ ان کا یہ نامکمل کام ان کے کسی لائق شاگرد یا کسی اور لائق عالم نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض حضرات کے مکمل کام پر ذیول لکھی گئیں اور اس طرح اسے آگے بڑھایا گیا۔"

اس کے بعد ملک صاحب نے کہا، یہ تمہید مَیں نے یہ کہنے کے لیے باندھی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے تفسیر ترجمان القرآن کے دو حصے لکھے جو سورۂ مومنون[1] تک تقریباً ساڑھے

---

[1] چند برس پیشتر آزاد ساہتیہ اکیڈمی دہلی سے ترجمان القرآن کی جو دوسری جلد شائع ہوئی ہے، اس میں سورہ نور بھی شامل ہے۔ سورہ نور کا مسودہ مولانا کی وفات کے بعد ان کے کاغذات سے ملا ہے جو شاملِ اشاعت کر دیا گیا ہے۔

سترہ پاروں پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد کسی وجہ سے آگے کام نہ ہوسکا یا ہوا تو چھپ نہ سکا اور ضائع ہوگیا۔ اب سورۂ نور سے آخر قرآن تک تفسیر لکھنی چاہیے اور میرے نزدیک اس کے لیے موزوں ترین آدمی مولانا حنیف ندوی ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی عالم یہ کام نہیں کرسکتا۔ انھیں تمام علمی کام چھوڑ کر یہ کام کرنا چاہیے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے کرنا چاہیے۔

ملک صاحب نے کہا کہ یہ بات بہت دنوں سے میرے ذہن میں گھوم رہی ہے اور میں چاہتا تھا کہ تم سے ملاقات ہو تو اس کا ذکر کروں اور کہوں کہ مولانا کو تفسیر ترجمان القرآن کی تکمیل پر آمادہ کرو۔

ملک صاحب کے توجہ دلانے پر یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی اور آتے ہی مولانا کے گوش گزار کی اور ملک صاحب کی تجویز کی تائید بھی کی۔ اس کے بعد بعض حضرات کی معرفت ملک صاحب کے پیغام بھی آئے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اپنے طور پر مجھے یہ بات کہی لیکن مولانا نے فرمایا، ایک تو اس بہت بڑے کام کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے، دوسرے سورۂ نور اور اس کے بعد کی سورتوں کے مسائل خاص اہمیت کے حامل ہیں، معلوم نہیں مولانا آزاد کے ذہن میں کیا باتیں تھیں اور وہ کس طرح ان مسائل کی توضیح وتبیین سے عہدہ برآ ہونا چاہتے تھے۔

قصہ میرے فلسفہ پڑھنے کا

ان سطور کے راقم عاجز کو مولانا نے بہت کچھ سکھایا اور اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ تاہم مجھے اپنی کم فہمی کا اعتراف ہے کہ بعض چیزیں بالکل نہیں سیکھ سکا، حالاں کہ مولانا نے سکھانے کی انتہائی کوشش کی، مثلاً علم فلسفہ۔ افسوس ہے، میں یہ علم نہ سیکھ سکا۔ مولانا فلسفی ہیں، بارہا فرمایا کہ تھوڑا بہت فلسفہ پڑھ لو، یہ علم بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ اس سے فکر میں وسعت پیدا ہوتی ہے، ذہن میں توانائی آتی ہے، سوچ بچار کی نئی نئی راہیں انسان کے سامنے کھلتی ہیں، قول وفعل میں اعتماد پیدا ہوتا ہے، نظروبصر کے زاویے بدلتے ہیں، فہم وفراست آسودگی سے ہم کنار ہوتے ہیں، وساوس واوہام

کافور ہو جاتے اور شکوک و شبہات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور انسان یقین بلکہ حق الیقین کی منزل کو پا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مولانا نے کئی بار علمِ فلسفہ کے یہ اور اس قسم کے اور بہت سے فوائد بیان فرمائے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑے فوائد ہیں اور ان کے حصول کے لیے کوشاں ہونا ہر شخص کا فرض ہے۔ چنانچہ ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ فلسفہ ضرور پڑھوں گا اور ان فوائد سے بہرہ مند ہونے کی بہر حال کوشش کروں گا۔ عرض کیا۔

"فرمایے، فلسفہ سیکھنے کے لیے کون کون سی کتابیں پڑھی جائیں۔"

میرے اس حتمی فیصلے سے مولانا خوش ہوئے۔ مجھے خاص طور سے چائے پلائی اور ازراہِ شفقت پڑھنے کے لیے کچھ کتابیں بتائیں، اور پھر میں نے اپنے طور پر وہ کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔

کچھ دنوں بعد مولانا نے پوچھا

"فلسفہ پڑھ رہے ہو؟"

عرض کیا: "بڑی محنت سے پڑھ رہا ہوں۔"

فرمایا "ذہن میں کچھ تبدیلی آئی؟"

عرض کیا، "بہت آئی۔ ماشاء اللہ ذہن روز بروز صاف ہو رہا ہے، قول و فعل میں اعتماد پیدا ہو گیا ہے اور بہت سی نئی نئی باتیں سوجھنے لگی ہیں۔"

فرمایا، "کچھ پوچھوں، بتاؤ گے؟"

پورے اعتماد سے عرض کیا: "ضرور پوچھیے، لازماً بتاؤں گا۔"

فرمایا، "بتاؤ مشّائین فلسفی کون ہوتے ہیں؟"

چوں کہ قول و فعل میں اعتماد پیدا ہو چکا تھا اور نئی نئی باتیں ذہن و فکر میں مچلنے لگی تھیں، لہٰذا پورے وثوق سے جواب دیا:

"علمِ صرف کی رُو سے یہ باب مشیٰ یمشی ہے اور رمیٰ یرمی کے وزن پر ہے۔ اس کا مادہ یعنی روٹ مَشی (م ش ی) ہے، جس کے معنی ہیں پیدل چلنا۔ مشّائین مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے بہت زیادہ پیدل چلنے والے۔

یعنی وہ فلسفی جو بے چارے غریب ہیں، جن کے پاس سواری نہیں ہے اور پیدل چلتے ہیں۔"
اس کی مثال دیتے ہوئے میں نے کہا، "مثلاً آپ مشّائین فلسفیوں میں سے ہیں، جن کے پاس کہیں آنے جانے کے لیے سواری نہیں ہے۔"

میں نے بتایا "اس کے برعکس "راکبین فلسفی" ہیں جو کاروں اور موٹروں پر سوار ہوتے ہیں۔"
مزید عرض کیا، "کچھ "طائرین فلسفی" ہیں جو ہوائی جہازوں میں سفر کرتے اور فضاؤں میں اڑتے ہیں۔"

مشّائین فلسفیوں کی یہ تعریف یعنی ڈیفی نیشن سن کر مولانا نے میری طرف دیکھا اور اس طرح مسکرائے جیسے کچھ مایوس ہو گئے ہوں۔ فرمایا "آپ فلسفہ نہیں پڑھ سکتے، یہ آپ کا موضوع نہیں ہے۔"

مولانا کا یہ فرمان میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔ میں نے ہر لفظ کا صحیح ترجمہ کیا تھا اور ہر بات سوچ سمجھ کر بیان کی تھی، لیکن اس کے باوجود مولانا نے میری حوصلہ شکنی کی، ظاہر ہے مجھے اس سے سخت ذہنی اذیت ہوئی۔

پھر فرمایا: "اچھا بتاؤ اشراقی فلسفی کون ہوتے ہیں؟"

عرض کیا یہ لفظ "اشراقی" (نقطوں والے قاف سے) ہے یا "اشراکی" (بغیر نقطوں والے کاف سے) ؟

فرمایا "یہ بھی آپ ہی بتائیں۔"

میں نے اپنے "علم" کے تمام پہلوؤں کو مجتمع کر کے عرض کیا۔ "اگر یہ لفظ بغیر نقطوں والے کاف کے ہے تو اس کا مادہ "شرک" ہے، یعنی وہ فلسفی جن کا شیوہ شرک کرنا اور غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ فلسفی ہوں جو دوسروں کو اپنے علم میں شریک کرتے ہیں۔ اور اگر یہ نقطوں والے قاف سے ہے تو اس کا مطلب ہے وہ فلسفی جو مشرقی جانب کے علاقوں یا شہروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی موٹی اور عام فہم مثال یہ ہے کہ جو فلسفی جھنگ کے رہنے والے ہیں ان کے نزدیک فیصل آباد کے فلسفی اشراقی قرار پائیں گے اور جو فیصل آباد میں مقیم ہیں ان کے حساب سے شیخوپورہ کے فلسفی

اشراقی ہوں گے، جو شیخوپورہ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ لاہور کے فلسفیوں کو اشراقی کہیں گے اور لاہور والے قصور کے فلاسفہ کرام کو اشراقی سے تعبیر کریں گے، علی ہذا القیاس ــــــــ

پھر عرض کیا، اس سے وہ فلسفی بھی مراد ہو سکتے ہیں جو باقاعدہ اشراق کی نماز پڑھتے ہوں۔ افسوس ہے مولانا نے اس سے بھی اتفاق نہ کیا اور صاف لفظوں میں فرمایا کہ "آپ سے فلسفہ پڑھنے اور سمجھنے کی بالکل توقع نہیں۔" بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ میری ساری محنت اکارت گئی اور میں مایوسی کے عالم میں سر نیچا کر کے بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کہ گرائمر کے نقطۂ نظر سے میرے تمام جواب صحیح ہیں، لیکن مولانا معلوم نہیں کیا چاہتے ہیں۔ یا تو میں انھیں اپنی بات سمجھا نہیں سکا یا یہ مجھے فلسفی کی حیثیت سے برداشت نہیں کرنا چاہتے۔

پھر فرمایا: "آپ کو یاد ہے آپ نے ابھی ایک لفظ "فلاسفہ" بولا ہے یعنی "فلاسفۂ کرام" کہا ہے۔"

میں نے سر اٹھا کر کہا: "جی ہاں، میں نے "فلاسفۂ کرام" کہا ہے۔"

فرمایا: "اس سے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔"

میں نے چہرے پر مسرت کے آثار طاری کرتے ہوئے پوچھا "کیا؟"

فرمایا: "آپ کو معلوم ہے انسان پر کھانے پینے کا بھی اثر پڑتا ہے!"

عرض کیا "جی ہاں، میں نے حکیموں اور دانش مندوں سے سنا ہے، وہ کہتے ہیں، ثقیل چیز کھائی جائے تو معدہ بوجھل ہو جاتا ہے اور وہ جلدی ہضم نہیں ہوتی۔ نرم غذا کھانے سے معدہ ہلکا رہتا ہے اور وہ زود ہضم ہوتی ہے۔"

فرمایا: "بالکل ٹھیک ہے۔"

میں اور خوش ہوا اور کان مولانا کے قریب کر لیے۔

فرمایا: "میری طرف دیکھو اور غور سے سنو۔ مجھے آپ کے لفظ "فلاسفہ" کہنے سے یاد آیا، آپ معجون فلاسفہ کھانا شروع کر دیں، شاید اللہ کرم کرے اور آپ فلسفی ہو جائیں۔"

میں خوشی سے اچھل پڑا، عرض کیا: "ہمدرد دواخانے کی کھاؤں یا دواخانہ حکیم اجمل خاں کی؟"

فرمایا: "اس کی کوئی شرط نہیں، جو ملتی ہے کھاؤ۔ اچھی ہوگی تو جلد اثر ہوگا، اچھی نہ ہوگی تو اثر میں کچھ دیر لگے گی۔"

اس کے بعد حکم ہوا: "اب جاؤ، اللہ کے گھر میں کیا کمی ہے، ممکن ہے اسی طرح ہماری دیرینہ خواہش پوری ہو جائے۔"

مگر یہ نسخہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا اور میں فلسفے سے محروم ہی رہا۔ مولانا نے اس کے جو لمبے چوڑے فوائد بیان فرمائے تھے، چاہتا تھا ان سے بہرہ مند ہو جاؤں مگر

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری اور اندر ہی اندر فلسفی بننے کی کوشش کرتا رہا جس کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ فلاسفۂ متقدمین کا وہ گروہ جو کثرت ریاضت سے اپنی باطنی قوتوں کو جلا دیتا اور مراقبہ و مکاشفہ کا قائل ہے، اشراقیین کہلاتا ہے، افلاطون اور بقراط کا شمار انھی لوگوں میں ہوتا ہے، مشہور بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردی بھی اشراقی فلسفی تھے۔ اس کے برعکس جو فلسفی ارسطو کے متبع ہیں انھیں مشائیین کہا جاتا ہے۔

قصہ ہوٹلوں کا اور زمانہ "کرامتوں" کے ظہور کا

۱۹۵۲ میں مولانا گوجرانوالہ سے مستقل طور پر لاہور آگئے۔ میں ان دنوں اخبار "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا اور "الاعتصام" گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ اب ہماری ہمہ وقتی ملاقاتوں کا سلسلہ تو باقی نہ رہا البتہ روزانہ شام کو ملاقات کا پروگرام طے کر لیا گیا اور پھر ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ یعنی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے میرے منسلک ہونے تک کم و بیش تیرہ سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ سے شام کی ملاقاتیں ختم ہو گئیں، کیوں کہ روزانہ دفتر میں ملاقات بھی ہو جاتی ہے، علمی باتیں بھی ہو جاتی ہیں اور لطائف و ظرائف کا دور بھی چلتا رہتا ہے۔

لاہور میں میرا دفتر شیش محل روڈ پر تھا اور قیام بھی وہیں ایک کمرے میں تھا، جس میں میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے بعد جب بچوں کو یہاں لے آیا تو پہلے بھاٹی دروازے میں اور پھر لوہاری دروازے میں کرائے کا مکان لے لیا۔ مولانا کا قیام ابتدا میں کچھ دن رنگ محل رہا اور پھر مزنگ

چوک بھونڈپورہ میں منتقل ہوگئے۔ یہ بھی ایک لطیفہ ہی سمجھیے کہ شروع شروع میں لفظ "بھونڈ پورہ" مولانا کی زبان پر نہیں چڑھتا تھا اور یوں بھی یہ لفظ بولنے سے انھیں عجیب سا احساس ہوتا تھا اور اگر میری موجودگی میں کوئی صاحب ان سے گھر کا پتا پوچھتے تو یہ میری ڈیوٹی تھی کہ انھیں مکان کا نمبر، گلی، محلہ اور چوک وغیرہ بتاؤں یا لکھ کر دوں۔ اب ستمبر ۱۹۸۳ میں مولانا نے کم و بیش تیس سال بعد بھونڈپورے والا مکان چھوڑ دیا ہے اور الحمد کالونی (اقبال ٹاؤن) چلے گئے ہیں، الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

اس زمانے میں ہمارا یہ معمول تھا کہ مغرب کے بعد مولانا گھر سے پیدل چل پڑتے اور میں مغرب کی نماز دہلی مسلم ہوٹل کی مسجد میں پڑھتا اور پھر انار کلی سے ہوتا ہوا مال روڈ پر آجاتا اور ریگل کی طرف چل پڑتا۔ کبھی تو مولانا انار کلی میں مل جاتے اور کبھی مال روڈ پر "ٹاکرا" ہو جاتا۔ پھر ہم اکٹھے انار کلی کا چکر لگا کر کسی ہوٹل میں جا بیٹھتے۔

ان دنوں نظام ہوٹل کے دروازے سے متصل ہمارے ایک دوست حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم کی دکان تھی۔ ان کو بھی ہمارا انتظار رہتا۔ ایک بیٹھک اور چائے وہاں بھی ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم سب مال روڈ کے کسی ہوٹل میں چلے جاتے اور پھر حاجی صاحب اپنی گاڑی میں ہمیں اپنے اپنے گھروں میں چھوڑ جاتے۔ لیکن حاجی صاحب مرحوم کے ہاں جانے اور بیٹھنے کے باوجود میرا اور مولانا کا کسی ہوٹل میں جانا، وہاں چائے پینا اور باتیں کرنا روزمرہ کے فرائض میں داخل تھا۔ ہوٹل میں کم از کم ایک گھنٹے کی نشست رہتی۔ اس دوران ہم بلا شرکت غیرے راز و نیاز کرتے۔

شرکت غیر کی نہیں چاہتی غیرت میری

مولانا کی واپسی اس طرح ہوتی کہ کبھی تو مال روڈ کی طرف سے پیدل جاتے اور میں انھیں ریگل چوک تک چھوڑ آتا۔ کبھی بھاٹی دروازے آجاتے اور وہاں سے تانگے میں سوار ہو کر جنازگاہ سے تھوڑا آگے سعدی پارک (روڑاں والا چھپٹر) جا اترتے اور وہاں سے گھر پہنچ جاتے۔ کبھی پرانی انار کلی یعنی لٹن روڈ اور نابھہ روڈ کے چوک سے تانگے پر بیٹھتے اور سعدی پارک جا اترتے۔

یہ ہمارا روزانہ کا معمول تھا جو تیرہ سال بالالتزام جاری رہا۔ کسی سخت مجبوری کی بنا پر ہم میں سے کوئی نہ آسکتا تو یہ الگ بات تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی پہلے ہوٹل پہنچ جاتا تو دوسرے کا بے تابی سے انتظار کرتا۔ یوں سمجھیے کہ :

جھناں نوں تانگھ سجناں دی
لک بنھ پتناں تے کھڑیاں

اس زمانے میں ہمارا "من تو شدم، تو من شدی" کا سا معاملہ تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی تنہا کسی دوست کو مل جاتا تو وہ حیران ہو کر پوچھتا کہ خیریت تو ہے آج آپ تنہا ہیں۔ ایک دن میں لوہاری دروازے کی طرف سے انارکلی میں داخل ہوا کہ مولانا کوثر نیازی مل گئے۔ کہا "آج آپ اکیلے جارہے ہیں، دوسرے ساتھی کہاں ہیں ؟" اتفاق سے سامنے سے مولانا آرہے تھے۔ میں نے کہا، "وہ دیکھیے آرہے ہیں۔" کہا "میں آپ میں سے کسی ایک کو تنہا دیکھتا ہوں تو فوراً خیال گزرتا ہے کہ دوسرے ساتھی خدانخواستہ کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہوں۔"

روزانہ کی کم سے کم ایک گھنٹے کی نشست کے لیے ہم نے سب سے پہلے انارکلی میں ایک ہوٹل کا انتخاب کیا۔ یہاں سے ہماری زندگی کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوتا ہے جو ہوٹلوں کے سلسلے میں اپنے اندر کچھ "اولیائی" اور "کرامات" لیے ہوئے ہے۔ ہماری یہ کوشش ہوتی کہ ہوٹل کے ہال کمرے کی درمیانی میز پر بیٹھا جائے تاکہ انارکلی سے گزرنے والوں کو آسانی سے دیکھ سکیں۔ اس میں ایک بنیادی فائدہ یہ ملحوظِ خاطر تھا کہ مولانا کے پیشاب کے لیے غسل خانہ بالکل قریب تھا، دُور جانے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی تھی۔ چائے سے پہلے بھی عمل پیشاب سے گزرنا یعنی "فارغ البول" ہونا ضروری تھا۔ اس کو چائے پینے کا "اجازت نامہ" بھی کہا جاسکتا ہے۔ پھر چائے کے بعد تو اس عمل کو "وجوب" کا درجہ حاصل تھا، اس کو ہماری اصطلاح میں "جوابِ چائے" کہا جاتا تھا۔

ہم نے اپنے حلقۂ احباب میں اعلانِ عام کر دیا تھا کہ ہم مغرب کے بعد اتنے بجے سے اتنے بجے تک انارکلی کے فلاں ہوٹل میں باقاعدہ بیٹھتے ہیں، ہمارے ملنے والے وہاں تشریف

لاکر بہ یک وقت تین فائدے حاصل کریں۔ ایک ہم سے ملاقات کا، دوسرا ہمارے ساتھ چائے نوش فرمانے کا اور تیسرا انارکلی کی سیر سے لُطف اندوز ہونے کا۔

بارش ہو یا آندھی ہم اس ہوٹل کے مستقل گاہک تھے۔ اس کے مالک اور کارکن ہمارا بہت احترام کرتے تھے اور جب ہماری جیب "خلیفۃ المسلمین" کا نمونہ پیش کرتی تو اس وقت بھی ہمیں وہاں تمام سہولتیں حاصل ہوتیں، یعنی ہر حالت میں ہمارے ساتھ "وی آئی پی" کا سلوک کیا جاتا۔ اس سے ہمارے بعض دوست کئی قسم کے "استفادے" فرمانے لگے تھے۔ وہ ہمارے ہوٹل میں آنے سے پہلے یا بعد میں تشریف لاتے، چائے پیتے یا کھانا کھاتے اور بل ہمارے کھاتے میں "جمع" کرا دیتے۔ یعنی اس طرح ہمارا کھاتہ "کھوہ کھاتا" بھی ہو گیا تھا۔ ہوٹل والے ہمیں بتا دیتے کہ فلاں فلاں اصحاب آئے تھے۔ ہم نے ان دوستوں کو "مستحقین" کے زمرے میں شامل کر رکھا تھا۔

اس ہوٹل میں کھانے پینے والے کافی لوگ آتے تھے۔ اوپر رہائشی کمرے تھے۔ کچھ عرصے بعد ہم نے دیکھا کہ ہوٹل کی رونق کا سایہ سمٹنے لگا ہے اور معاملہ روز بروز دگرگوں ہوتا جا رہا ہے۔ اس زمانے میں ہم زیادہ تر مسجد مبارک میں جمعہ پڑھتے تھے، وہاں میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا کے برادرِ کبیر مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب مرحوم و مغفور خطبہ دیتے اور نمازِ جمعہ پڑھاتے تھے۔ ایک دن جمعہ پڑھ کر ہم چائے کے لیے سیدھے اپنے ہوٹل گئے۔ دیکھا کہ وہاں پولیس کی نقل و حرکت بڑی تیز ہے۔ ہم نے چائے پی اور سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔ مولانا نے آہستہ سے کہا آئندہ ہمیں اس ہوٹل میں نہیں آنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ خواہ مخواہ دھر لیے جائیں۔ پھر مُسکراتے ہوئے فرمایا، "آپ کی تو کوئی ایسی بات نہیں، مجھے لوگ کہیں گے کہ اس عمر میں بابے کو کیا ہو گیا ہے۔"

بہر حال ہم ہوٹل میں آنے لگے تو اس کے گاہگ گھٹنا شروع ہو گئے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پنجابی ضرب المثل "حویلی میں یں باقر دی وچ جما لو آگڑ دی" کے مطابق اتنے بڑے ہوٹل میں ہم دونوں بیٹھے ہیں، یا ہوٹل کے کارکن ہیں، اور کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ یا پھر ہماری "جماعتِ مستحقین" کے کچھ لوگ آجاتے ہیں۔ ہم حیران یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ دیکھتے ہی

دیکھتے چند روز میں ایک بارونق ہوٹل کی یہ حالت — !

اس کے بعد ہم نے وہاں جانا بند کیا اور انارکلی کے باہر کشمیری ٹی سٹال کے قریب ایک ہوٹل میں مجلس جمانا شروع کی۔ کوئی دو مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن ہم نے دیکھا، ہوٹل کے ایک کونے میں مٹی چینی کے قابلِ فروخت برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے، ساتھ ہی بان کی بنی ہوئی ایک چارپائی پڑی ہے اور میز کرسیوں کو ایک طرف کر دیا گیا ہے۔ جو دو چار آدمی چائے کے لیے آئے ہیں وہ ان کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہم نے ہوٹل والوں سے پوچھا، یہ کیا سلسلہ ہے؟ بولے جناب کئی دنوں سے چائے کا کاروبار بہت مندا پڑ گیا ہے اور پیٹ پالنے کے لیے ہم برتن فروشی کا دھندا شروع کر رہے ہیں۔

یہ سن کر میں نے مولانا کی طرف دیکھا اور عرض کیا، معلوم ہوتا ہے یہ ہماری ہی "کرامات" کا نتیجہ ہے اور ہم اللہ کے فضل سے "مرتبۂ ولایت" کو پہنچ رہے ہیں۔ پہلے ہوٹل کے بعد اس ہوٹل کا یہ انجام ہماری ولایت کی واضح دلیل ہے۔ میرے ان الفاظ سے مولانا کو بھی احساس ہوا اور بولے "واقعی کوئی ایسی ہی بات ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا، مجھے یقین ہے ہوٹلوں کی رونق ختم کر دینے کی ولایت تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض ہو چکی ہے، لیکن ابھی اس کے ظاہر کرنے کا وقت نہیں آیا، جب تک مزید تجربوں بلکہ صوفیا کی اصطلاح میں "ضربوں" (جو ہوٹلوں پر پے در پے پڑنے لگی ہیں) یا ریاضتوں کے بعد معاملہ بالکل واضح نہ ہو جائے، اہلِ ولایت کے نزدیک اخفا ضروری ہے۔

مولانا اس نکتے کو خوب جانتے تھے، بولے آپ نے ٹھیک کہا، میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ ابھی "ذکرِ ظاہر" کی منزل نہیں آئی، فی الحال ہم "ذکرِ خفی" کی منزل میں ہیں، یعنی توفیقِ الٰہی سے جو معاملہ درپیش ہے اس کو ظاہر کرنے کے بجائے مخفی رکھا جائے — ظاہر کرنے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ کوئی اور ہوٹل والا ہمیں اندر نہیں گھسنے دے گا۔

اب ہم نے وہاں سے بھی کوچ کیا اور دہلی مسلم ہوٹل میں ٹھکانہ بنایا۔ دہلی مسلم ہوٹل میں نماز کے لیے مسجد تھی اور مولانا کے لیے ماشاء اللہ کئی بیت الخلا تھے کہ ایک رکا ہے تو دوسرا حاضر۔ ہم ہوٹل کے بڑے دروازے کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھتے تھے، جس کا

ایک دروازہ انارکلی کی طرف تھا اور انارکلی میں سیر سپاٹا کرنے والے لوگ اس سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

اب یہ سب باتیں ماضی بعید میں منتقل ہو کر تاریخ کے حوالے ہو چکی ہیں اور جس چیز کے بارے میں اُس وقت "ہے" کہا جاتا تھا، اب اس پر "تھا" کا اطلاق ہونے لگا ہے، اور اس دنیا کے تمام چھوٹے بڑے معاملات کا یہی حال ہے۔ مستقبل تیزی کے ساتھ ماضی کے قالب میں ڈھل رہا ہے اور تاریخ کے نئے سے نئے باب کھلتے جا رہے ہیں۔ شب و روز کی گردش کا یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

دہلی مسلم ہوٹل بہت پُرانا اور جما ہوا ہوٹل ہے اور اس کے پیچھے ایک طویل تاریخ ہے۔ آزادیٔ برصغیر سے پیشتر جب کشمیر کے سیاسی رہنماؤں کو کشمیری حکمرانوں سے پنجہ آزمائی کے نتیجے میں وادیٔ کشمیر سے نکلنا پڑھتا تھا یا وہ لاہور کے سیاست دانوں سے مشورے اور اخبار روالوں سے گفتگو کے لیے لاہور آتے تھے تو عام طور پر دہلی مسلم ہوٹل ہی میں قیام کرتے تھے۔ ان رہنماؤں میں شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، چوہدری غلام عباس اور بہت سے لوگ شامل تھے۔ متعدد کشمیری رہنماؤں کو آزادی سے قبل مَیں نے خود دہلی مُسلم ہوٹل کے مختلف کمروں میں دیکھا ہے اور ان سے باتیں کی ہیں۔

اس ہوٹل سے مجھے دلی ہمدردی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ درمیانے درجے کے لوگوں کا ہوٹل ہے اور اس میں قیام و طعام بہت سستا ہے۔ اس ضمن میں یہ واقعہ لائقِ تذکرہ ہے کہ ۱۹۵۴ میں سید رئیس احمد جعفری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے انسلاک کے سلسلے میں لاہور آئے تو ریلوے اسٹیشن کے قریب برگنزا ہوٹل میں ٹھہرے۔ ایک دن مَیں نے اُن سے پوچھا، "آپ کمرے کا روزانہ کیا کرایہ دیتے ہیں؟" جواب دیا، "دس روپے"۔ ! دس روپے اس زمانے میں بہت زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ مَیں نے از راہِ ہمدردی ان سے کہا، "آپ دہلی مُسلم ہوٹل میں آجایے، اس کے کمرے کا کرایہ برگنزا سے بہت کم ہے۔ پھر یہ لاہور کے مرکز میں ہے اور جن پبلشروں سے آپ کا تعلق ہے، وہ سب اسی علاقے میں رہتے ہیں اور ان سے ملنا آسان ہوگا۔"

رئیس صاحب مرحوم کی عادت تھی کہ کوئی بات ان سے کہی جاتی تو انکار نہیں کرتے تھے، "ہاں ہاں، ٹھیک ہے،" کہتے رہتے تھے۔ مشورہ دینے والے کا دل نہیں توڑتے تھے۔ مولانا حنیف ندوی بھی اس وقت موجود تھے، یہ رئیس صاحب کی نفسیات کو خوب جانتے تھے۔ مولانا میر "صائب" مشورہ سُن کر بولے، رئیس صاحب کاروباری آدمی ہیں، مہنگے ہوٹل میں رہنا ان کے کاروبار کا حصّہ ہے۔ جب یہ ایک بڑے ہوٹل سے سالم تانگے پر آتے اور پبلشر کے سامنے تانگے سے اُترتے ہیں تو اس پر ان کے معیارِ زندگی کا رُعب پڑتا ہے اور پھر اُس کی نہیں، اِن کی مرضی کے مطابق معاملہ طے ہوتا ہے۔ اگر یہ کسی سستے ہوٹل میں رہیں گے تو پبلشر انھیں ایک معمولی مصنف سمجھے گا اور اپنی مرضی سے معاملہ طے کرے گا۔

اس پر رئیس صاحب اس انداز سے مسکرائے جیسے مولانا کی تائید کر رہے ہوں، اور بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس کے بعد میں نے رئیس صاحب کو اس قسم کا کبھی کوئی مشورہ نہیں دیا۔

بہر حال ہم باقاعدہ دہلی مُسلم ہوٹل میں آنے، چائے پینے اور بیٹھنے لگے۔ ہم نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے بھی کہہ دیا، انھوں نے بھی وہاں تشریف لانا اور ہمیں نوازنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ دو سال کے لگ بھگ جاری رہا ہوگا کہ ہوٹل والوں کی محکمہ اوقاف سے گڑبڑ ہو گئی، پھر انتظامیہ میں جھگڑا پیدا ہو گیا، کچھ عرصے بعد ہوٹل کے کچھ کمروں کو ڈھانا شروع کر دیا گیا۔ بالآخر جس کمرے میں ہم بیٹھتے تھے، اس کی باری آگئی اور پھر اس میں کوئی اور کاروبار شروع کر دیا گیا۔ اب کئی سال سے اس کمرے میں حبیب بینک کی شاخ کھول دی گئی ہے۔ ہوٹل قائم ہے اور اللہ اسے قائم رکھے، لیکن اس کے کمروں میں تھوڑا بہت ردّ و بدل بہر حال ہوا ہے۔

اب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب ہماری ہی "کرامات" کے کرشمے اور ہماری ہی "ولایت" کے مظاہر ہیں۔ اس زمانے میں اللہ کے فضل وکرم سے ہم ولایت کے اونچے مرتبے پر فائز تھے اور اپنے ملنے والوں سے برملا اس کا اظہار کرتے تھے، کیوں کہ "کرامات" دھڑا دھڑ ظاہر ہو رہی تھیں اور بات شک وشبہے کے دائرے سے نکل کر مقامِ یقین تک جا پہنچی تھی۔ اب اخفا کی ضرورت نہ تھی، اظہار کی ضرورت تھی۔ اگر اس موقعے پر اظہار سے کام نہ لیا جاتا تو "مقامِ ولایت" پر ایسے اثرات مرتب ہونے کا قوی اندیشہ تھا کہ جن سے "اولیائی" معرضِ خطر میں پڑ سکتی تھی۔

اس زمانے کے سات آٹھ ہوٹل تو مجھے اچھی طرح یاد ہیں جو انارکلی اور اس کے گرد و نواح میں پہلے سے قائم تھے یا نئے نئے کھلے تھے، مگر ہماری چند "چائیں" بھی برداشت نہ کر سکے۔ مَیں یہ بات کسی قسم کے فخر یا تعلّی سے نہیں، "تحدیثِ نعمت" کے طور پر اللہ سے لاکھ لاکھ مرتبہ ڈرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ اُس دور میں "زورِ کرامات" کا یہ عالم تھا کہ ادھر کسی ہوٹل میں ہمارے "سبز قدم" پڑے اور اُدھر بیڑا پار۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی "نعمت" تھی جو ہمیں عطا فرمائی گئی تھی، ہر ایک کو یہ کہاں ملتی ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

کوئی تئیس چوبیس برس کی بات ہے کہ انارکلی میں بہت امیر لوگوں نے ایک ہوٹل کھولا۔ اس ہوٹل کی اٹھان بہت اچھی تھی اور بہت لوگ اس میں آتے تھے۔ ہم نے بھی اس میں جانا اور چائے پینا شروع کر دیا۔ بعض ادیب اور شاعر حضرات بھی وہاں آتے جو اپنی عادتِ مستمرہ اور روایتِ متواترہ کے مطابق ایک دوسرے کو اپنا کلام سناتے اور چائے پیتے پلاتے تھے۔

ایک دن مَیں اور مولانا ندوی اس ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ میرزا ادیب بھی تشریف لے آئے اور مولانا سے ملے۔ مَیں نے اُٹھ کر ان سے مصافحہ کیا، کافی دیر باتیں ہوتی رہیں اور انھوں نے ہمارے ساتھ چائے پی۔ اس سے پہلے مَیں نے میرزا ادیب کو دیکھا تو تھا اور ان کی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" بھی پڑھی تھی، لیکن ان سے پہلی ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی اور یہیں ان سے باتیں سننے کا اتفاق ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ اب وہ میرے دل کے ساتھی بھی ہیں اور محلے کے بھی۔ اگر ہفتے میں ایک دو مرتبہ ملاقات نہ ہو تو وہ بھی شکوہ فرماتے ہیں اور مَیں بھی خلا سا محسوس کرتا ہوں۔

ہمیں انتہائی تعجب ہوا کہ امیر لوگوں کا یہ ہوٹل، شان دار فرنیچر اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ لیکن ہماری ولایت کی "جھال نہ جھل" سکا اور جلد ہی اللہ کو پیارا ہو گیا ؏

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اسی طرح ایک اور ہوٹل مال روڈ پر تھا۔ بہت اچھی جگہ تھی، مال روڈ کی رونق اور چہل پہل

سامنے نظر آتی تھی۔ مولانا کے لیے پیشاب خانہ بھی تھا، لیکن ہماری آمد و رفت کے تین چار مہینے بعد اس کا انجام بھی وہی ہوا جو پہلے دن سے اس کے مقدر میں تھا۔

وائی ایم سی اے کے کونے میں ایک بہت بڑی عمارت ہے۔ سید رئیس احمد جعفری مرحوم نے مجھے بتایا کہ چند روز ہوئے اس میں ایک عمدہ ہوٹل کھولا گیا ہے۔ چنانچہ مغرب کے بعد میں اور رئیس صاحب اس میں گئے، کھانا کھایا اور چائے پی۔ باطن کا علم تو اللہ کو ہے، لیکن ہم ظاہر بینوں کے نزدیک بلاشبہ وہ بہت اچھا ہوٹل تھا۔ دوسرے دن مولانا کو بتایا، فرمایا:

"دیکھ آئے ہو۔"

عرض کیا "جی ہاں دیکھ آیا ہوں۔"

بولے "پہلے کیوں نہیں بتایا، مخفی کیوں رکھا؟"

ادب سے عرض کیا، "کل ہی پتا چلا ہے۔"

فرمایا: "اب دیر نہ لگاؤ، جلدی چلو۔"

مولانا کے لب و لہجے سے مجھے ایسے لگا جیسے ان کو میرے بارے میں یہ شبہ ہوا ہے کہ میں "اندر خانے" ہوٹل والوں سے "ملا ہوا ہوں" اور مولانا کو وہاں نہیں لے جانا چاہتا، اور یہ ہمارے "قانون" کی رو سے "سنگین جرم" تھا۔ بہر حال میں نے مولانا کو ہوٹل کے دروازے پر لے جا کھڑا کیا۔ فرمایا:

"اندر چلو"

عرض کیا "پہلے آپ۔"

ہم اندر پہنچے، بیٹھنے کے لیے اپنے ڈھب کی جگہ تلاش کی۔ مولانا غسل خانے میں گئے اور ایک ضرب پیشاب سے اپنی آمد کا اعلان کیا۔ بہرہ آیا اور ہم نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی اور ہم نے پینا شروع کی اور ساتھ ہی وسیع ہال کے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد مولانا نے "جوابِ آں چائے" کے لیے دوبارہ غسل خانے کا عزم فرمایا۔ ہر چیز ہماری پسند کے مطابق تھی، غسل خانہ بھی، چائے بھی اور فرنیچر بھی۔ فیصلہ ہوا کہ کل سے یہاں باقاعدہ ڈیرہ لگایا جائے گا۔ چنانچہ اس فیصلے پر عمل ہونے لگا۔ اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا

بھی وہی حشر ہوا جو تقدیر میں لکھا تھا۔ وارث شاہ نے مستی کی زبان میں بالکل ٹھیک کہا ہے:

تقدیر اللہ دی نوں کون موڑے تقدیر پہاڑاں نوں پٹ دی وے

اس کے قریب ہی میکلیگن روڈ پر ایک ہوٹل تھا جس کا نام تھا، "گرین ہوٹل"—— اس کے مالک لاہور کے ایک مشہور ٹھیکیدار اور امیر آدمی تھے، وفات پا گئے ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، بہت شریف انسان تھے۔ ان سے میرا تعارف حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم نے کرایا تھا جو اُن کی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور وہی سب سے پہلے ہمیں اس ہوٹل میں لے کر گئے تھے۔ اب ہماری اس پر نگاہِ انتخاب پڑی تو اس میں آمد و رفت شروع ہوئی۔ وہ "کرامتوں" کے ظہور کا زمانہ تھا، ہمارا اس میں کوئی بس نہ چلتا تھا۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ ہوٹل کا سامان سمیٹ لیا گیا ہے اور عمارت کا کوئی اور مصرف تلاش کر لیا گیا ہے۔

نیلہ گنبد میں جامع مسجد کے قریب کئی سال سے ایک ہوٹل تھا۔ ہمارے "قدم رنجہ فرمانے" کے بعد وہ بھی "مرحومین" کے زمرے میں شامل ہو گیا۔

ایک ہوٹل بھاٹی دروازے کے باہر سینما ہال کے سامنے کھولا گیا تھا جو اپنے علاقے کا ایک "پھنے خاں" ہوٹل تھا۔ اس میں تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ وہ بھی بے چارہ ہماری "کرامات" کی نذر ہو گیا اور اب اس کا صرف بورڈ باقی رہ گیا ہے۔ میں کبھی اُدھر سے گزرتا ہوں تو اس "مقامِ عبرت" کو ضرور دیکھتا ہوں۔

اسی اثنا میں لوہاری دروازے کے باہر جہاں دہلی دروازہ اور ریلوے اسٹیشن کی طرف سے آنے والی ویگنوں کا سٹاپ ہے اور جہاں فروٹ والے سڑک پر دکانیں سجائے بیٹھے ہیں، میں وہاں سے ایک دن گزر رہا تھا کہ دیکھا بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مشہور ادیب اور صحافی شورش کاشمیری (مرحوم) نے یہاں اپنے ایک دوست کے ہوٹل کا افتتاح کیا ہے اور یہ لوگ ہوٹل والے کی دعوت پر آئے ہیں۔ اس ہوٹل کا کچھ ادبی قسم کا نام تھا جو اب ذہن سے نکل گیا ہے۔ تیسرے دن یہ واقعہ مولانا کو بتایا تو فرمایا:

"پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اب جلدی جلدی اس ہوٹل میں پہنچنا چاہیے۔"

عرض کیا، "اس کا افتتاح ایک بہت مستقل مزاج آدمی نے کیا ہے، کوئی قدم اٹھانے

سے پہلے یہ سوچ لیجیے کہ اس میں کامیابی کی کہاں تک اُمید ہے۔"

فرمایا، "آپ کو خدا پر بھروسا نہیں رہا، جن کرامتوں سے اُس نے ہمیں نوازا اور ولایت کے جس "ذروۂ علیا" پر فائز فرمایا ہے، اس کے پیشِ نظر ہمیں اللہ کے گھر سے یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ضرور کامیابی سے ہم کنار کرے گا۔"

پھر نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، "مولوی اسحاق، مردِ مومن کو اللہ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے"۔ آخر میں میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے پنجابی میں کہا۔

"گھبراؤ نہیں، ایہہ ہوٹل ان شاء اللہ ساڈی دو چاواں دی مار وی نہیں۔ چلو اللہ دا ناں لے کے اُٹھو۔"

مولانا جب پنجابی میں میری حوصلہ افزائی کرتے اور مجھے "ہلا شیری" دیتے ہیں تو میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ کامیابی قدم چومنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہے بلکہ "اُسل وٹے" لے رہی ہے، اور اگر اردو میں حوصلہ افزائی کریں تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کامیابی دُور ہے اور مولانا کی طرح "کھونڈی" ہاتھ میں پکڑے خراماں خراماں آ رہی ہے۔ اس میں حوصلہ افزائی کے آخری الفاظ چوں کہ مولانا نے پنجابی میں ارشاد فرمائے تھے، اس لیے میں کامیابی کو بالکل سامنے اور اپنی طرف دوڑ کر آتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔

ہم ہوٹل میں گئے اور چائے پی، مولانا نے دو مرتبہ "جواب چائے عرض کیا"۔ جو ہمارے نزدیک بہترین شگون تھا۔ ہوٹل اچھا تھا، سروس بھی ٹھیک تھی ـــــ مولانا کا ارشادِ گرامی سولہ آنے سے بھی بڑھ کر اٹھارہ آنے صحیح ثابت ہوا۔ ہم نے اس ہوٹل میں چند ہی روز چائے پی تھی کہ اس کے لیے اللہ کا آخری حکم نازل ہو گیا۔ سچ ہے۔" جو اوپر سے آئے، اُسے کون ٹالے۔" نیلی چھت والے کو یہی منظور تھا۔

انار کلی میں مکی مسجد کے قریب ایک صاحب رہتے تھے، ان کا نام میں بھول رہا ہوں، وہ "ندوی" تھے۔ بہت معقول اور مخلص آدمی تھے۔ ایک دن ہم وہاں سے گزر رہے تھے کہ وہ دوڑ کر آئے اور ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ جہاں وہ لے کر گئے تھے وہ اُن کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ بہت صاف ستھرا اور نہایت عمدہ۔ وہ خود تو مطالعۂ کتب میں مشغول رہتے،

دوتین ملازم ہوٹل چلاتے تھے۔ انتہائی احترام سے چائے پیش کی اور مختلف موضوعات سے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ہم اجازت لے کر اٹھنے لگے تو بہ اندازِ درخواست کہا: ”آپ یہاں روزانہ تشریف لایا کریں، دوسری جگہ بھی بیٹھتے ہیں، یہاں آجایا کریں، آپ کی نوازش ہوگی“۔

ہم باہر نکلے تو میں نے مولانا سے عرض کیا، اس معصوم کو تو کسی بات کا علم نہیں، لیکن ہمیں آئندہ یہاں نہیں آنا چاہیے، یہ غریب مارا ہوگا۔ جب تک یہ مفت میں چائے پلاتے رہیں گے، معاملہ ٹھیک رہے گا، کیوں کہ ہماری کرامتوں کے دائرۂ اثر میں وہ لوگ نہیں آتے جو مفت میں چائے پلاتے ہیں، وہ اپنے گھر میں پلائیں یا ہوٹل میں۔ لیکن یہ کب تک مفت میں پلاتے رہیں گے، دو نہیں تو تین مرتبہ پلادیں گے۔ میں نے مولانا کو پنجابی ضرب المثل سنائی کہ ”دس گھر ڈین بھی چھڈدندی اے“۔ یہ تو آپ کے ”پیٹی بند“ یعنی ندوی بھائی ہیں۔ یہ بھولے پنچھی بے شک ہماری خصوصیاتِ روحانیہ سے واقف نہیں، لیکن ہمیں تو ان پر رحم کرنا چاہیے۔ سیانے کہہ گئے ہیں کہ جس برتن میں کھاؤ اس میں سوراخ نہ کرو۔

مولانا نے فرمایا، ”یہ سب ٹھیک ہے، مجھے بھی اس کا احساس ہے، لیکن کریں کیا؟ یہ ہمارے یہاں آنے کے لیے مصر ہیں۔“

کچھ دن تو ہم ان سے بچتے رہے، مگر جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً جانا پڑا۔ بس پھر کیا تھا، جو ہونا تھا، ہوکر رہا۔ ہوٹل بند ہوگیا اور اس پیکرِ خلوص کا آج تک پتا نہیں چلا کہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

ہمارے اس عہد کے ملنے والوں میں ایک صاحب کا نام شیخ عبدالمالک اور دوسرے کا صالحین تھا۔ شیخ عبدالمالک کو ہمارے حلقۂ احباب میں ”حاجی صاحب“ کہا جاتا تھا۔ یہ اصلاً دہلی کے رہنے والے تھے۔ لاہور میں چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے اور مطمئن تھے۔ انھوں نے کمرشل بلڈنگ میں ”کیفے ڈی لائٹ“ کے نام سے جدید انتظامات کے ساتھ ایک چائے خانہ کھول لیا۔ پھر قسمت نے جو چکر دیا تو ہمیں کہنا بلکہ اصرار کرنا شروع کر دیا کہ یہاں ضرور آیا کریں۔ وہ بدقسمتی سے ہمارے ”کراماتی رازوں“ سے آگاہ نہیں تھے، حالاں کہ ان سے خاصی بے تکلفی تھی۔ ہم ان کی بھلائی چاہتے تھے، اس لیے عرصے تک اُن کے ہاں جانے سے گریزاں رہے،

لیکن جب انھوں نے بار بار اور زور دے کر کہنا شروع کیا تو مجبوراً جانا پڑا۔ اس ہوٹل میں قدم رکھتے ہی میری کیفیت کہانیوں کے اس روایتی دیو کی سی تھی جو آدم زاد کو دیکھ کر پہلے ہنستا اور پھر روتا تھا۔ میں بھی پہلے ہوٹل کی ظاہری شان وشوکت کو دیکھ کر خوش ہوا، اور پھر افسوس کے ساتھ اس کے انجام پر غور کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ ان بے چاروں نے جو یہ اتنا سامان جمع کر رکھا ہے اس کا کیا کریں گے اور اسے کس مصرف میں لائیں گے۔

میں نے ایک مخلص دوست کی طرح ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیریت پوچھی، پھر چائے خانے کے خرچ اور آمدنی کے بارے میں دریافت کیا اور پھر گھر کے اخراجات سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ مولانا خاموش بیٹھے تمام صورتِ حال دیکھتے اور سنتے رہے۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ ہمارا آنا مشکل ہے۔ مولانا کا "کچھ تیرے آنے سے پہلے اور کچھ تیرے جانے کے بعد" کی طرح چائے سے پہلے "اجازت چائے" اور پھر چائے کے بعد "جوابِ آں چائے" کا دور چلتا ہے اور اس کا یہاں انتظام نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا سب ہے۔ بس آپ آیا کریں، آپ کو دیکھ کر آپ کے اور دوست بھی آئیں گے۔ اگر آپ ہی ہمارے ساتھ تعاون نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ بات بظاہر ان کی بھی صحیح تھی۔

مولانا نے میرے کان میں کہا، انھیں پھر سمجھاؤ کہ ہمارے یہاں آنے پر اصرار نہ کریں۔ میں نے عرض کیا، میں ہر طرح سمجھا چکا، اب یہ خود ہی اپنی "موت" کو دعوت دے رہے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں تو بے بس ہوں اور وہی الفاظ کہتا ہوں جو وارث شاہ کے بقول ہیر نے رانجھے سے کہے تھے۔

کے وے رانجھیا واہ نیں لاتھکی، میرے وَس نہیں گل بے وَس ہوئی

قصہ مختصر یہ کہ ہم نے ان کے مستقبل کو خدا کے حوالے کر کے روزانہ چار بجے کے بعد کیفے ڈی لائٹ میں جانا، بیٹھنا اور چائے پینا شروع کر دیا۔ رئیس احمد جعفری مرحوم بھی وہاں آتے تھے اور مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کو پتا چلا تو وہ بھی تشریف لانے لگے۔ حسرت مرحوم مولانا کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ وہ مولانا سے بعض مسائل بھی دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مسئلہ انھوں نے ایک دن بیمے کے بارے میں پوچھا۔ مولانا کے جواب میں بیمے کے جواز کا پہلو نکلتا تھا،

لیکن حسرت مرحوم کے بعض افکار میں اس زمانے میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ انھوں نے مولانا سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ اس کی کوئی توجیہ کر لیجیے، بیمے کی رقم بہرحال سود کے ذیل میں آئے گی اور سود کی تمام شکلیں شرعاً حرام ہیں۔

قادیانی حضرات کا اخبار "الفضل" اس وقت لاہور سے شائع ہوتا تھا اور اس کا دفتر کیفے ڈی لائٹ کے قریب میکلیگن روڈ پر تھا۔ اس کے ایڈیٹر روشن دین تنویر بھی وہاں آتے تھے۔ وہ الگ جا کر بیٹھ جاتے۔ ایک کپ چائے اور ایک شامی کباب منگواتے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ مولانا ندوی اور حسرت صاحب کے اصرار کے باوجود وہ ہمارے پاس بیٹھنے سے گریز کرتے۔ یہ میری ڈیوٹی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس "سامانِ تفریح" کو ان کے پاس لاؤں۔ وہ میرے کہنے سے آجاتے لیکن چائے اور شامی کباب سے فارغ ہونے کے بعد۔!

ایک دن حسرت مرحوم نے ان سے پوچھا "مولانا! آپ چائے کے ساتھ شامی کباب ضرور کھاتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟" میں نے ان کی طرف سے جواب دیا: شامی کباب وہ ہوتا ہے جو شام کے وقت کھایا جائے، اسی لیے روشن دین تنویر اُسے شام کو کھاتے ہیں۔

مشہور دیوبندی عالم مولانا ابوالقاسم دلاوری مرحوم بھی ہماری وجہ سے کبھی کبھی وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ مولانا ندوی اور حسرت مرحوم سے ان کے پرانے تعلقات تھے، رئیس صاحب سے نیا نیا تعارف ہوا تھا اور میرے مشفق تھے۔ قادیانیوں کے وہ شدید مخالف تھے، لیکن اتفاق سے جب بھی آئے روشن دین تنویر کی آمد سے پہلے یا ان کے جانے کے بعد آئے، ورنہ ہوٹل میدانِ مناظرہ بن جاتا۔ حسرت مرحوم کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتے اور مولانا ابوالقاسم دلاوری کی گفتگو شروع ہو جاتی۔ وہ حیاتِ مسیح کے سختی سے قائل تھے اور اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دن عجیب لطیفہ ہوا، وہ تشریف لائے اور دروازے میں داخل ہوئے تو حسرت صاحب نے اپنے خاص انداز میں کہا: "مولانا آئیے، آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا، ابھی ابھی رائٹر نے یہ افسوس ناک خبر دی ہے کہ حضرت مسیح چرخِ چہارم پر انتقال فرما گئے۔"

مولانا عالمِ تحیر میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور کہا، "انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا، اور مولانا بیٹھ گئے۔

مولانا ابوالقاسم دلاوری بعض مسائل میں متشدد تو تھے لیکن خشک نہیں تھے، زندہ دل اور دوستوں کے دوست تھے۔ لطیفے پر خوش ہوتے تھے۔ وہ کہا کرتے کہ زمین نہیں گھومتی، سورج گھومتا ہے، اس پر وہ سختی سے قائم تھے اور اس کے دلائل دیتے تھے۔

ایک دن کسی دوست نے بہت سی کتابوں کے ایک مشہور مصنف کے بارے میں (جو کئی سال ہوئے وفات پا گئے ہیں) کہا کہ "وہ بہت پڑھے لکھے ہیں"۔ حضرت مرحوم نے جواب دیا، "پڑھے" کا تو پتا نہیں، "لکھے" البتہ بہت ہیں۔

کیفے ڈی لائٹ کی محفلیں بہت دلچسپ تھیں۔ رئیس احمد جعفری مرحوم ان دنوں کراچی سے ماہ نامہ "ریاض" نکالتے تھے۔ یہ نام انھوں نے اپنے نانا ریاض خیر آبادی مرحوم کے نام پر رکھا تھا۔ کراچی جا کر انھوں نے "ریاض" میں کیفے ڈی لائٹ کی ان محفلوں سے متعلق بھی لکھا تھا، جن میں وہ خود شریک ہوتے رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد رئیس صاحب کراچی سے لاہور آ گئے تھے اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ یہ ۱۹۵۴ کی بات ہے۔

اس زمانے میں لاہور میں پاکستانی اور ہندوستانی کھلاڑیوں کے درمیان کرکٹ میچ کھیلا گیا تھا، جس کو دیکھنے کے لیے پچاس ہزار کے لگ بھگ ہندوستانی باشندے لاہور آئے تھے اور ان میں زیادہ تعداد مشرقی پنجاب کے سکھوں کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں پاکستان کے سفیر راجا غضنفر علی خاں تھے اور انھوں نے دل کھول کر ہندوستانیوں کو پاکستان کے ویزے دیے تھے۔ وہ خود بھی کرکٹ میچ دیکھنے لاہور آئے تھے۔ گول باغ میں راجا صاحب مرحوم کی صدارت میں شام کے بعد مشاعرہ بھی ہوا تھا، جس میں پاکستان اور ہندوستان کے شاعروں نے پنجابی میں اپنا کلام سنایا تھا۔ اس کو "مچھارہ" بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس میں سکھ شاعر یعنی "مونچھوں والے" زیادہ تھے۔ ایک سکھ شاعر نے کوہ پیما تن سنگھ (یا تن سنگ) کے بارے میں نظم پڑھی تھی، جس نے کچھ عرصہ پیشتر کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا تھا۔

اس مشاعرے میں لاہور کے بے شمار لوگ شامل ہوئے۔ ایک بوڑھے سکھ نے نظم پڑھنے سے پہلے پنجابی میں بتایا کہ وہ پاکستان آنے کے لیے تیار ہوا تو اس کی "سنگھنی" نے اُسے روکا اور کہا کہ پاکستان کے مُسلمان تمھیں مار ڈالیں گے، تم وہاں نہ جاؤ۔ جو تھوڑی بہت زندگی باقی

ہے، اسے گھر میں بیٹھ کر گزارو اور آرام کی موت مرو۔ سنگھنی نے اسے غصے میں یہ بھی کہا: "دوڑٹ پینیا نہ جا، مُسلیاں دے ہتھوں مرجائیں گا، کیوں موت نوں ماسی آکھدا ایں" مگر وہ نہیں مانا۔ (بقول اس کے) جب سنگھنی نے بہت ڈرایا اور پاکستان نہ جانے کے لیے رو رو کے منت سماجت کی تو وہ سچ مچ ڈر گیا۔ رات بھر سوچتا رہا، بالآخر لاہور آنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اس کو ضلع امرت سر کے کسی گاؤں سے سائیکل پر لاہور آنا تھا۔ صبح صبح بقول اس کے "میئیں دی بانگ ویلے اٹھیا" اور سنگھنی سے کہا تم میرے لیے پریم کے ساتھ اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے مُولیوں والے موٹے موٹے چار پراٹھے پکا دو اور اوپر پاؤ بھر مکھن رکھ دو۔ شاید تیرے ہاتھ کے پکے ہوئے میرے لیے یہ آخری پراٹھے ہوں۔ مَیں انھیں واہگہ کی سرحد پر جا کر کھاؤں گا اور تمھیں دعا دوں گا۔ اس کے بعد پاکستان پہنچتے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں مار دیا جاؤں گا۔ اس نے بتایا کہ سنگھنی نے رو رو کر میرے لیے اپنے خیال میں آخری پراٹھے اسی طرح پکائے جس طرح مَیں نے کہا تھا اور "نویں نکور پونے" میں باندھ دیے۔ پھر اس نے آخری بار میرے "چرن چھوئے" اور "ہنجو بھری" آنکھوں سے ہاتھ جوڑ کر مجھے رخصت کیا اور واہگرو سے دعا مانگی کہ مَیں سُکھ چین سے واپس آؤں اور اگر وہاں مار دیا جاؤں تو "شہیدی مراتبہ" پاؤں اور سیدھا سُرگ کو جاؤں۔

اس نے بتایا کہ لاہور میں میرا ایک سجن ہے جو پاکستان بننے سے پہلے میرے گاؤں میں رہتا تھا، اس کا نام ہے ملا عبدالعزیز۔ چھوٹی عمر سے ہمارا یارانہ تھا۔ اب ہم آپس میں ایک دوسرے کو چھٹیاں بھیجتے رہتے ہیں۔ کچھ دن پہلے مَیں نے اس کو چٹھی لکھی کہ مَیں فلاں تاریخ کو لاہور آرہا ہوں، تم مجھے لینے کے لیے واہگہ سرحد پر پہنچ جاؤ۔ چنانچہ مَیں وہاں آیا تو وہ موجود تھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر باغ باغ ہوگئے اور کئی سال کے "وچھڑے" ملے تو اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ وہ بھی میرے لیے گھر سے روٹیاں لے کر آیا تھا۔ پہلے تو ہم دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر روٹیاں کھائیں اور مَیں نے اس سے کہا، تم یہ پراٹھے کھاؤ، ان میں مُولیاں ڈالی ہوئی ہیں اور تیری "بھرجائی" کے ہاتھ کے پکے ہوئے ہیں۔ دو میرے لیے ہیں اور دو تیرے لیے۔ پھر یہ ہوا کہ اس نے میرے پراٹھے کھائے اور مَیں نے اس کا "پھلکا چھکا"۔ اس کے بعد ہم نے ایک ایک "ڈکار" مارا اور سائیکل پر سوار ہو کر لاہور کو روانہ ہوگئے۔ مَیں سائیکل چلا رہا تھا، ملا عبدالعزیز

میرے پیچھے بیٹھا تھا، لوگ ارد گرد سڑک پر کھڑے ہمیں خوش ہو ہو کر دیکھ رہے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ مَیں نے سنا تھا کہ مال روڈ پر صرف ایک آدمی سائیکل پر بیٹھ سکتا ہے، دو بیٹھیں تو سپاہی پکڑ لیتے ہیں، لیکن ہمیں سپاہی دیکھتے رہے، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ پھر راستے میں سائیکل چلاتے چلاتے یہ "کوتا" ہو گئی۔ اب سنو "کوتا"۔

وہ کوتا (نظم) جو اس سکھ شاعر نے پڑھی، بہت دلچسپ تھی، اس پر اس کو خوب داد ملی۔ مَیں نے وہ یاد کر لی تھی، لیکن افسوس ہے اب بھول گیا ہوں، صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے:

ملاں سنگھ دی پچھاڑی بیٹھا
ویکھے جگت کھڑا

اس کے بعد اس نے اپنے خاص لب و لہجے میں کہا کہ ہم راجا غضنفر علی خاں کے بے حد شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ہمارے لیے لاہور آنے اور مسلمان بھائیوں سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے غ کا گ، ض کا ج، ف کا پھ، ع کا الف اور خ کا کھ تلفظ کیا اور "غضنفر علی خاں" کو "گجنپھر الی کھاں" بنا دیا۔

اس مشاعرے میں مولانا محمد حنیف ندوی بھی موجود تھے۔ اس قسم کے اجتماعات میں ہم دونوں اکٹھے جاتے اور نہایت اہتمام اور شوق سے جاتے۔ اس سکھ کی تقریر بھی بہت "ہنسی آور" تھی اور نظم بھی "قہقہہ آفرین" تھی۔

سکھ کئی دن یہاں رہے تھے اور تمام شہر میں آزادی سے گھومتے پھرتے تھے۔ چوں کہ اتنی بڑی تعداد میں آزادی کے بعد یہ پہلی دفعہ لاہور آئے تھے، اس لیے لوگ انھیں تعجب سے دیکھتے اور ملتے تھے۔ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک دن معمول کے مطابق مَیں کیفے ڈی لائٹ پہنچا، لیکن میرے ساتھیوں میں سے ابھی تک کوئی صاحب بھی نہیں آئے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی سعید احمد میرے ساتھ تھا، جس کی عمر اُس وقت چھ سات برس کی تھی اور وہ سکھوں کو دیکھنا چاہتا تھا کہ کس قسم کے ہوتے ہیں۔

ہوٹل کے ایک کیبن کے دروازے پر نیلے رنگ کے کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔ مجھے

جو شرارت سوجھی، مَیں نے وہ کپڑا اُتارا اور آئینے کے سامنے بیٹھ کر سکھوں کی طرح پگڑی باندھی، جیب سے رومال نکال کر اس کا جوڑا بنایا اور سنجیدہ صورت بنا کر بیٹھ گیا۔ سعید مجھے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا اٹھا اور رونے لگا۔ مَیں نے اس کو چُپ کرایا اور ہوٹل والوں کے سپرد کیا۔ مَیں ان دنوں مُونچھیں چڑھا کر رکھتا تھا اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے چند طالب علم آئے اور مجھے سکھ نوجوان سمجھ کر میرے پاس آ بیٹھے۔ انھوں نے مجھ سے پنجابی میں کچھ سوالات کیے، مَیں نے اُردو میں جواب دینا شروع کیے۔ وہ سمجھے پڑھا لکھا اور اردو بولنے والا "سکھ" ہے۔ اس سے انھیں خوشی ہوئی اور اردو میں گفتگو کرنے لگے۔ اتنے مولانا بھی آ گئے اور جس میز پر ہم روزانہ بیٹھتے تھے، وہاں جا بیٹھے۔ انھوں نے چائے نہیں منگوائی اس لیے کہ میرا انتظار تھا۔

طالب علموں نے چائے اور پیسٹریوں کا آرڈر دیا، ہم باتیں بھی کر رہے تھے اور کھانے پینے کا شغل بھی جاری تھا۔ مولانا ہمیں دیکھ رہے تھے لیکن کچھ دور ہونے کی وجہ سے ہماری آواز ان تک نہیں پہنچ رہی تھی —— کچھ دیر بعد طالب علم یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ کل اسی وقت یہاں آئیں گے اور مجھے لاہور کی سیر کرائیں گے۔ دوسرے دن وعدے کے مطابق وہ آئے، مَیں موجود تھا، انھوں نے بار بار اِدھر اُدھر دیکھا مگر اپنے مطلوب "سکھ" کو نہ پا کر مایوسی کے عالم میں واپس چلے گئے۔

مولانا نے مجھے بالکل نہیں پہچانا، ہوٹل والوں نے بھی ان پر یہ راز ظاہر نہیں کیا۔ جب مَیں اکیلا رہ گیا تو مولانا کے پاس آیا اور آداب عرض کیا۔ مولانا کھڑے ہوئے اور فرمایا:

"تشریف رکھیے"۔۔۔ ہم نے "تشریف رکھی" اور پوچھا

"مزاج اچھے ہیں؟"

فرمایا "اللہ کا فضل ہے"

عرض کیا، "اللہ کا فضل ہے یا واہگرو دی کرپا اے؟"

ساتھ ہی سوال کیا، "آپ کہاں تشریف رکھتے ہیں اور کیا شغل ہے؟"

اب انھیں شبہ پڑا، مَیں بھی ہنسی ضبط نہ کر سکا، ہوٹل والے بھی ہنسنے لگے۔ فرمایا

"مَیں بالکل نہیں پہچان سکا، یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"

مَیں نے پگڑی اُتاری اور لطیفے بازی شروع ہو گئی۔

دوسرے دن یہ واقعہ مولانا نے اپنے دفتر (ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں) مولانا جعفر شاہ پھلواروی سے بیان کیا، ان کو اس قسم کی باتیں خدا دے، وہ میرے مہربان تھے۔ انھوں نے "امروز" میں ایک مضمون لکھ مارا، جس میں میرے جعلی سکھ بنتے کا دلچسپ مزاحیہ انداز میں ذکر کیا۔ مضمون میں میرا نام نہیں لیا، صرف یہ لکھا کہ ہمارے ایک دوست جو قیامِ پاکستان سے قبل ریاست فرید کوٹ سے تعلق رکھتے تھے، "سکھ" بن کر ایک ہوٹل میں لاہور کے طلبا سے پیسٹریاں اڑاتے رہے۔

جی چاہتا ہے اس موقعے پر سکھوں کے تین چار لطیفے بیان کر دیے جائیں جو اس زمانے میں میرے سامنے "سرزد" ہوئے۔ مَیں ان لطیفوں کا چشم دید اور گوش شنید گواہ ہوں۔

ان دنوں بے شمار سکھ انارکلی، مال روڈ اور لاہور کے دوسرے علاقوں میں گھوم پھر رہے تھے اور لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ مَیں اپنے پرانے وطن فرید کوٹ کے سکھوں کی تلاش میں تھا۔ بہت لوگوں سے پوچھا مگر فرید کوٹ کا کوئی خالصہ نہ ملا۔ ایک دن رات کو دس بجے انارکلی سے گزر رہا تھا کہ ایک سکھ سے پوچھا۔

"سردار جی! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

جواب دیا، "امرتسر کے"

ساتھ ہی مجھ سے کہا، "تسیں کتھوں دا خالصہ لبھدے او؟"

مَیں نے کہا "فرید کوٹ دا"

ذرا سوچ کر بولے: فرید کوٹ دا اِک خالصہ ہے، صبح نو بجے اسیں "نیامت اللّٰے" دے ہوٹل چ کھانا چکھیا سی، تسیں او تھے جاؤ"

عرض کیا، "تسیں کھانا نو بجے چکھیا، ہن رات دے دس بج رہے نے، او ہن تک اوتھے بیٹھے نے"

بولے "شاید بارہ گھنٹے بعد پھر آ گئے ہون، ویکھن چ کی ہرج اے"

مَیں نے سردار جی کو ان کی اس سوچ کی داد دی اور شاباش کہہ کر آگے نکل گیا ـــــ

"نیامت اللے دے ہوٹل" سے مراد نعمت کدہ ہوٹل ہے جو لوہاری دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر واقع ہے۔

اسی طرح ایک اور سردار جی سے جو پڑھے لکھے معلوم ہو رہے تھے، مَیں نے پوچھا:

"سردار جی کتھوں تشریف لیائے؟"

فوراً بولے "دِلّیوں لیائے آں۔"

دہلی مسلم ہوٹل میں دو سکھ چائے پی رہے تھے۔ ان سے پوچھا

"آپ کو معلوم ہے، فرید کوٹ سے بھی لوگ آئے ہیں یا نہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "سانوں پتا نہیں، پر گل ایہ اے کہ کجھ خالصے حسن ابدال چلے گئے نے، کجھ ننکانہ صاحب گئے نے۔ اج اوہ لہور واپس آجان گے، تسیں ٹیشن تے جان کے پتا کرو۔"

عرض کیا، "کویں پتا کراں؟"

کہا، "بالکل سوکھا کم اے، جدوں ریل آوے، ہوکا دیو، فرید کوٹ دا کوئی خالصہ؟ جھیڑا اہو یا، آپے بول لیؤ۔"

مَیں بگلا پکڑنے کا یہ استادی طریقہ سن کر خاموش ہو گیا۔

یہ سکھ صاحبان سردیوں کے موسم میں لاہور آئے تھے۔ ایک دن مَیں بھاٹی دروازے کے باہر ایک ہوٹل میں چائے پی رہا تھا کہ ایک سکھ نوجوان آیا، جس نے شان دار سوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں انگریزی کی تین چار کتابیں تھیں اور "پاکستان ٹائمز" اور "ڈان" دو اخبار تھے۔ مَیں نے اس کو چائے کی دعوت دی تو پنجابی میں جواب دیا۔

"اج ٹھنڈ بڑی پے رہی اے، مَیں کوکا کولا دی ٹھنڈی بوتل پیواں گا"

مَیں نے کہا "ٹھنڈ وچ ٹھنڈی بوتل، ایہدا کی مطلب؟"

بولے، "جویں گرمی نوں گرمی کٹدی اے، ایویں ٹھنڈ نوں ٹھنڈ کٹدی اے۔"

مَیں ہوٹلوں کے بارے میں بات کرتا کرتا بہت دور نکل گیا اور بعض علمائے کرام کی طرح "ذیول" بیان کرنا شروع کر دیے۔ علمی زبان میں آپ شاید مجھے "طول الذیل" قرار دے دیں۔ دراصل

کہنا یہ چاہتا تھا کہ ہمارے "وجودِ مسعود" سے بے چارے کیفے ڈی لائٹ کا انجام بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے بعض ہوٹلوں کا ہو چکا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم جب بھی اس ہوٹل میں جاتے، اُس کے مالکوں کے مستقبل کا خیال ہمیں بُری طرح ستانے لگتا۔ آخر سال سوا سال کے بعد جو ہونا تھا ہو کر رہا — رہے نام اللہ کا۔

اا ستمبر ۱۹۸۴ کو مَیں مولانا معین الدین لکھوی کی اہلیہ کے جنازے میں شرکت کے لیے اوکاڑے گیا تو وہاں میرے پرانے دوست محمد محمود میمن سے ملاقات ہوئی جو مولانا لکھوی کی اہلیہ مرحومہ کے بھائی ہیں۔ ان سے یہ معلوم کر کے نہایت افسوس ہوا کہ کیفے ڈی لائٹ کے اس وقت کے مالکوں میں سے کچھ عرصہ پیشتر شیخ عبدالمالک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے کراچی میں انتقال کر گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم اُس زمانے میں بہت خوب صورت، جوانِ رعنا اور شگفتہ مزاج آدمی تھے۔ مگر اب جوانی کی منزل سے آگے نکل گئے تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ ہم انھیں اس موضوع کی طرف لانا چاہتے تو طرح دے جاتے۔

ان کے دوسرے ساتھی کا نام صالحین تھا۔ تقریباً پندرہ برس قبل ہال روڈ پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب معلوم نہیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

ہم نے "اُن کرامتوں" کا نام "کراماتِ ہوٹلیہ" رکھا تھا، اور یہ وضاحت بھی کر دوں کہ ہمارا یہ تجربہ یا اثرِ کرامات چھوٹے ہوٹلوں تک محدود رہا۔ بڑے ہوٹلوں کو ہم "افورڈ" نہیں کر سکتے تھے اور بڑے ہوٹلوں میں بیٹھنے والے بڑے لوگ ہمارے اس "کراماتی سلسلے" کو برداشت بھی نہیں کر سکتے تھے، اور ہم "طبقاتی جنگ" کے قائل نہیں تھے، لہٰذا ہم نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔

بعض دوستوں اور مہربانوں نے ازراہِ "اخلاص" یہ رائے دی تھی کہ جن بڑے بڑے ہوٹلوں میں کاروباری رقابت چل رہی ہے، ان میں سے کسی ایک ہوٹل کے منتظمین سے بات کی جائے کہ وہ آپ کی خدمات حاصل کریں۔ انھوں نے مالی منفعتوں کا بھی لالچ دیا اور کہا کہ کم از کم "لکھ پتی" ہو جاؤ گے۔ لیکن ہم نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس "نعمتِ عظمیٰ" سے نوازا ہے، اس کو ہم کاروباری رقابتوں سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔

یہ عقدہ البتہ پوری طرح نہیں کھل سکا کہ یہ جو کچھ ہوتا رہا، اس میں اصل کرامت کس کی تھی، اس بندۂ عاجز کی یا حضرت مولانا کی ؟ یا مشترکہ طور پر دونوں کی ؟ یا یہ کہ ایک کا حصّہ زیادہ تھا اور ایک کا کم۔ پھر زیادہ کس کا تھا اور کم کس کا ؟ اس باب میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

ہماری ہوٹل بازی اور شام کو روزانہ ملاقات کا سلسلہ ۱۹۵۲ سے اکتوبر ۱۹۶۵ تک جاری رہا۔ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ کو میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک ہو گیا اور پھر یہاں کی دفتری ملاقات نے شام کی ملاقات بند کر دی۔

اس زمانے میں حالت یہ تھی کہ اگر کسی دن ملاقات نہ ہو سکتی اور مولانا انار کلی تشریف نہ لا سکتے یا میں حاضر نہ ہو سکتا تو دل پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ۱۹۶۰ میں مولانا سخت بیمار پڑ گئے اور کہیں آنے جانے کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ میں ہر روز یا دوسرے روز مزاج پرسی کے لیے گھر جاتا۔ ان کی بیماری یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ نہ بولنے کی سکت رہی اور نہ کوئی بات سننے کو جی چاہتا، حتّٰی کہ کسی کو دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔

ایک دن میں گیا تو ملنے یا بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے انتہائی ذہنی کوفت ہوئی۔ پیغام بھجوایا کہ "میں نیچے گلی میں کھڑا ہوں، کھڑکی سے چہرہ باہر نکال کر زیارت کرا دیں۔" ازراہِ کرم یہ گزارش مان لی گئی۔ مغل بادشاہوں کی طرح جھروکے سے چہرہ نکالا اور ہاتھ سے سلام کا اشارہ کر کے فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ اتنا خوش طبیعت، شگفتہ مزاج اور ہنس مکھ آدمی جو چند لمحے بھی دوستوں کے بغیر نہیں گزار سکتا تھا، اب کسی کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ رنگ سیاہ پڑ گیا تھا اور سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ چھ سات مہینے یہی حالت رہی۔ پھر اللہ نے فضل کیا اور صحت عطا فرمائی۔ اس کے بعد پھر وہی ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی ــــ !

چائے اور ہوٹلیات کا موضوع ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ چائے کے سلسلے میں مولانا صرف چائے دیکھتے ہیں کہ کیسی ہے، ان کے ذوق کے مطابق ہے یا نہیں، جگہ اور برتن دیکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ اگر چائے ان کی پسند کے مطابق ہے

تو کہیں لے جائیے، چلے جائیں گے اور کسی قسم کے برتنوں میں پلا دیجیے پی لیں گے، چھوٹے سے چھوٹے چائے خانے میں بھی اور بڑے سے بڑے ہوٹل میں بھی۔ میں نے کئی دفعہ کہا، آپ اتنے بڑے عالم اور محقق و مصنف ہیں اور ہمارے ساتھ معمولی سے چائے خانے میں چائے پینے بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ اس باب میں تکلف کے قائل نہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ علم سادگی، لوگوں سے میل جول اور بے تکلفی کا درس دیتا ہے۔ غرور، تکبر، نخوت اور عوام سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین نہیں کرتا۔ علم کا مطلب ہٹو بچو کے نعرے لگانا نہیں بلکہ لوگوں کو آؤ، ملو، بیٹھو اور سنو سناؤ کا خوگر بنانا ہے

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ بعض دفعہ ہمیں کئی کئی دن ہوٹل میں چائے پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہایت عزت و تکریم سے چائے ملتی تھی بلکہ کبھی کبھی جبراً پلائی جاتی تھی —— اس کی دو مثالیں دیتا ہوں۔

ہمارے ایک دوست محمد محمود میمن ہیں جو مشہور عالم دین اور معروف مقرر و مصنف مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی مرحوم کے فرزند گرامی ہیں اور آج کل روزنامہ "وفاق" (لاہور) کے نمائندے کی حیثیت سے کراچی میں مقیم ہیں۔ میرے "الاعتصام" کے زمانہ ادارت میں کچھ عرصہ وہ "الاعتصام" کے مینیجر بھی رہے۔ ہمارے دورِ ہوٹل بازی میں یہ لاہور میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ لیکن ان کی شادی نہیں ہو رہی تھی اور اس کے لیے بہت پریشان تھے۔ شام کو چلتے پھرتے انار کلی میں کہیں نہ کہیں ہمیں آپکڑتے۔ ان کے پاس سوائے شادی کے کوئی موضوع نہ تھا۔ ہم ان کی دل جوئی کرتے، ان کو تسلّی دیتے اور پورے خلوص سے اس اہم مسئلے میں ان کی مدد کا وعدہ کرتے، لیکن کامیابی اللہ کے ہاتھ میں تھی، ہمارے بس میں نہ تھی۔ محمود صاحب شادی کے لالچ میں ہمیں چائے پلاتے اور بسکٹ کھلاتے۔ پھر دوسرے دن کی تاریخ پڑ جاتی اور مولانا فرماتے، باقی باتیں کل اسی وقت اسی ہوٹل میں ہوں گی۔

جب میں کہتا "محمود صاحب! ہم نے اپنی سی کوشش کی مگر کوئی شریف آدمی آپ کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے کو تیار نہیں۔" تو محمود صاحب بگڑ جاتے اور کہتے "کیوں تیار نہیں؟ مجھ میں کیا نقص ہے؟" مولانا ایسی باتیں کہنے سے مجھے روکتے اور فرماتے شادی کے

معاملے میں ایسی بدشگونی کی باتیں نہیں کی جاتیں۔ نہ اس سلسلے میں حوصلہ شکن گفتگو کرنا مناسب ہے۔ بہرحال چائے کے بعد ہاتھ اٹھا کر ہم "ختم شریف" کی دعا پڑھتے اور محمود صاحب سے کہتے کہ اللہ بھلی کرے گا، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ قادرِ مطلق اور مقلب القلوب ہے۔ اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی کا دل پھیر دے گا اور آپ کی شادی ہو جائے گی۔ اس پر محمود صاحب ہم سے پھر دعا کی درخواست کرتے اور ہم زبان سے دعائیہ کلمات کہتے اور آمین آمین پکارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو جاتے۔

بالآخر ہماری "دعا برکت" سے محمود صاحب کی شادی ہو گئی، اس میں مولانا نے بھی شرکت فرمائی اور میں بھی شامل ہوا۔ نکاح مولانا سید داؤد غزنوی نے پڑھایا ـــــ شادی کے بعد میں نے محمود صاحب اور ان کی بیگم کو گھر بلایا اور ان کو دعوت کھلائی ـــــ مولانا بھی اس میں شریک ہوئے۔

اب محمود صاحب کراچی میں اقامت گزیں ہیں اور ماشاء اللہ اتنے بچوں کے باپ ہیں کہ خود ہی بتائیں تو صحیح تعداد کا پتا چلتا ہے۔ چار سال قبل انھوں نے اپنے بیٹے کی شادی لاہور میں کی، مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی اور کئی معزز دوستوں کی ڈیوٹی لگائی کہ مجھے پکڑ کر لے جائیں، لیکن میں ان دنوں لاہور میں نہیں تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد کراچی میں بیٹی کی شادی کی، اس کا دعوت نامہ بھی آیا مگر میں بدقسمتی سے اس میں بھی شریک نہیں ہو سکا۔ پچھلے دنوں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا، یہ سب مولانا حنیف ندوی اور میری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ہم "چھپے پیر" ہیں۔

اسی طرح ہمارے ایک اور دوست عبدالعلیم خاں صاحب چونیاں (ضلع قصور) میں فروکش ہیں، ان کا مسئلہ بھی اسی قسم کا تھا۔ وہ ان دنوں رائے ونڈ رہتے تھے اور روزانہ رائے ونڈ سے لاہور آ کر اپنے درپیش مسئلے کی تفصیلات بیان کرتے اور پراگرس بتاتے۔ ہم ان کے ساتھ بھی اظہارِ ہمدردی کرتے۔ جب وہ ہم سے بصورتِ درخواست کہتے کہ "دعا فرمائیں" تو ہمارے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی۔ وہ بھی ہمیں چائے پلاتے، اگر ہم بل ادا کرنا چاہتے تو ازراہِ اخلاص ہمیں روک دیتے۔ اللہ نے ان کا بھی ہاتھ پکڑا اور کامیابی عطا فرمائی۔ اب وہ

بھی خیر سے صاحبِ اولاد ہیں اور ہمیں چائے پلانے اور ہم سے دعا کرانے کی وجہ سے موجوں میں ہیں۔

اُس زمانے میں ہماری بزمِ چائے نوشی میں کبھی کبھی عبدالقادر حسن بھی شریک ہوتے تھے۔ بقول ان کے یہ ان کی "غربت" کا دور تھا۔ اگرچہ مسندِ امارت پر ہم بھی فائز نہ تھے، تاہم وہ جن حالات سے دوچار تھے، اس اعتبار سے ہمارے نزدیک اور خود اپنے نزدیک بھی "زمرۂ مستحقین" میں آتے تھے۔ وہ بعض دفعہ تو مجھے گھر میں آپکڑتے اور بعض اوقات حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم کی دکان پر تشریف لے آتے اور پھر ہم باجماعت کسی ہوٹل میں جا ڈیرہ لگاتے ——

مَیں نے ایک دن ان سے کہا، گاؤں میں ایک مسجد بناؤ اور اس میں مدرسہ قائم کردو، وہ مدرسہ بے شک ناظرہ قرآن شریف پڑھنے والے دس لڑکوں پر مشتمل ہو، لیکن اس کا نام "جامعہ قادریہ حسنیہ" رکھو۔ لفظِ "جامعہ" جس کے معنی یونیورسٹی کے ہیں، بورڈ پر لکھنا نہایت ضروری ہے۔ دھڑا دھڑ چندہ آئے گا اور پاؤ بارہ ہو جائے گی۔ غربت کے سب دکھ دلدر دُور جائیں گے، بشرطیکہ اس "عظیم الشان جامعہ" میں زیادہ لڑکے داخل نہ کیے جائیں اور نصاب تعلیم ناظرہ قرآن سے آگے نہ بڑھے۔ پھر وارث شاہ کے الفاظ میں یہ ہوگا کہ :

نالے منگناں تے نالے گھورناجی دینے دار نہ کسے دا ہوونا جے

مست لشکدے جنگلاں دِچ پھرنا اتے غم نوں کھوہ ڈبوونا جے

مولانا نے میری اس معقول تجویز سے جزوی نہیں، کلّی اتفاق فرمایا۔ مگر بدقسمتی سے عبدالقادر حسن سے خدمتِ اسلام کا یہ سلسلہ شروع نہ ہو سکا۔ اب ماشاءاللہ وہ موج میں ہیں اور موجودہ سیاسی دور کی برکت سے "امروز" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تمام ارکانِ چائے نوشاں میں سے کسی کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، لیکن چائے بہرحال پینی ہے۔ اس بزم کا جو رکن بالکل خالی جیب ہوتا وہ ہماری اصطلاح میں "خلیفۃ المسلمین" کہلاتا۔ بعض دفعہ ہم آپس میں چندہ بھی کر لیتے تھے۔ لیکن مولانا کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ ایک دفعہ ہم ایک ہوٹل میں گئے، چائے پی، لیکن بل ادا کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ سب "خلیفۃ المسلمین" ہیں۔ میرے ایک دوست حاجی محمد رفیق زبیدی بھی موجود تھے، انھوں نے مشورہ دیا کہ چندہ کر لیا جائے اور ہر رُکن

اس کارِ خیر میں حسبِ توفیق چندہ دے۔ لیکن سچی بات ہے مَیں تو خلیفۃ المسلمین تھا، لہذا خاموش بیٹھا رہا۔ سوچا ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت، جو اُن کے ساتھ گزرے گی، وہی ہمارے ساتھ گزرے گی، گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر مولانا نے ازراہِ کرم مسئلہ حل کر دیا فرمایا "چندے کی عادت بُری ہے" اور چائے کے پیسے آپ نے اپنی جیب خاص سے ادا کر دیے۔

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ میں لوہاری دروازے کی طرف سے انارکلی میں داخل ہوا اور مولانا کو دیکھتے دیکھتے بخشی مارکیٹ کے قریب پہنچا تو مولانا پر نظر پڑی۔ مَیں نے دیکھا کہ مولانا شلوار قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو اس لباس میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پاجامہ کرتا یا پاجامہ قمیص ان کا لباس تھا۔ اب تو کبھی کبھی قومی لباس یعنی شلوار قمیص بھی پہن لیتے ہیں، لیکن اس زمانے میں نہیں پہنتے تھے۔ اس لباس میں مولانا مجھے عجیب سے معلوم ہوئے اور میری نظروں میں ان کا یہ لباس جچا نہیں۔ مگر مَیں نے اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔ خود ہی فرمایا:

"ہمارا لباس آپ نے دیکھا؟"

عرض کیا، "دیکھا۔"

فرمایا "کیسا ہے؟"

نہایت ادب سے عرض کیا، "بس ایک کسر ہے۔"

بولے "کیا؟"

عرض کیا "شلوار کے پائنچوں پر گوٹہ لگوا لیجیے۔"

کہا "گوٹہ؟"

عرض کیا "جی ہاں گوٹہ۔"

میری گھگھری نوں لوا دے گوٹہ
جے توں میری چال ویکھنی

بلاشبہ مولانا کی شان میں یہ "گستاخانہ" لفظ تھے، لیکن مولانا نے نہ صرف اسے برداشت کیا، بلکہ خوش ہوئے۔ پھر مَیں نے معذرت چاہتے ہوئے عرض کیا:

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

مولانا نے فرمایا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ روزانہ ملنے والوں اور ہر قسم کی گفتگو کرنے والوں کے درمیان تکلّف کی دیوار حائل نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے، مَیں اس قسم کی باتوں سے خوش ہوتا ہوں۔

جوابِ چائے یا "سلسلۂ بولیہ"

مولانا کی زندگی کا ایک اہم اور بنیادی موضوع "پیشابیات" ہے۔ اس کا ذکر بے شک پہلے بھی ہوٹلوں کے ضمن میں کئی بار آچکا ہے، تاہم اس کی "اہمیت" کے پیشِ نظر مستقل عنوان کے تحت اس کو بیان کرنا ضروری ہے۔ مولانا کسی کے گھر جائیں، کسی دفتر تشریف لے جائیں، کسی میٹنگ میں شرکت فرمائیں، ہوٹل میں چائے یا کھانے کے لیے جائیں، مسجد میں نماز کے لیے حاضری دیں، کسی جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیں، ریڈیو یا ٹیلی ویژن میں تقریر کے لیے مدعو کیے جائیں، شادی بیاہ کی تقریبات میں شریک ہوں، ہوائی جہاز پر فضا میں اڑ رہے ہوں، ریل یا بس میں سوار ہوں، حتّٰی کہ عدالتِ عالیہ کی دعوت پر کسی خاص مسئلے کی وضاحت کے لیے گئے ہوں، دو تین مرتبہ پیشاب کرنا ان کے واجبات میں شامل ہے۔
جس مقام پر بھی ان کا ورودِ مسعود ہوتا ہے، عام طور پر بیٹھنے سے پہلے دریافت فرما لیا جاتا ہے کہ غسل خانہ کدھر ہے۔ پھر ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسی جگہ بیٹھیں جہاں سے غسل خانہ قریب ہو۔ ایک مرتبہ ایوانِ صدر گئے تو وہاں بھی منتظمین سے غسل خانے کا محلِ وقوع دریافت فرمایا۔ مَیں نے کئی مرتبہ ان کو یہ "صائب مشورہ" دیا ہے کہ جس طرح کوٹھیوں میں کمرے کے ساتھ "اٹیچڈ باتھ" ہوتا ہے، اسی طرح آپ بھی اپنے ساتھ "اٹیچڈ پیشاب خانہ" بنا لیجیے، جہاں ضرورت محسوس ہوئی، فارغ ہو گئے۔ یا گشتی شفاخانے کی طرح "گشتی پیشاب خانہ" بنا لیجیے۔ وہ آپ کے ساتھ ساتھ "گشت" کرتا رہے گا۔ جگہ تلاش کرنے کی دقت ختم ہو جائے گی۔
لیکن انھوں نے میری اس تجویز پر عمل نہیں فرمایا۔
مولانا کے عملِ پیشاب کے کچھ لوازم ہیں۔ پہلے تو گھر سے اس فرض سے سبکدوش ہو کر چلیں گے۔ پھر منزلِ مقصود پر پہنچ کر کم سے کم تین مرتبہ پیشاب کرنا ضروری ہے۔ اوّل پہنچنے کے

فوراً بعد، دوم درمیان میں، سوم بوقتِ رخصت۔ اگر مقامِ ورود پر چائے کا اہتمام ہو تو ایک بار چائے سے پہلے اور دوبار چائے کے بعد۔ ہم ان کے اس عملِ مسلسل کو "علمی زبان" میں "بولوا قبل ان تبولوا" سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی پیشاب سے پہلے پیشاب کرلو، بالفاظِ دیگر یہ کام کرتے ہی رہو۔

مولانا کے پیشاب کی ہم نے دو قسمیں کی ہیں۔ اگر چائے کے بعد یعنی نتیجۂ چائے ہو، تو اس کا نام ہے "جواب چائے"۔ اگر نتیجۂ چائے نہ ہو، بلکہ سردی کی وجہ سے ہو یا کسی خاص واقعہ سے اثر پذیر یا غم گین ہونے کے باعث ہو، تو اس کا نام نامی ہوگا "سلسلہ بولیہ"۔

مولانا علمِ جغرافیہ، علمِ تاریخ اور کسی مقام کے محلِ وقوع وغیرہ سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ بلکہ اگر کوئی اس موضوع کی بات کرے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن عملِ پیشاب نے غیر شعوری طور پر ان علوم کا بھی ان کو کسی نہ کسی سطح پر عالم بنا دیا ہے۔ یعنی جس طرح بعض معاملات کا تعلق تاریخ کی مجبوری سے ہوتا ہے، اسی طرح ان کا تعلق عمل کی مجبوری سے ہے۔ مثلاً انھیں معلوم ہے کہ ان کے سکونتی شہر لاہور اور آبائی شہر گوجرانوالہ کے کس علاقے اور کس گلی میں مسجد کہاں ہے اور کس زمانے اور کس دور کی تعمیر شدہ ہے اور وہ "فارغ البول" ہونے کی غرض سے اس میں کتنی مرتبہ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی "وسعتِ علم" کا یہ عالم ہے کہ انھیں یہ بھی پتا ہے کہ ان مسجدوں کے پیشاب خانے کس طرف ہیں اور کتنے ہیں؟

ایک دن ہم نے مغرب کی نماز مسجد مبارک میں پڑھی۔ نماز کے بعد موچی دروازے پہنچے اور اس کے سامنے کی گھاٹی سے اتر کر چیمبرلین روڈ پر آئے۔ سردیوں کے دن تھے۔ گوال منڈی کے چوک میں پرانی سبزی منڈی پہنچے تو ارشاد ہوا۔

"مولوی اسحاق، پیشاب لگ رہا ہے"۔

عرض کیا، "اب صبر کیجیے، پیشاب کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے"۔

فرمایا "یہاں ایک مسجد ہے"۔

مَیں نے کہا "مسجد یہاں نہیں ہے"۔

زور دے کر فرمایا، "ہے اور اس گلی میں ہے، پیشاب خانہ مسجد کے دروازے

کے باہر ہے اور بغیر کواڑکے ہے ۔ میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہوں ۔ آیئے دکھاؤں ۔"

ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوئے اور سیدھے پیشاب خانے پر جا کھڑے ہوئے اور فرمایا

" یہ ہے وہ مقام جس کا میں محلِ وقوع اور حدودِ اربعہ بیان کر رہا تھا ۔"

سچی بات ہے کہ اس موضوع سے متعلق میں اُن کی ہمہ گیریٔ علم اور فراوانیٔ معلومات سے نہایت متاثر بلکہ مرعوب ہوا ، اور اس کی دل کھول کر داد دی ۔

مولانا اگر کسی خاص واقعہ سے متاثر ہوں یا کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہوں تو پیشاب گھٹا باندھ کر آجاتا ہے اور پھر یہ " سیلِ رواں " تھمنے کا نام نہیں لیتا ــــ ۱۹۵۶ کی بات ہے کہ فلسفہ کانگریس میں شرکت کے لیے ڈھاکے تشریف لے جانے کا پروگرام بنا ۔ یہ ان کا پہلا ہوائی سفر تھا ، اس سے قبل ہوائی جہاز پر سوار ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا ۔ روانگی سے ایک دن پہلے حسبِ معمول شام کے بعد انار کلی کے ایک ہوٹل میں ملاقات ہوئی اور فرمایا :

" آج خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے ہوائی سفر کے بارے میں فارسی کا ایک محاورہ بیان کیا " ہرچہ برباد است ، برباد است ۔" یہ محاورہ ذہن میں تیزی سے گھوم رہا ہے اور ہزار کوشش کے باوجود ذہن سے نکلنے کا نام نہیں لیتا ۔ اب میں اس سفر سے ڈر رہا ہوں "ــــ بولے " ٹکٹ لے لیا ہے اور جانا ضروری ہے ، کیا کروں ، یہ محاورہ سننے کے بعد پیشاب بھی کثرت سے آنے لگا ہے ۔"

دوسرے دن ہوائی اڈے پہنچے تو پھر وہی بات ۔ عرض کیا " فکر نہ کریں ، بے شمار لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں ، یہ دیکھیے یہاں کتنے لوگ کھڑے اور بیٹھے ہیں ، جو مختلف مقامات کو جانے کے لیے ہوائی جہازوں میں سوار ہوں گے ۔ ان شاء اللہ آپ خیریت سے واپس آئیں گے "ــــ لیکن کچھ اثر نہیں ہوا ، وہاں بھی دو تین دفعہ غسل خانے گئے ۔

ان کے ایک ساتھی فیصل آباد کے ایک صاحب تھے جو وہاں کے ایک کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے ۔ وہ بھی فلسفہ کانگریس میں جا رہے تھے اور دلچسپ آدمی تھے ۔ ان کی بیوی ان کو رخصت کرنے آئی تھیں ۔ وہ بھی پریشان سی تھیں ، شوہر سے کہنے لگیں ۔

" ڈھاکے جا کر ٹیلی فون یا تار کے ذریعے اپنی خیریت کی اطلاع دیجیے گا ۔"

پروفیسر صاحب بولے ، " اللہ کی بندی ! ٹیلی فون یا تار کی کیا ضرورت ہے ، رات کو ریڈیو

سُن لینا اور صبح کو اخبار دیکھ لینا، اگر اس ہوائی جہاز کے حادثے کی خبر نہ ہو تو سمجھ لینا خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔"

فلسفہ کانگریس سے فارغ ہو کر واپس آئے تو مولانا نے بتایا، "جاتے ہوئے مارے ڈر کے، ہوائی جہاز میں پیشاب کرتے کرتے بُرا حال ہو گیا۔ واپسی پر البتہ ذہن میں کچھ سکون تھا، اس لیے پیشاب بھی کم آیا۔" ساتھ ہی بتایا کہ ہم ڈھاکے جا کر کانگریس ہال میں پہنچے تو پہلا اجلاس ختم ہو چکا تھا اور لوگ ہال سے باہر نکل رہے تھے۔ کہا آپ دیر سے آئے ہیں۔ مَیں نے کہا، آپ بتا دیجیے، کیا کارروائی ہوئی۔ ہم آمین کہنے والوں میں سے ہیں۔ آمین کہہ دیں گے۔

فلسفۂ کانگریس کے سلسلے میں ایک اور لطیفہ سنیے۔

ہر شخص کوئی نہ کوئی فقہی مسلک رکھتا ہے اور ظاہر ہے اس مسلک سے اسے محبت ہوتی ہے اور اس کے ماننے والوں سے بھی اسے اُنس ہوتا ہے۔ وہ کسی جگہ ہو اور کسی مجلس میں ہو، اپنے فقہی مسلک سے وابستگی رکھنے والے لوگوں سے ملاقات کی خواہش لازماً اس کے دل میں کروٹ لے گی ——— ایک مرتبہ کراچی میں فلسفہ کانگریس کا اجلاس ہوا۔ مولانا رکن کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔ کئی دن اجلاس جاری رہا۔ اس اثنا میں مولانا کا جی اہل حدیث حضرات سے ملنے کو چاہا۔ ان دنوں اتفاق سے لاہور کے ہمارے ایک دوست میجر محمد حسین بابری بھی کراچی گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اخبار میں فلسفہ کانگریس کا ذکر پڑھا اور دیکھا کہ مولانا حنیف ندوی بھی اس میں مقالہ پڑھیں گے تو وہ پوچھتے پچھاتے وہاں جا پہنچے جہاں فلسفہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا اور مولانا سے ملے۔ مولانا نے ان سے کہا، یہاں بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا ہوں، اہل حدیث کی کوئی مسجد قریب ہو تو وہاں جا کر اہل حدیث حضرات سے ملنا چاہیے۔ میجر صاحب نے انھیں بتایا کہ مَیں نے یہاں آتے ہوئے ایک مسجد دیکھی ہے، جس پر "غربائے اہلِ حدیث" کا بورڈ آویزاں ہے۔ چنانچہ وہ مولانا کو اس مسجد میں لے گئے۔ ان میں سے بعض حضرات مولانا کو جانتے تھے، بہت اچھی طرح ملے اور چائے وغیرہ پلائی۔ ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا۔

"مولانا! آپ یہاں کب آئے اور کس سلسلے میں تشریف آوری ہوئی؟"

فرمایا "یہاں فلسفہ کانگریس کا اجلاس ہو رہا ہے، اس میں شرکت کے لیے آیا ہوں"۔
پوچھا، "وہ کیا ہوتی ہے؟"
مولانا نے اس کی تھوڑی بہت وضاحت کی اور فرمایا "اس میں مختلف ملکوں کے مشہور فلسفی شامل ہوتے ہیں اور مقالے پڑھتے ہیں"۔
پوچھا "کن کن ملکوں کے فلسفی شامل ہوتے ہیں؟"
بتایا "امریکہ، برطانیہ، فرانس، چین، روس، پاکستان اور ہندوستان وغیرہ ملکوں کے"۔
اس پر ایک صاحب نہایت مخلصانہ لہجے میں بولے: "مولانا! اللہ تعالیٰ نے ماشاءاللہ آپ کو تبلیغ کا بہت اچھا موقع دیا ہے۔ سب کو اہل حدیث بنا دیجیے"۔
یہ لطیفہ لاہور آکر مجھے خود مولانا نے بھی سنایا اور میجر صاحب نے بھی سنایا۔
دسمبر ۱۹۸۱ کے آخری ہفتے میں کچھ دوستوں کی دعوت پر ہم اسلام آباد گئے۔ مجھے وہاں کمیونٹی سنٹر میں "حدیث اور فقہ کے باہمی ربط" کے عنوان سے مقالہ پڑھنا تھا اور مولانا کی صدارت تھی۔

ہم ریل کار سے گئے تھے اور ریل کار ہی سے واپس آئے۔ پانچ گھنٹے کے اس سفر میں مولانا کے لیے کم سے کم چار مرتبہ چائے پینا اور آٹھ مرتبہ اس کے "جواب عرض کرنا" ضروری تھا۔ واپسی پر ہمیں چائے خانے کے قریب سیٹیں ملیں، اس سے دوسری جانب آخر میں بیت الخلا تھا، اس کے قریب چند خواتین بیٹھی تھیں۔ مولانا پانچ چھ مرتبہ تو گئے، پھر پنجابی میں کہا۔ "بار بار جاندیاں شرم آوندی اے، عورتاں کہن گیاں بابے نوں کی آخر آئی اے"۔
ایک دفعہ ہمیں ایک میٹنگ میں ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) جانا تھا۔ فرمایا "ٹرین کا کتنے گھنٹے کا سفر ہے؟"
عرض کیا "تقریباً چار گھنٹے کا"۔
بولے "سدھا کہو چھ پیشاباں دا"۔۔۔۔ پھر کہا، چاول کھانے والے علاقے کے لوگ رات کو کئی بار پیشاب کے لیے اٹھتے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ کتنی رات باقی ہے تو "پیشابوں" کے حساب سے بتاتے ہیں کہ دو پیشابوں یا تین پیشابوں کی رات ابھی باقی ہے۔

یہی حساب ہمارے سفر کا ہے۔

میں اس زعم میں تھا کہ مسئلۂ پیشابیات اور سلسلۂ بولیہ میں مولانا کا کوئی حریف نہیں۔ جب ایک چائے کا "جوابِ چائے" دو مرتبہ ظہور پذیر ہو تو بہ ظاہر معاملہ تسلی بخش ہے اور ہم غالب کی زبان میں دھڑلے سے کہہ سکتے ہیں :

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

لیکن میرے مہربان دوست جناب میرزا ادیب کا فرمانِ واجب الاذعان ہے کہ وہ اس میدان میں مولانا سے آگے ہیں۔ وہ ایک چائے نوش فرمائیں تو کم سے کم تین مرتبہ جوابِ چائے عرض فرماتے ہیں۔ مگر وہ مولانا کی رفتار سے بھی مایوس نہیں ہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ مطمئن ہیں ———— جب سے میرزا صاحب کو مولانا کے اس وصف کا علم ہوا ہے، ان کے دل میں مولانا کی وقعت بہت بڑھ گئی ہے۔ تاہم بقول ان کے ان کا نمبر مولانا سے بہرحال پہلے آتا ہے۔ اب ہم مولانا کی خدمتِ اقدس میں عرض کریں گے۔

سنبھل کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

تعبیرِ رویا

تعبیرِ رویا یعنی خواب کی تعبیر کو قرآن نے "تاویل الاحادیث" قرار دیا ہے۔ یہ اللہ کا ایک عظیم عطیہ ہے۔ اس سے اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خاص طور سے نوازا تھا، جس کا ذکر سورۂ یوسف میں تفصیل سے فرمایا گیا ہے۔ صحابہ و تابعین اور ہمارے اسلافِ کرام میں متعدد حضرات تعبیرِ رویا میں مہارت رکھتے تھے اور اس کا ذکر مختلف کتابوں میں موجود ہے اور اس کی مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ مولانا حنیف ندوی بھی اس علم سے بہرہ ور ہیں اور مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی مرحوم کو بھی اللہ نے تعبیرِ رویا کا ملکہ عطا فرمایا تھا — مثال کے طور پر میں یہاں اپنا ایک خواب بیان کرتا ہوں۔ خواب سے پہلے اصل واقعہ سنیے۔

۱۹۵۴ء، ۱۹۵۵ اور ۱۹۵۶ میں مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی تین کتابیں شائع ہوئیں۔ اول

" سید احمد شہید"، دوم " جماعتِ مجاہدین" اور " سوم " سرگزشت مجاہدین"۔ میں اس زمانے میں ہفت روزہ " الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا۔ مہر صاحب مرحوم نے یکے بعد دیگرے یہ تینوں کتابیں مجھے تبصرے کے لیے بھجوائیں۔ میں نے ان پر تفصیل سے تبصرہ کیا۔ " سرگزشتِ مجاہدین" کے لیے مہر صاحب نے مجھ سے کچھ معلومات بھی حاصل کیں جو اس کتاب میں میرے نام کے حوالے سے درج ہیں۔ اب خواب شروع ہوتا ہے جو میں نے اکتوبر ۱۹۵۶ میں دیکھا۔

خواب یہ ہے کہ میں نمازِ عصر کے بعد اپنے دفتر واقع شیش محل روڈ سے بھاٹی دروازے کی طرف بائیں جانب فٹ پاتھ پر جا رہا ہوں۔ ابھی چند قدم چلا تھا کہ دیکھتا ہوں سامنے اسی طرف سے ایک بزرگ آرہے ہیں، جن کی سفید داڑھی ہے۔ وہ سفید عمامہ، پاجامہ نما سفید شلوار اور لمبا سفید کرتہ پہنے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں عصا ہے، سرخ و سفید رنگ اور بارعب شخصیت۔ میں نے ان کو دیکھتے ہی دل میں کہا یہ تو سید احمد شہید بریلوی ہیں جو میرے پاس تشریف لا رہے ہیں اور میں باہر جا رہا ہوں۔ میں چل بھی رہا ہوں اور یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ یہ فارسی بولیں گے اور مجھے فارسی بولنے کی مشق نہیں۔ پھر فوراً خیال آتا ہے، یہ پرانے زمانے کی فارسی میں بات کریں گے، اس میں کام چلا لوں گا۔ اتنے میں میں سید صاحب کے قریب ہو جاتا ہوں اور سید صاحب میرے قریب آجاتے ہیں اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" السلام علیکم"۔

میں جواب میں " وعلیکم السلام" کہتا ہوں اور دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیتا ہوں۔ پھر گردن جھکا کر نیازمندی سے ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ سید صاحب نہایت شفقت سے مسکراتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" آپ نے مہر صاحب کی کتابوں پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ مجھے بہت پسند آیا، آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے"۔

سید صاحب نے یہ بات مختلف الفاظ میں کئی دفعہ ارشاد فرمائی۔ میں نیازمندانہ انداز میں عرض کرتا ہوں۔

" آپ کا شکریہ، بہت بہت شکریہ، آپ نے میرا تبصرہ پسند فرمایا، میں آپ کا

انتہائی شکر گزار ہوں" —— خواب ختم — !

اتنے میں آنکھ کھل گئی اور میں اُٹھ گیا۔ یہ میرے لیے ایک عجیب و غریب خواب تھا۔ سوچا یہ خواب تعبیر طلب ہے۔ مولانا ندوی سے اس کی تعبیر لینی چاہیے۔ شام کو معمول کے مطابق مولانا سے ملاقات ہوئی تو خواب بیان کیا۔ فرمایا، بہت اچھا خواب ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ آپ اردو میں رجال پر کام کریں گے، جس طرح مہر صاحب نے برصغیر پاک و ہند کے مجاہدین کی ایک بہت بڑی جماعت اور اس سے تعلق رکھنے والے رجال کے حالات لکھے ہیں، اسی طرح آپ بھی ایک خاص طبقے کے رجال کا تذکرہ ضبطِ تحریر میں لائیں گے جو اہلِ علم میں مقبول ہوگا۔

اس تعبیر سے قدرتی بات ہے میں بہت خوش ہوا، لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ مجھے اس کا موقع کیوں کر ملے گا اور ایسے حالات کہاں میسّر آئیں گے کہ میں اتنا بڑا کام کر سکوں۔

اس سے چند روز بعد مولانا جعفر شاہ پھلواروی مرحوم سے ملاقات ہوئی تو ان سے بھی یہ خواب بیان کیا۔ انھوں نے بھی وہی تعبیر دی جو مولانا نے دی تھی، لیکن اس پر مزید یہ فرمایا کہ "پرانی فارسی کے بارے میں جو آپ کے ذہن میں خیال آیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ رجال کا تذکرہ لکھتے وقت فارسی کی قدیم اور پرانی کتابوں سے مدد لیں گے اور یہ کتابیں آپ کا ماخذ ہوں گی، جن کے آپ حوالے دیں گے۔"

یہ خواب حرف بحرف مجھے یاد رہا اور اس کی تعبیر بھی ذہن میں گردش کرتی رہی۔ اس سے ٹھیک نو سال بعد ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ کو میرا ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے تعلق پیدا ہوا۔ یہاں آکر میں نے پہلے محمد بن اسحاق ابن ندیم ورّاق کی مشہور عربی کتاب "الفہرست" کا اردو ترجمہ کیا اور حل طلب مقامات پر حواشی لکھے۔ ترجمہ اور حواشی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد ایک اور کتاب "برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ" لکھی۔ پھر "فقہائے ہند" کے نام سے برصغیر پاک و ہند کے اصحابِ علم اور اربابِ فقہ کے حالات و سوانح اور علمی و فقہی کارنامے معرضِ کتابت میں لانا شروع کیے۔ حوالوں کے لیے عربی کتابوں سے بھی مدد لی لیکن زیادہ تر قدیم فارسی مآخذ و مصادر میرے سامنے رہے۔ اب تک ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کی طرف سے پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک اس کی نو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے ـــــ دعا ہے اللہ تعالیٰ تکمیل کے سامان فراہم فرمائے۔ آمین

یہ میرے خواب کی وہ تعبیر ہے جو آج سے اٹھائیس برس پہلے مولانا محمد حنیف ندوی نے دی تھی۔

ایک عجیب و غریب واقعہ

مولانا کے واقعات میں سے ایک اور واقعہ جو یہاں بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ ایک دن مَیں مولانا کے گھر گیا، ان کے بچوں نے جو مجھے "چاچا جی" کہتے ہیں، کہا:

"چاچا جی آپ پندرہ منٹ لیٹ آئے ہیں۔"

پوچھا "کیا مطلب؟"

مولانا بھی موجود تھے اور خاموش بیٹھے مُسکرا رہے تھے۔ بچوں نے بتایا۔

آج ابی پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی جو ایک گھنٹے تک رہی اور آپ کے آنے سے پندرہ منٹ پہلے ختم ہو گئی۔

مَیں اس کیفیت کے بارے میں سمجھ گیا تھا، کیوں کہ اس سے قبل خود مولانا مجھے بتا چکے تھے، تاہم مَیں نے پوچھا۔

"کیا کیفیت؟"

اب سنیے مولانا پر کیا کیفیت طاری ہوتی تھی۔ مولانا نے ایک دفعہ بتایا کہ بعض اوقات ان کو سوتے میں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شے ایک نوجوان لڑکی کی شکل میں ان کے پاس آتی اور ان سے ہم کلام ہوتی ہے اور اپنا نام کلثوم بتاتی ہے۔ وہ باتیں کرتی ہے تو گھر کے لوگ اس کی نہیں، مولانا کی باتیں سنتے ہیں اور پھر اسی عالم میں ان سے کچھ پوچھتے ہیں تو وہ جو جواب دیتے ہیں بالکل صحیح ہوتا ہے ـــــ اس کو ہم "ہوائی کیفیت" سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن یہ ایسی "ہوائی" نہیں تھی جو "کسی دشمن نے اڑائی" ہو۔ فی الواقع ان پر یہ کیفیت طاری ہوتی تھی جو گھنٹے آدھ گھنٹے یا اس سے کم یا زیادہ وقت تک رہتی تھی۔ اس سے کسی قسم کی ذہنی یا جسمانی

تکلیف کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن ہم شام کے بعد انارکلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے، دوسرے دن عید تھی۔ مولانا نے ہنس کر کہا:

"کل عید ہے، لیکن جیب میں کوئی پیسہ نہیں ہے"۔ بات ختم ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم ہوٹل سے نکلے اور بھاٹی دروازے آئے۔ مولانا اپنے گھر جانے کے لیے تانگے پر سوار ہوئے اور میں اپنے گھر لوہاری دروازے چلا گیا۔ میں ان دنوں لوہاری دروازے کے اندر گمٹی بازار کے قریب رہتا تھا۔

اس زمانے میں ہم عید کی نماز منٹو پارک میں پڑھتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر پہلے میرے گھر آتے اور چائے پیتے۔ پھر مولانا اپنے گھر (بھونڈ پورہ چوک) چلے جاتے۔ کئی سال اسی طرح ہوتا رہا۔ اب تقریباً بائیس تیئس برس سے (جب سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی فوت ہوئے ہیں) نہ میں منٹو پارک عید پڑھنے گیا ہوں، نہ مولانا حنیف ندوی گئے ہیں۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ عید کی نماز پڑھ کر ہم منٹو پارک سے روانہ ہوئے تو راستے میں مولانا نے ایک عجیب و غریب بات سنائی۔ فرمایا، رات میں نے ہوٹل میں آپ سے کہا تھا کہ "کل عید ہے لیکن جیب میں کوئی پیسہ نہیں ہے"۔ یہ صحیح بات تھی، واقعی کوئی پیسہ نہیں تھا۔ میں جنازگاہ سے آگے سعدی پارک جا کر بائیں جانب تانگے سے اُترا تو یکایک ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوئی۔ بولی

"میں کلثوم ہوں، میرے ساتھ آیئے"۔

وہ سڑک پار کر کے دائیں جانب کو قبرستان (میانی صاحب) کی طرف مڑی اور میں اُس کے پیچھے پیچھے ــــ سڑک پر بے شمار لوگ چل پھر رہے تھے اور مجھے شرم آتی تھی کہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ اتنے میں وہ قبرستان میں داخل ہوئی اور ایک پرانی قبر پر مجھے جا کھڑا کیا۔ اس نے مجھے پانچ پانچ روپے کے پانچ نوٹ یعنی پچیس روپے دیے اور اس کے بعد وہیں غائب ہو گئی۔ مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ پھر وہاں سے چلا اور گھر آ گیا۔ مولانا نے یہ واقعہ سنانے کے بعد وہ پانچ نوٹ نکالے اور مجھے دکھائے، بالکل نئے تھے۔ اس کے بعد ان پر یہ کیفیت کبھی طاری

نہیں ہوئی۔ یہ کم و بیش پچیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔

قرآنِ مجید سے رہنمائی

مولانا کو اگر کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو یا کسی پریشانی میں مبتلا ہوں تو عام طور پر قرآنِ مجید سے رہنمائی حاصل کرتے اور بارگاہِ خداوندی میں پریشانی سے نجات پانے کی دُعا کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضو کر کے قرآنِ مجید پکڑتے اور قبلہ رُو ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر درود شریف کے بعد اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھتے ہیں۔ بعد ازاں سورہ فاتحہ تلاوت کرتے ہیں اور اھدنا الصراط المستقیم بار بار پڑھتے اور دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ قرآنِ مجید انسانوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ مَیں جس کام کے بارے میں فریاد کر رہا ہوں، اس میں میری رہنمائی فرما۔ اس کے بعد قرآن مجید کھولتے ہیں اور آمنے سامنے کے دونوں صفحوں کی آیات غور سے پڑھتے ہیں اور ان کے الفاظ سے درپیش مسئلے کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ان کے ایک عزیز کا لڑکا بغیر اطلاع دیے گھر سے نکل گیا، کئی دن پتا نہ چلا کہ کہاں ہے۔ وہ سخت پریشانی کی حالت میں مولانا کے پاس آئے۔ مولانا نے یہی عمل کیا اور فرمایا، لڑکا مَری یا کسی اور پہاڑی مقام پر گیا ہے اور خیریت سے ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں، جلد واپس آجائے گا۔ چنانچہ وہ اسی دن شام کو بخیر و عافیت واپس آگیا، اس نے بتایا کہ وہ دوستوں کے ساتھ سیر کے لیے مَری گیا تھا۔

مَیں نے بھی ایک دفعہ تجربہ کیا۔ ۱۹۷۶ کی بات ہے میرے بعض دوستوں نے چونیاں (ضلع قصور) کے ایک شخص کو (جس کو اس سے پہلے میں نہیں جانتا تھا اور بعد میں بھی وہ مجھے نہیں ملا) خط دے کر میرے پاس بھیجا۔ قصہ یہ تھا کہ ان دونوں میاں بیوی نے حج بیت اللہ کے لیے درخواست دی تھی جو منظور ہوگئی تھی۔ لیکن ان کا ایک ہی لڑکا تھا جس کی عمر چھ سات سال کی تھی اور قانون کے مطابق وہ اس کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ مگر وہ لڑکے کو گھر بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے، اس لیے کہ ان کے بعد اس کو کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔ اس زمانے میں امورِ حج کے وزیر مولانا کوثر نیازی تھے۔ وہ شخص چاہتا تھا کہ مَیں اس کے ساتھ

اسلام آباد جاؤں اور مولانا کوثر نیازی سے کہوں کہ بچے کو والدین کے ساتھ حج پر جانے کی اجازت دی جائے۔ میرے دوستوں کا جو خط لے کر وہ آیا تھا، اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ میں اس کام کے لیے اس کے ساتھ اسلام آباد جاؤں ــــ لیکن میں اس کام کے لیے اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہر چند معذرت کی، مگر اس کے سخت مجبور کرنے پر مجھے اس کے ساتھ اسلام آباد جانا پڑا۔ راستے بھر یہ پریشانی لاحق رہی کہ معلوم نہیں وزیر صاحب کس طرح پیش آتے ہیں اور کام ہوتا بھی ہے یا نہیں ہوتا۔ صبح کو راولپنڈی پہنچے اور اخبار لیا تو دیکھا کہ دوبارہ اعلان کیا گیا تھا کہ سولہ سال سے کم عمر بچے والدین کے ساتھ حج پر نہیں جا سکتے۔ اب میری گھبراہٹ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ساتھی نے کہا کسی ہوٹل میں جا کر ناشتہ کریں، لیکن میں کھانا پینا سب بھول چکا تھا۔ نماز کے لیے مسجد میں گیا، نماز پڑھی اور معمول کے مطابق قرآنِ مجید کی تلاوت کی۔ طبیعت بے حد پریشان۔ تلاوت کے بعد مولانا ندوی والا عمل کیا تو سورۂ کہف کی اس آیت پر نظر پڑی۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ○

یعنی اے پروردگار ہم پر اپنی بارگاہ سے رحمت نازل فرما اور ہمارے اس کام کے لیے کامیابی کا سامان مہیا کر دے۔

قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ان شاء اللہ ہم اپنے اس نیک مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ وزیرِ موصوف کے دفتر پہنچے تو استقبالیہ میں بہت سے لوگ ملاقات کے لیے بیٹھے تھے، بعض لاہور کے لوگ بھی تھے جو میرے ملنے والے تھے۔

میں نے متعلقہ آدمی کو اپنا نام بتایا تو اس نے پوچھا:

”مولانا کوثر نیازی آپ کو جانتے ہیں؟“

میں نے کہا ”جب وزیر نہیں تھے تو جانتے تھے، وزیر بننے کے بعد آج پتا چلے گا، جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔“

میرے نام کی چِٹ وزیر صاحب کی خدمت میں پہنچی تو فوراً بلا لیا اور پہلے لوگ بیٹھے کے بیٹھے ہی رہے۔ میں نے صاحبِ معاملہ کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔ مولانا کوثر نیازی

نہایت احترام سے ملے، خیر خیریت کے مبادلے کے بعد آمد کا مقصد پوچھا۔ مدّعا بیان کیا تو کہا:

"آج کا اخبار پڑھا ہے؟"

جواب دیا، "روزانہ صبح کو اخبار پڑھتا ہوں، آج بھی پڑھا ہے اور میرے پاس موجود ہے، حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے۔"

فرمایا "درخواست لکھی ہے؟"

عرض کیا "نہیں۔"!

سیکرٹری سے کاغذ منگوایا اور خود ہی درخواست لکھوائی۔ وہ بولتے گئے، میں لکھتا گیا۔ صاحبِ معاملہ تحصیل چونیاں کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، ان سے پوچھا: "بچے کے کرائے وغیرہ کے روپے چونیاں کے بینک میں جمع کرائیں گے یا پتوکی میں"۔ جواب دیا "پہلے پتوکی میں جمع کرائے ہیں، یہ بھی وہیں جمع ہوں گے"۔ مولانا نیازی نے لکھ کر دستخط کر دیے۔ ہم نہایت خوش ہوئے اور اجازت لے کر باہر آ گئے۔ لاہور کے ایک صاحب کو جو ایک مشہور ماہانہ رسالے کے ایڈیٹر اور مالک ہیں اور میرے ملنے والے ہیں اور ہم سے پہلے سے استقبالیہ میں بیٹھے تھے، دوسرے دن کی تاریخ ملی۔ انھوں نے مجھ سے کہا "میرے پاس گاڑی ہے، جہاں آپ جانا چاہتے ہیں، چھوڑ آؤں۔"

اسلام آباد میں مختلف محکموں کے دوستوں سے مل کر ہم رات کو لاہور آ گئے۔

مولوی علاء الدین مرحوم کا وعظ اور زلزلہ

گوجرانوالہ کے ایک پرانے بزرگ مولوی علاؤ الدین مرحوم تھے۔ بہت نیک اور متقی بزرگ تھے۔ مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے کے شاگرد تھے۔ گوجرانوالہ کی چوک نیائیں کی جامع مسجد اہل حدیث میں مولانا محمد اسماعیل مرحوم ۱۹۲۱ء میں آئے، ان کی آمد سے پہلے اس مسجد میں مولوی علاؤ الدین ہی امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، اسی بنا پر اس مسجد کو "مولوی علاؤ الدین کی مسجد" کہا جاتا ہے۔ مولانا حنیف ندوی نے بتایا کہ ساٹھ باسٹھ سال قبل کی بات ہے، مولوی علاؤ الدین مرحوم اس مسجد میں خطبۂ جمعہ دے رہے تھے اور قرآن مجید میں جو زلزلۂ قیامت کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس کے متعلق وعظ بیان کر رہے تھے۔

وعظ نہایت مؤثر تھا اور لوگ شدتِ تاثر سے اس طرح رو رہے تھے جیسے واقعی اس زلزلے کی زد میں آگئے ہوں۔ اتنے میں سچ مچ زلزلہ آگیا، زمین ہلنے لگی اور مسجد کی دیواریں لرز گئیں۔ لوگوں نے سمجھا قیامت آگئی ہے اور وہ زار و قطار رونے لگے۔

مولانا ندوی نے بتایا کہ وہ اس وقت مسجد میں موجود تھے، یہ منظر واقعی قیامت کا منظر تھا۔

گرفتاری اور قید

مولانا نے آزادئ برّصغیر کی تحریک میں عملاً حصّہ لیا۔ انگریزی حکومت کی مخالفت کی اور اس کی پاداش میں گرفتار ہوئے اور چھ مہینے قصور جیل میں رہے۔

مولانا کا تعلق اس زمانے میں نوجوان بھارت سبھا سے تھا۔ یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ گرفتاری کے وقت مولانا بیمار تھے اور ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق انھیں تپ دق ہوگئی تھی، لیکن اسی حالت میں انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کیں اور گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو مجسٹریٹ نے کہا آپ بیمار ہیں، اگر معافی مانگ لیں تو بری کر دیے جائیں گے۔ ان کے بعض ملنے والوں نے بھی یہ رائے دی، لیکن مولانا نے معافی مانگنے سے انکار کر دیا اور اپنے موقف پر قائم رہے۔ سزا سنانے کے بعد انھیں قصور بھیج دیا گیا۔ قصور، گوجرانوالہ سے تقریباً اسّی میل کے فاصلے پر ہے اور اس زمانے میں اتنا لمبا سفر کر کے کسی قیدی سے ملاقات کرنا نہایت مشکل تھا۔ جیل میں خوراک وغیرہ کا انتظام بھی اس دور میں بہت ناقص تھا۔

گوجرانوالہ کے ممتاز دیوبندی عالم مولانا محمد چراغ کا تعلق بھی اس دور میں نوجوان بھارت سبھا سے تھا، وہ بھی ان کے ساتھ ہی گرفتار اور قید ہوئے تھے۔ ان کا "جرم" بھی انگریزی حکومت کی مخالفت تھا۔ انھیں نو مہینے کی سزا ہوئی تھی اور وہ بھی قصور جیل میں تھے۔

دعا اور اُس کا اثر

قید کی مدت ختم ہونے پر مولانا ندوی رہا ہوئے تو بیماری بھی بڑھ گئی اور کمزوری بھی زیادہ ہوگئی۔ ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے کہا تپ دق دوسرے درجے کو پہنچ گئی ہے۔ یہ نہایت تشویش ناک بات تھی۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم جو ان کے انتہائی مشفق

استاد تھے، انھیں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے ضلع ہزارہ کے ایک قصبے "کھلابٹ" لے گئے اور وہاں کے رئیس خاں مہدی زمان خاں کے ہاں ٹھہرے جو مولانا اسماعیل کے مخلص دوست تھے اور مولانا ندوی سے بھی تعلق رکھتے تھے۔

کھلابٹ ایک صحت افزا مقام ہے۔ ایک دن خاں صاحب ممدوح مولانا اسماعیل مرحوم اور مولانا ندوی کو پہاڑ کے نشیب میں ایک نالے پر لے گئے اور بتایا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سے جہاد کے لیے مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید کا قافلہ گزرا تھا۔ یہ سن کر مولانا ندوی پر رقت طاری ہوگئی اور وہیں بیٹھ گئے۔ پھر اللہ کی بارگاہِ عالی میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ مولانا فرماتے ہیں، میں دعا سے فارغ ہوا تو ایسے محسوس ہوا کہ بخار اُتر گیا ہے اور بیماری ختم ہوگئی ہے۔ یہ بات مہدی زمان خاں صاحب اور مولانا اسماعیل صاحب کو بتائی تو وہ معائنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر کی دکان پہاڑ کے اوپر تھی۔ اس نے تھرمامیٹر منہ میں رکھا اور کہا، بخار سو درجے سے کچھ اوپر ہے۔ مولانا نے کہا بخار بالکل نہیں ہے۔ وہ چوں کہ پہاڑ کے نشیب سے آئے ہیں اور چڑھائی کی وجہ سے سانس پھول گیا ہے، اس لیے بخار کا شبہ ہوتا ہے۔ دس منٹ بعد دیکھیے گا۔ چنانچہ دس بارہ منٹ کے بعد دیکھا گیا تو بالکل ٹھیک تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیماری دُور کر دی اور صحت و تندرستی کی نعمت عطا فرمائی۔

"مولبی جی"

مولانا کے مسجد مبارک کے مقتدیوں میں سے ایک بزرگ مولوی عبداللہ گھڑی ساز ہیں۔ بہت نیک اور دھیمے آدمی ہیں۔ اصلاً پٹیالہ (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے ہیں اور قیامِ پاکستان کے قبل سے لاہور میں مقیم ہیں۔ پہلے گھڑی سازی کا کام کرتے تھے اور ہسپتال روڈ پر ان کی دُکان تھی۔ اب اللہ کے فضل سے حالات بدل گئے ہیں اور انارکلی میں نیو الانا واچ کمپنی کے مالک ہیں ——— زمانۂ خطابت میں بھی اور اس کے بعد بھی۔ مولانا کا یہ معمول رہا کہ نمازِ جمعہ کے بعد ان کی دکان پر ہسپتال روڈ تشریف لے جاتے، عام طور پر میں بھی ساتھ ہوتا۔ مولوی عبداللہ ہمیں خود چائے بنا کر پلاتے اور نہایت عقیدت و محبت کا برتاؤ کرتے۔ گھر کے بعض معاملات میں ہم سے مشورہ بھی لیتے اور مولانا کو "مولبی جی" کہتے ہیں۔ مجھ پر بہت

شفقت فرماتے ہیں۔ جب بھی ملاقات ہو محبت سے پوچھتے ہیں۔

"مولبی جی کا کیا حال ہے۔ مولبی جی کو میرا اسلام کہنا۔ آپ اور مولبی جی دکان پر آیا کریں، مَیں شام تک وہیں رہتا ہوں۔"

ہم نیو الانا واچ کمپنی میں کبھی ان سے ملاقات کو جائیں تو نہایت خوش ہوتے ہیں اور کھلانے پلانے میں مخلصانہ تکلف سے کام لیتے ہیں۔ ان کے لڑکے بھی انتہائی احترام سے پیش آتے ہیں۔

اُس زمانے میں مولوی عبداللہ کے ساتھ اُسی ہسپتال روڈ والی دُکان میں ایک صاحب احمد علی خاں مرحوم تھے۔ وہ چینی کے برتن بیچتے تھے اور مولانا کے معتقد اور میرے مشفق تھے۔ وہ بھی مولانا کے منتظر رہتے اور اُن سے دُکھ سُکھ کرتے۔

شیخ عظیم اللہ مرحوم

مسجد مبارک میں مولانا کے مقتدیوں میں ایک بزرگ شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ تھے۔ شیخ صاحب مرحوم وکالت کرتے تھے۔ ان کا مکان اور دفتر مسجد مبارک کے ساتھ تھا۔ وہ گلی انہی کے نام سے عظیم سٹریٹ کہلاتی ہے۔ شیخ صاحب کُلّے پر مشہدی پگڑی باندھتے تھے۔ پُرانی وضع کے بہت نیک آدمی تھے۔ بعض دفعہ کسی وجہ سے مولانا خطبہ جمعہ کے لیے تشریف نہ لا سکتے تو شیخ صاحب جمعہ پڑھاتے۔ وہ عام طور پر جمعے کے روز عدالت سے سیدھے مسجد آتے اور مولانا کی عدم موجودگی میں اسی لباس میں منبر پر کھڑے ہو جاتے۔ خطیب کی داڑھی منڈھی ہوئی، پنٹ کوٹ پہنے اور ٹائی باندھے ہوئے، سر پر کُلّے والی پگڑی، یہ عجیب و غریب منظر ہوتا۔ پہلے عربی خطبہ پڑھتے، پھر قرآنِ مجید کی کوئی آیت تلاوت کرتے اور اس کا ترجمہ کر کے موضوع کے مطابق اُردو میں بچے تلے انداز میں مختصر تقریر کرتے۔ نئے آنے والے لوگ حیران ہوتے کہ اہلِ حدیث کی مسجد میں داڑھی منڈھا آدمی انگریزی لباس پہن کر خطبہ دے رہا ہے۔ شیخ صاحب مرحوم صرف خطبہ دیتے تھے، نماز نہیں پڑھاتے تھے، نماز مسجد کے مستقل امام پڑھاتے۔

سائیکل چلانا اور ٹکرانا ایک انگریز کی موٹر سے

قیامِ پاکستان سے قبل مولانا مغل پورہ گنج رہتے تھے اور وہاں سے روزانہ درسِ قرآن

کے لیے مسجد مبارک آتے تھے۔ اگر جیب میں پیسے ہوتے تو ریل سے آتے، ایک طرف کا کرایہ ایک آنہ تھا۔ یعنی آمد و رفت کے دو آنے خرچ ہوتے تھے اور اس زمانے میں دو آنے بڑی قیمت رکھتے تھے۔ اگر پیسے نہ ہوتے تو یہ سفر پیدل طے ہوتا۔ درسِ قرآن نمازِ مغرب کے بعد ہوتا تھا، اس میں اسلامیہ کالج کے اساتذہ و طلبا کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ شریک ہوتے تھے۔ مسجد مبارک کے قریب برانڈرتھ روڈ پر لاہوری مرزائیوں کی انجمن اشاعتِ احمدیہ کا دفتر تھا۔ بعض دفعہ یہ لوگ بھی آجاتے اور متنازعہ مسائل میں ان سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ انجمن اشاعتِ احمدیہ کے صدر اور لاہوری مرزائیوں کے امیر مولوی محمد علی لاہوری سے بھی بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ مذہبی بحثوں کا دور تھا اور اس ضمن میں بہت سی دلچسپیوں کا حامل تھا۔

اس دور کا ایک واقعہ یہ ہے کہ روز روز کے کرائے سے بچنے اور آمد و رفت کی سہولت کے لیے آپ نے سائیکل خریدا۔ پہلے دن اس پر سوار ہوئے تو ہاتھ کانپنے لگے اور توازن بگڑ گیا اور یہ طے کر لیا کہ کسی سے بہرحال ٹکرانا ہے۔ لیکن کس سے ٹکرائیں؟ یہ فیصلہ ابھی زیرِ غور تھا کہ اتنے میں ایک انگریز کی کار پر نظر پڑی جو سامنے سے آرہی تھی۔ کار قریب آئی تو اللہ کا نام لے کر سائیکل اس میں دے مارا، خود نیچے گر پڑے اور سائیکل کا وہی حال ہوا جو کار کے ساتھ ٹکرانے سے ہونا چاہیے تھا۔ حسنِ اتفاق سے انگریز کوئی شریف آدمی تھا، فوراً کار سے اترا، مولانا کو جو نیچے گرے ہوئے تھے، اٹھایا، ان کے کپڑوں سے مٹی جھاڑی اور اظہارِ افسوس کیا۔ پوچھا:

"ویل مولوی ہے؟"

فرمایا "ہاں!"

کہا "اسی لیے ایسا کیا۔"

پھر اس نے سائیکل پر نگاہ ڈالی، اس کا حلیہ بگڑ چکا تھا، اس کو ٹھیک کرانے کے لیے پیسے دیے، مولانا اور ان کے سائیکل دونوں کو تانگے پر سوار کرایا اور کرایہ دے کر گھر پہنچایا۔ اس کے بعد آپ نے سائیکل نہیں چلایا۔ یہ حضرت کے سائیکل چلانے کا پہلا اور آخری دن تھا۔

ایک روپیہ ماہانہ

مولانا کے ایک اور مقتدی تھے، وہ بھی بہت مخلص اور نیک آدمی تھے۔ ان کو اپنی کسی ملازمت کی دس یا بارہ روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ جس دن انھیں پنشن ملتی، سیدھے مولانا کے گھر جاتے اور ایک روپیہ ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تمام زندگی ان کا یہ معمول رہا کہ وہ ہر مہینے اپنی پنشن سے ایک روپیہ مولانا کو دیتے۔ ان کا نام ان کو یاد نہیں رہا۔ لیکن یہ واقعہ کئی دفعہ بیان کیا۔

خواجہ اللہ دتہ مرحوم

مولانا کے ایک مقتدی خواجہ اللہ دتہ تھے۔ ان کی مولانا بہت تعریف کرتے ہیں، بڑے پرہیزگار اور صاحبِ دل آدمی تھے۔ مرحوم کا یہ معمول تھا کہ خطبہ جمعہ کے وقت خطیب کے بالکل سامنے منبر کے ساتھ بیٹھتے اور نہایت انہماک اور توجہ سے خطبہ سنتے۔ اگر کبھی مولانا کے پاجامے کے پائنچے ٹخنوں سے نیچے ہوتے تو آہستہ سے موڑ کر اوپر کر دیتے۔ اسی طرح اگر مولانا خطبے میں صرف لفظِ "اللہ" بولتے اور "اللہ تعالیٰ" نہ کہتے تو خطبے کے بعد علیحدگی میں نرمی سے مولانا سے کہتے، "اللہ تعالیٰ کہا کریں"۔

مولانا نے ان کی نیکی کا ایک عجیب واقعہ سنایا اور وہ یہ کہ ان کے ایک بیٹے خواجہ عبدالعزیز تھے، وہ بھی بہت نیک اور متدین آدمی تھے۔ اے جی آفس میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ وہ اگر گھر سے باہر ہوتے اور بیمار پڑ جاتے اور خواجہ اللہ دتہ کو بیٹے کی بیماری کا پتا چل جاتا تو وہ محلے میں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرتے جو بیمار ہو اور غریب ہو، پھر اس کا علاج کراتے۔ ان کا تجربہ تھا کہ جس دن وہ غریب بیمار صحت یاب ہو جاتا، اسی دن خواجہ اللہ دتہ کے بیٹے خواجہ عبدالعزیز کا خط آجاتا کہ اللہ نے ان کو صحت عطا فرما دی ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ خواجہ عبدالعزیز کی بیماری کی اطلاع آئی، لیکن باپ کو گاؤں میں کوئی مریض نہ ملا جس کا وہ علاج کرا سکیں۔ اتفاق سے ایک گدھے پر نظر پڑی جو بہت زخمی ہو چکا تھا۔ خواجہ اللہ دتہ نے ایک شخص سے رابطہ پیدا کیا جو ڈنگر ڈھوروں کا علاج کرتا تھا۔ چنانچہ گدھے کا علاج ہونے لگا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے کہ جس دن گدھا تندرست ہوا، اسی دن

خواجہ عبدالعزیز صحت یاب ہو گئے۔

خواجہ اللہ دتہ مرحوم کو تو میں نے نہیں دیکھا، البتہ ان کے بیٹے خواجہ عبدالعزیز مرحوم میرے بہت مشفق بزرگ تھے اور خلوص و اتقا میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے بیٹے خواجہ عبداللہ، خواجہ محمد یوسف اور خواجہ قاسم میرے مخلص دوستوں میں سے ہیں اور مولانا کے عقیدت مند۔!

ایک عید کا واقعہ

منٹو پارک لاہور میں عیدین کی نماز مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم پڑھاتے تھے۔ وہ انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے اور اس "جرم" کی پاداش میں مختلف اوقات میں تقریباً بارہ سال جیل میں رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ کسی سیاسی تحریک میں جیل گئے تو جیل سے پیغام بھجوایا کہ عید کا خطبہ مولانا محمد حنیف ندوی ارشاد فرمائیں۔ مولانا ندوی خطبے کے لیے کھڑے ہوئے تو چینیاں والی مسجد کے ایک منتظم بابو شجاع الدین مرحوم نے جو نہایت نیک اور مخلص آدمی تھے، اعتراض کیا کہ مولانا ندوی کی ڈاڑھی چھوٹی ہے۔ اس پر ایک شور بپا ہو گیا اور سب نے شجاع الدین مرحوم کے اس اعتراض کو محسوس کیا اور کہا کہ مولانا ہی خطبہ ارشاد فرمائیں گے۔ پہلے تو مولانا نے انکار کیا لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو خطبہ شروع فرمایا۔ تقریر نہایت فصیح و بلیغ تھی۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی عید پڑھنے آئے تھے اور تقریر میں موجود تھے۔ وہ مولانا کی تقریر، ان کی زبان اور فصاحت و بلاغت سے بے حد خوش ہوئے اور نماز کے بعد مولانا کے پاس جا کر انھیں عید کی مبارک باد اور تقریر کی داد دی۔

یہ آزادیٔ برصغیر سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہے جو میں نے بعض حضرات سے سنا اور موقعے کی مناسبت سے یہاں بیان کر دیا گیا۔

لکھنؤ کا ایک مناظرہ

آزادی سے قبل برصغیر پاک و ہند میں مناظروں کا بہت رواج اور زور تھا۔ مولانا ندوی بھی اس فن سے آگاہ تھے اور مناظرے کرتے تھے۔ طالب علمی کے دور ہی میں ان کی طبیعت اس طرف راغب ہو گئی تھی، لیکن اس کو انھوں نے "پیشہ" نہیں بنایا، کبھی کبھی یہ شغل فرماتے تھے۔ زیادہ تر آریہ سماجیوں سے ان کے مناظرے ہوئے۔

ایک مرتبہ جب کہ یہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے، مشہور آریہ سماجی مناظر دھرم بھکشو لکھنؤ گئے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں اسلام پر سخت حملے کیے، اس کی تعلیمات کا مضحکہ اُڑانا شروع کیا اور مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج دیا۔ ان دنوں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم بھی لکھنؤ گئے ہوئے تھے اور حسبِ معمول ندوۃ العلما میں اقامت گزیں تھے۔ انھوں نے مولانا حنیف ندوی سے کہا کہ اسلام کی حقانیت کے موضوع پر دھرم بھکشو سے مناظرہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ ندوہ کے قریب ڈالی گنج میں مناظرہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ وقتِ مقررہ پر مولانا اور ندوہ کے اساتذہ و طلبا ڈالی گنج پہنچے۔ لکھنؤ کے بہت سے مسلمان اور ہندو وہاں موجود تھے۔ مناظرہ شروع ہوا، حاضرین مولانا کے دلائل سے بہت متاثر ہوئے اور دھرم بھکشو کسی بات کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ لیکن اس نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی۔ واپس آئے تو سید صاحب مناظرے کی روداد سننے کے لیے بے تاب تھے۔ پوچھا "مناظرہ کیسا رہا؟" جواب دیا "میں تو جیت گیا ہوں لیکن دھرم بھکشو نہیں ہارا"۔ مطلب یہ تھا کہ اس نے دلائل میں ناکامی کے باوجود اپنی ہار نہیں مانی۔ سید صاحب اس جواب پر مسکرائے اور مولانا کی حوصلہ افزائی کی۔

کراچی میں رام چندر سے مناظرہ

رام چندر آریہ سماج کا ایک معروف مناظر اور منجھا ہوا مقرر تھا۔ عربی، فارسی، اردو وغیرہ زبانیں جانتا تھا۔ قرآن کی بے شمار آیات اُسے ازبر تھیں، بہت لسّان اور چرب زبان تھا۔ مولانا کا اس سے کراچی میں مناظرہ ہوا۔ مسلمان اور ہندو کثیر تعداد میں مناظرے میں موجود تھے۔ ڈھائی تین گھنٹے سلسلۂ بحث جاری رہا۔ مناظرے میں بنیادی چیز حاضر دماغی اور بروقت جواب سوجھ جانا ہے۔ جس شخص میں یہ صفت پائی جاتی ہے وہ کامیاب مناظر ہے۔ رام چندر نے قرآن کی چند آیات پڑھ کر مولانا سے کہا:

"مجھے آپ کی الہامی کتاب قرآنِ مجید کی بہت سی آیات زبانی یاد ہیں، جہاں سے آپ کہیں پڑھ سکتا اور ان کا مطلب بیان کر سکتا ہوں، کیا آپ بھی ہمارے کسی وید کا کوئی حصہ پڑھ سکتے اور اس کے معانی بیان کر سکتے ہیں؟"

مولانا نے جواب دیا: "یہ آپ کا نہیں، میری کتاب کا کمال ہے کہ دشمن اور کافر کے سینے میں بھی محفوظ ہے اور آپ کی کتاب خود آپ کو بھی یاد نہیں۔"

ڈھائی تین گھنٹے بحث جاری رہی۔ بالآخر رام چندر نے ہتھیار ڈال دیے اور بھرے مجمے میں اعلان کیا کہ

"میں ہار گیا اور حنیف ندوی جیت گئے۔"

پھر اس نے مولانا کے گلے میں ہار ڈالا۔ مولانا کے دلائل سے متاثر ہو کر کراچی کا ایک ہندو وکیل سٹیج پر آیا اور اس نے ہندو مذہب ترک کر کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا اعلان کیا۔

ایک قادیانی سے بحث

1950ء کی بات ہے، اپریل کا مہینہ تھا کہ میں اور مولانا ندوی "الاعتصام" کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں جہلم گئے۔ وہاں کی مسجد اہل حدیث کے خطیب مولانا عبدالمجید دینانگری مرحوم تھے، پیکرِ خلوص اور انتہائی مہمان نواز تھے۔ ہمارا قیام مسجد سے متصل ایک مکان میں تھا۔ عشا کے بعد دس بجے کے قریب ایک قادیانی مبلّغ اپنے چند رفقا کے ساتھ مسجد میں آیا اور بعض مسائل میں مولانا عبدالمجید دینانگری سے بحث شروع کر دی۔ مولانا دینانگری بحث و مباحثوں کے عادی نہ تھے۔ انھوں نے مولانا حنیف ندوی کو بلا لیا۔ اور چند منٹ کی گفتگو کے بعد قادیانی مبلّغ دوڑ گیا۔

خفا ہونا مولانا کا اس بندۂ عاجز پر

میری ایک عادت ہے جو اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ زندگی کا جز بن گئی ہے اور وہ عادت یہ ہے کہ جو شخص مجھے کسی کام کے لیے کہے میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے وقت صرف کرتا ہوں، بھاگ دوڑ کرتا ہوں اور جہاں جانا ممکن ہو، جاتا ہوں۔ بعض چھوٹے چھوٹے کام بھی ہوتے ہیں اور بعض اہم بھی ــــ! بسا اوقات "اہم" اور "غیر اہم" کا فیصلہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ صاحبِ غرض کے نزدیک تو سب کام اہم ہوتے ہیں اور جو اُن کی تکمیل میں اس کی مدد کرنا چاہے وہ انھیں اہم ہی قرار دیتا ہے، لیکن جو شخص نہ کرنا چاہے وہ دوسرے کے بڑے سے بڑے کام کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے نزدیک اہم اور غیر اہم کے درمیان خطِ امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ جو شخص کسی مشکل میں پھنس گیا ہے وہ

کسی کے نزدیک چھوٹی ہو یا بڑی، اس سے نکالنے کے لیے اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔ بہر حال مجھے کامیابی ہو یا نہ ہو میں کسی دوست کا کام کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں بلکہ اس مسئلے کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لیتا ہوں۔ لیکن مولانا کو میری یہ عادت پسند نہیں، وہ مجھ پر خفا ہوتے ہیں اور فرمایا کرتے ہیں کہ آپ اس چوہدراہٹ میں کیوں پڑتے ہیں اور لوگوں کے لیے کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ یہ فضول عادت ہے، اسے چھوڑ دیں — مولانا بھی صحیح فرماتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگ کام بھی عجیب و غریب قسم کے میرے ذمے لگا دیتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو، میں نہیں چاہتا کہ کسی دوست کا دل توڑوں یا اسے ٹھیس پہنچاؤں۔ اس سلسلے میں اپنا مسلک وہی ہے جو انیسؔ کا تھا۔ یعنی

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میرے نزدیک ہر نقصان پورا ہو سکتا ہے اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کی تلافی کی جا سکتی ہے لیکن کسی کا دل دکھانا، اس کو ٹھیس پہنچانا اور اس کی جائز توقعات کو مجروح کرنا اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اگر تھوڑی بہت کوشش اور بھاگ دوڑ سے کسی کا کچھ سنور جاتا ہے تو میرے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ تاہم مولانا کو اس سے اتفاق نہیں۔ لیکن آپ کان قریب کریں تو راز کی بات بتاؤں، اکثر اوقات خود مولانا بھی اپنے کام کے سلسلے میں "چوہدراہٹ کے تاج" کے لیے میرے ہی کمزور سر کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر بار بار دریافت فرماتے ہیں، میرا کام ہوا یا نہیں ؟ بعض دفعہ سختی سے بھی کہتے ہیں، "اس کام میں دیر نہ کرو، جلدی کرو، فلاں آدمی سے یا جس سے مناسب سمجھو ملو اور پھر مجھے بتاؤ" — اور میں کوشش کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کام ہو جاتا ہے۔

اگر تعلّی پر محمول نہ کیا جائے تو عرض کروں کہ میں خود اپنے ذاتی کام کے لیے کسی دوست کو تکلیف دینے میں بہت محتاط ہوں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، دوستوں کو آزمائش میں ڈالنے سے بچتا ہوں۔ بسا اوقات اپنے جائز بلکہ انتہائی ضروری کام کے لیے بھی کسی مہربان

کے دروازے پر دستک دینے سے گریز کرتا ہوں ـــــ اگر کام کی نوعیت ایسی ہو کہ کسی سے کہنا بھی پڑے تو ایک دفعہ کہتا ہوں، بار بار کہنے اور اسے پریشان کرنے کی بالکل عادت نہیں۔

مولانا کو نماز کی تلقین

مولانا حنیف ندوی کو طویل عرصے سے گھٹنوں کی تکلیف ہے۔ وہ نہ زیادہ چل پھر سکتے ہیں، نہ کھڑے ہو سکتے ہیں، نہ سیڑھیوں پر چڑھ سکتے ہیں، نماز میں سجدہ کرتے ہوئے بھی ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ تشہد میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں۔ ان عوارض کی وجہ سے وہ زیادہ تر گھر ہی میں نماز پڑھتے ہیں۔ چوک بھونڈپورہ (مزنگ) میں جہاں کم و بیش تیس سال یہ مقیم رہے، ان کے مکان کے بالکل قریب مسجد ہے۔ لیکن ان کے لیے مسجد میں جانا مشکل تھا، گھر ہی میں نماز پڑھتے تھے۔ ان کے محلے کے لوگوں کو کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ کوئی میاں جی کہتا تھا، کوئی حکیم جی، کوئی بابا جی اور کوئی مولوی صاحب کہہ کر پکارتا تھا۔ ایک دن ایک بزرگ نے ان کو روک لیا اور نہایت نرمی سے کہا:

"میاں جی! میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

کہا "فرمایئے۔"

بزرگ نے کہا "خفا نہ ہوں تو عرض کروں۔"

فرمایا "بالکل خفا نہیں ہوں گا، آپ فرمایئے۔"

کہا "نماز پڑھا کریں۔"

فرمایا "میں نماز پڑھتا ہوں، لیکن گھر میں پڑھتا ہوں، بعض تکلیفوں کی وجہ سے (جو ان بزرگ کو بتائیں) مسجد میں آنا مشکل ہے۔"

یہ سن کر وہ بزرگ خوش ہوئے اور مولانا کی صحت کے لیے اللہ سے دعا کی۔

پالینا "دس ہزاری منصب" کا

گزشتہ صفحات میں متعدد مقامات پر مولانا کی تنگ دستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن انھوں نے زمانۂ تنگ دستی میں بھی نہ دوستوں کے ہاں آنا جانا بند کیا اور نہ مسجد مبارک کا خطبہ جمعہ اور روزانہ کا درسِ قرآن اس سے متاثر ہونے دیا۔ جیب میں پیسہ ہو یا نہ ہو،

چل پڑے ہیں اور نہایت اطمینان سے درسِ قرآن بھی دے رہے ہیں اور خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرما رہے ہیں۔ ان کی تنگ دستی اس زمانے میں یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ تکیوں کے لیے غلاف میسر نہ تھے اور کہیں آنے جانے کے لیے پیسہ حاصل کرنا مشکل تھا۔ خود مولانا نے ایک دفعہ بتایا کہ ایک دن ہمارے ایک مخلص دوست محمد حسین بابری انھیں کہیں لے جانا چاہتے تھے۔ بابری صاحب سائیکل پر سوار تھے اور مولانا کو تانگے پر بٹھایا، مگر تانگے کا کرایہ جو دو آنے تھا، دونوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ بابری صاحب دو آنے ایک دکان دار سے مانگ کر لائے۔ مولانا فرماتے ہیں، میں تانگے پر بیٹھا تھا، بابری صاحب کو دکان دار سے دو آنے مانگتے ہوئے دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور دعا کی "یا اللہ! اگر ہمیں کچھ نہیں دیتا تو ہمارے دوستوں کی غربت تو دور فرما۔"

اب ۳۰ — جولائی ۱۹۸۴ کو پاکستان کے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر محمد افضل کی صدارت میں مولانا کے ساتھ ایک شام منائی گئی تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے مولانا کو صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے دس ہزار روپے کا چیک پیش کیا، اس طرح "بفضلِ افضل" مغل دور کی اصطلاح میں مولانا "دس ہزاری" ہو گئے ہیں اور ماشاء اللہ موج میں ہیں۔ محمد حسین بابری[1] صاحب کی مالی پریشانیاں بھی ان کے بچوں میں تقسیم ہو گئی ہیں اور ان کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ یعنی مولانا کی دعا بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو گئی۔

نزاکتِ احساس کے چند واقعات

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مولانا کی تصانیف و مضامین کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کامل یکسوئی اوّلین شرط ہے۔ ذرا ذہن دوسری طرف منتقل ہوا، سب کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ ان کی تحریریں اس درجے نازک مزاج ہیں کہ کسی صورت میں "شرکتِ غیر" برداشت نہیں کرتیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جس اردو میں وہ لکھی گئی ہیں، وہ پورے

---

[1] بابری صاحب ہمارے انتہائی مخلص دوست تھے، ہم انھیں میجر صاحب کہا کرتے تھے، افسوس ہے ۸ فروری ۱۹۸۶ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عربستان میں گھومتی ہوئی ان کے پاس پہنچی ہے۔ ان کی تقریروں کا بھی یہی حال ہے۔ اسی لیے کچھ لوگ ان کو "ثقیل" قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مارو یا چھوڑو، ان کو پوری طرح سمجھنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ میں نے بظاہر ثقہ قسم کے بعض لوگوں کو مولانا کی تقریر میں اونگھتے اور جمائیاں لیتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی ان کے لیے مولانا کی تقریر "نیند آور" ہوتی ہے۔ اس قسم کی حرکت کرنے والوں پر غصہ بھی آتا ہے، مگر بات چوں کہ ہمارے بس سے باہر ہوتی ہے، اس لیے دل پر پتھر رکھ کر سب کچھ دیکھنا اور برداشت کرنا پڑتا ہے۔

خود مولانا بھی انتہا درجے کے حساس ہیں اور ان کی نزاکتِ احساس کا یہ عالم ہے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ ان کی کسی تقریر یا اسلوبِ نگارش کے بارے میں لب کشائی کی جائے، یا یہ عرض کیا جائے کہ الفاظ مشکل ہیں یا مولانا کی زبان میں یوں کہیے کہ "عسیر الفہم" ہیں، آسان اور "یسیر الفہم" ہونے چاہئیں، یا یہ کہ فلاں بات جو انھوں نے بیان فرمائی ہے، اس میں اختصار یا "ایجاز" پایا جاتا ہے، اسے قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا تو سمجھنے میں آسانی ہوتی، تو فوراً ان کا موڈ بدل جاتا ہے، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور اس طرح کے الفاظ کہنے والا ان کی بارگاہِ فضیلت میں "جاہل" قرار پاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ لوگ ہمارے مخاطب ہی نہیں، یہ ہماری بات سمجھ ہی نہیں پاتے، ہمارے مخاطب پڑھے لکھے لوگ ہیں، جہلا نہیں۔

پھر کوئی تبصرہ نگار ان کی کسی تصنیف سے متعلق اگر ایسے الفاظ لکھ دے جو اُن کے نقطۂ نظر سے درجۂ صحت کو نہ پہنچتے ہوں، یا مطلب کو زیادہ واضح نہ کرتے ہوں، یا بدقسمتی سے کتاب کے کسی حصے سے اظہارِ اختلاف کر بیٹھے تو ان کے لیے یہ بات سخت تکلیف دہ ہوتی ہے، جس پر فانی کا یہ شعر حرف بحرف صادق آتا ہے:

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

اس کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں:

۱۹۴۰ سے ۱۹۴۹ کے شروع تک مولانا نے لاہور کی مسجدِ مبارک میں خطابت اور

درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابتدا میں ان کے سامعین پڑھے لکھے اور "سلیکٹڈ" لوگ تھے۔ وہ اگرچہ "عدداً" کم تھے لیکن علمی اعتبار سے "وزناً" اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ میں قیامِ پاکستان کے بعد جو نمازی اور سامعین مسجد مبارک میں آئے وہ عدداً بے شک زیادہ تھے لیکن علمی لحاظ سے خاص اہمیت کے مالک نہ تھے۔ بس وعظ و نصیحت سننے کے عادی تھے، زیادہ گہری علمی اور فکری باتیں سننا اور ہضم کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ لوگ مولانا کے خطبے اور درس میں آتے اور بیٹھ کر چلے جاتے، ان کے پلّے کچھ نہ پڑتا۔ مولانا اپنی بات ان کے کان تک تو پہنچا سکتے تھے، حلق میں نہیں اتار سکتے تھے۔ بالآخر انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مولانا کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ صورتِ حال مولانا کے لیے قابلِ برداشت نہ تھی اور وہ اپنا معیارِ تقریر اور اسلوبِ کلام عوامی اور واعظانہ سطح پر نہیں لا سکتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ اُکتا کر درس و خطابت کا سلسلہ ہی ترک کر دیا۔

مولانا اٹھارہ انیس برس سے مسجدِ مبارک سے منسلک تھے۔ اس اثنا میں قرآن مجید کے درس میں شروع سے آخر تک تین مرتبہ قرآنِ مجید ختم کیا۔ خطبۂ جمعہ میں بھی دو دفعہ قرآن مجید ختم کر کے تیسری مرتبہ سورہ والتین تک پہنچ گئے تھے، یعنی آخری پارے کی چند سورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ مولانا کے بعد خطبے کا سلسلہ تو جاری رہا اور حاضری بھی بہت بڑھ گئی مگر علم کی گہرائی اور زبان کی فصاحت و بلاغت کی جو روایت مولانا نے لاہور کی کسی مسجد میں قائم کی تھی باقی نہ رہی، اور پھر درسِ قرآن تو بالکل بند ہو گیا۔ مولانا درس کے لیے انتہائی تنگ دستی کے عالم میں دُور کی مسافت طے کر کے باقاعدہ آتے تھے، مگر ان کے بعد کسی نے اس طرف عنانِ توجہ مبذول فرمانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

مسجدِ مبارک کے نمازی تو شاید مولانا کو بھول گئے کہ ان کی زبان "اوکھی" ہے اور نمازیوں کے لیے اس کو سمجھنا مشکل ہے، لیکن مولانا ان کو نہیں بھولے۔ وہ ۱۹۵۲ میں گوجرانوالہ سے دوبارہ لاہور آئے تو نمازِ مغرب کے بعد پھر وہاں سلسلۂ درس شروع کر دیا، میں بھی اس میں مولانا کے ساتھ جاتا تھا۔ لیکن یہ درس روزانہ نہیں، ہفتہ وار ہوتا تھا۔ کئی مہینے یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر علالت یا کسی اور مجبوری کی بنا پر بند کرنا پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح مولانا میری کمزوری ہیں، اسی طرح مسجدِ مبارک مولانا کی کمزوری ہے

وہاں جانے کے لیے وہ بہانے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اپنے پرانے مقتدیوں میں انھیں پروفیسر عبدالقیوم کے والد بزرگ وار منشی فضل الدین مرحوم بالخصوص یاد آتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نہایت مخلص اور فہیم شخص تھے، میرے بہت مہربان تھے۔

مولانا کو قرآن مجید سے انتہائی شغف ہے اور ان کا درسِ قرآن بہت سی خصوصیات کا حامل ہوتا تھا اور نئے نئے تفسیری عقدے سامعین کے سامنے کھلتے تھے۔ زبان واسلوب میں بھی بے مثل تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ زبان "اوکھی" تھی اور مولانا کے سامعین جو آزادیِ وطن کے بعد تشریف لائے، "سوکھیاں گلاں" سننے کے عادی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس "اوکھ" اور "سوکھ" کے چکر نے ایک بے حد علمی روایت ختم کردی۔

مَیں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولانا کی نزاکتِ احساس کا یہ عالم ہے کہ اپنی مقررکردہ سطح سے ذرا بھر نیچے اُترنا برداشت نہیں کیا، لیکن مسجد چھوڑ دی جسے علمائے کرام بڑی جدوجہد سے حاصل کرتے ہیں اور اگر حاصل ہوجائے تو نمازی ان سے مطمئن ہوں یا نہ ہوں وہ مسجد نہیں چھوڑتے۔ ان کے نزدیک مسجد "چھجو دے چبارے" کی حیثیت رکھتی ہے، "جو چھجو دے چبارے اوہ بلخ نہ بخارے"۔ نمازی متعدد دھڑوں میں بٹ جاتے ہیں، مسجدمیں کئی کئی جماعتیں ہونے لگتی ہیں اور امام یا خطیب کی مخالفت و موافقت میں مقتدیوں کے باقاعدہ محاذ قائم ہوجاتے ہیں، بعض سنجیدہ قسم کے لوگ روز روز کی اس جھک جھک سے تنگ آکر مسجد میں آنا بند کردیتے ہیں، مگر امام اور خطیب کو اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ نہ وہ اپنی کسی خلافِ شرع حرکت سے باز آتے ہیں اور نہ مسجد کی خطابت و امامت سے دست کش ہوتے ہیں۔ بس :

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

لیکن مولانا ندوی کی ذہنی کیفیت اس قسم کے علما سے بالکل مختلف ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے سامعین ان کی بات سمجھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو کھونڈی ہاتھ میں پکڑی اور "باز آئے ہم محبت سے سنبھالو پان دان اپنا" کہتے ہوئے مسجد سے باہر نکل گئے۔

مولانا کی نزاکتِ احساس کے بارے میں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر معلوم ہوتا ہے کہ اگست

۱۹۴۹ میں گوجرانوالہ سے اخبار" الاعتصام" جاری ہوا، مولانا اس کے ایڈیٹر تھے اور میں ان کا معاون اور خادم ــــ! وہاں ایک بزرگ حاجی اللہ دتہ تھے جو وہاں کی انجمن اہل حدیث کے صدر تھے۔ مرحوم اپنی ذات سے بڑے نیک اور پارسا آدمی تھے، لیکن زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، البتہ امیر آدمی تھے، اور ہماری اس قسم کی انجمنوں کی صدارت کے لیے اصل "کوالیفکیشن" یہی ہے، جس کی جیب کا بوجھ زیادہ ہو، اسے انجمن کی صدارت متفقہ طور پر تفویض کر دی جاتی ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ مستقل طور پر اس کے نام الاٹ کر دی جاتی ہے، ایسے مناصب کے لیے بے چارے علم کو کوئی نہیں پوچھتا ــــ داناؤں سے سنا ہے کہ ایک منفی ہوتی ہے اور ایک مثبت، یعنی نیگیٹو اور پازیٹو ــ اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں تو روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ مذہبی انجمنوں میں "نیگیٹو" سے مراد علم ہے اور" پازیٹو" سے مراد دولت۔ جو خوش نصیب اس صفت سے متصف ہو، یعنی علم سے محروم اور دولت سے بہرہ مند ہو، وہ کسی انجمن کی صدارت کا منصب پالینے میں نہایت آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے اور پھر تادمِ مرگ اس پر قائم رہتا ہے۔

ایک دن حاجی اللہ دتہ مرحوم نے بہت سے لوگوں کے سامنے جن میں مولانا اسماعیل مرحوم بھی تھے، مولانا نے کہا" آپ اخبار میں اتنے مشکل الفاظ لکھتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتے، مولوی نور حسین کی طرح آسان الفاظ لکھا کریں تاکہ ہم سمجھ سکیں۔" حاجی صاحب کے علم کے اعتبار سے یہ بات غلط نہ تھی، لیکن مولانا کی نزاکتِ طبع کے منافی تھی۔ جواب دیا "حاجی صاحب! آپ دعا کریں میں بھی مولوی نور حسین ہو جاؤں" ــ یہ الفاظ فرماتے وقت مولانا کے چہرے اور لہجے میں خفگی کے آثار نمایاں تھے، لیکن حاجی صاحب خاموش رہے، نہ مولانا کی "درخواست" کے مطابق" دعا" فرمائی اور نہ کوئی اور بات کہی۔

مولانا نور حسین گھرجاکھی مرحوم کا نام آیا ہے تو جی چاہتا ہے ان کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ وہ اپنے دور کے مشہور واعظ، مبلغ اور مناظر تھے۔ پنجابی میں بڑی مؤثر تقریر کرتے تھے، پنجابی کے شاعر بھی تھے، میرے بہت کرم فرما تھے۔ میں اس زمانے میں "الاعتصام" میں" ہمارے علما" کے عنوان سے مرحومین و موجودین علما کا تعارف لکھا کرتا

تھا۔ ایک دن مولانا نور حسین نے مجھ سے فرمایا "تم علما کا تذکرہ کس طرح لکھتے ہو، بہت عمدگی سے واقعات بیان کرتے ہو۔"

اس وقت مولانا اسماعیل سلفی مرحوم اور مولانا حنیف ندوی بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا حنیف صاحب تو خاموش رہے، مولانا اسماعیل مرحوم نے بے تکلفی سے فرمایا، "مولوی نور حسین! یہ حسنِ طلب ہے۔" پھر مجھ سے فرمایا" اسحاق! ان کا تعارف بھی لکھ دو، لیکن مجھ سے پوچھ کر لکھنا۔"

یہ بھی کیا عجیب دور تھا۔ ایک مرتبہ مولانا نور حسین بیمار ہوگئے، وہ مولانا حنیف ندوی کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ ایک دن نماز فجر کے وقت مجھ سے کسی نے کہا کہ "مولانا نور حسین وفات پاگئے ہیں" مجھے انتہائی افسوس ہوا، تھوڑی دیر بعد اخبار چھپنے کے لیے پریس کو جانے والا تھا۔ میں مولانا ندوی کی طرف دوڑا اور مولانا نور حسین کی وفات کی اطلاع دی۔ وہ بہت مغموم ہوئے اور اخبار کے لیے تعزیتی اداریہ لکھنا شروع کر دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی، مولانا نور حسین زندہ ہیں۔ میں پھر مولانا ندوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے چند سطریں لکھ لی تھیں۔ اب ہم دونوں بعض حضرات کے ساتھ ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے، وہ بیمار تو تھے لیکن کوئی تشویش کی بات نہ تھی۔ مرحوم بہت زندہ دل اور خوش مزاج تھے۔ مولانا ندوی نے ہنس کر فرمایا:

"اسحاق صاحب کے کہنے سے میں نے تعزیتی اداریہ بھی لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن آپ تو اچھے بھلے ہیں، اب پھر لکھنا پڑے گا۔"

مولانا نور حسین اُٹھ کر بیٹھ گئے، قہقہہ لگایا اور بولے:

"اچھا آپ کے نزدیک میں اتنی اہمیت کا مالک ہوں، مجھے سنایے کیا لکھا ہے تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ میرے بعد مجھے یاد کیا جائے گا، سننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں بتا سکوں کہ میرے متعلق کون سی بات صحیح ہے اور کون سی صحیح نہیں۔"

یہ الفاظ کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور چند روز بعد اس دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کو رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گوجرانوالہ میں ایک بزرگ حاجی محمد علی مرحوم تھے۔ طویل قامت اور بارعب، پرہیزگار اور سراپا خلوص۔ وہاں کی انجمن اہل حدیث کے خازن تھے سابق ایم۔ پی۔ اے جناب اسماعیل ضیا کے والد مکرم تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا :

"میری بات غور سے سنو۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریریں سنی ہیں، ان کی کتابیں پڑھی ہیں اور ان کے اخبارات "الہلال" اور "البلاغ" بھی پڑھتا رہا ہوں۔ ان کی سب تحریریں میں اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں، لیکن مولوی حنیف کی لکھی ہوئی اکثر باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ان سے کہو آسان زبان لکھا کریں جسے میرے جیسے لوگ بھی سمجھ سکیں۔"

میں نے تعجب سے عرض کیا "حاجی صاحب! یہ بات مولانا سے میں کہوں؟ یہ ممکن نہیں، مجھے وہ اتنی سخت ڈانٹ پلائیں گے کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ حاجی محمد علی مرحوم مولانا کے علم و کمال کے بہت مدّاح تھے۔ ایک دن گھبرائے ہوئے تشریف لائے، فرمایا :

"مولوی حنیف کہاں ہیں؟"

عرض کیا "خیریت تو ہے؟"

بولے "ایک کمیونسٹ ہمارے گھر آیا ہے اور میرے بیٹے اسماعیل کو گمراہ کر رہا ہے، مولوی حنیف ہی اس کی زبان بند کر سکتے ہیں اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، انھیں جلدی سے بلا دو۔ میں انھیں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔"

میں مولانا کو بلا لایا، وہ حاجی صاحب کے ساتھ گئے۔ اور بھی بہت سے لوگوں کو حاجی صاحب نے بلا لیا اور خوب چائے وغیرہ پلائی۔ مولانا سے ان صاحب کی گفتگو ہوئی تو ظاہر ہے مولانا کے مقابلے میں انھیں لاجواب ہی ہونا تھا۔ اس دن حاجی صاحب نہایت خوش تھے اور پھر مولانا کی ہمیشہ تعریف کرتے رہے۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے مولانا کی کتاب "عقلیات ابنِ تیمیہ" شائع ہوئی تو تبصرے کے لیے ہندوستان کے بعض رسائل کو بھی بھیجی گئی، جن میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا رسالہ "برہان" (دہلی) بھی شامل تھا۔ مولانا اکبر آبادی نے اس کتاب پر تبصرہ

کیا، لیکن یہ تبصرہ مولانا کی توقع کے خلاف تھا۔ کچھ عرصے بعد مولانا اکبر آبادی لاہور آئے تو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں بھی تشریف لائے۔ مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف مرحوم بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں مولانا کا کمرہ دفتر کی دوسری منزل میں تھا، اب یہ کمرہ ان سطور کے راقم عاجز کے "قبضے" میں ہے۔ یعنی میں ان کا "خلیفہ" ہوں اور یہ "خلافت" صرف کمرے کی حد تک ہے، علم وفضل یا تحقیق وقابلیت کی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تو مولانا کا معاملہ "فرشتوں سے بازی بشر لے گیا" کا سا ہے۔

مولانا اکبر آبادی، شیخ اشرف مرحوم کی معیت میں مولانا کے پاس آئے۔ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی اور رئیس احمد جعفری بھی وہیں آگئے، میں بھی حاضر تھا۔ خیر خیریت کے بعد مولانا نے "برہان" میں شائع شدہ تبصرے پر گفتگو شروع کر دی اور مولانا اکبر آبادی سے فرمایا، "یا تو آپ میری کتاب کے مندرجات کو سمجھے نہیں، یا آپ کھل کر لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ آپ اپنے خاص حلقے کی کتابوں اور مصنفوں کی تحسین کرتے ہیں، دوسرا اگرچہ کتنا بھی اچھا لکھے، اس کی تحسین نہیں کرتے۔" انھوں نے پہلے تو مولانا کو کچھ جواب دیے، لیکن بعد میں خاموشی کو ترجیح دی۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے سابق ڈائریکٹر میاں محمد شریف مرحوم سے بھی اس سلسلے میں مولانا کی جھڑپ ہو جاتی تھی۔ وہ مولانا سے کہا کرتے تھے کہ آپ مشکل زبان لکھتے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں جعفر شاہ صاحب اور رئیس صاحب کی زبان اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں، لیکن آپ جو زبان لکھتے ہیں وہ نہیں سمجھ پاتا۔ ایک دن مولانا نے ان سے کہا، آپ کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں، آپ کو اللہ ہی سمجھائے۔ میں اب آسان کتاب "بچے پالنا" لکھوں گا تاکہ آپ سمجھ سکیں۔

ایک دن انھوں نے کہا میں کئی سال علی گڑھ رہا ہوں، وہاں اُردو بولتا رہا ہوں اور اُردو بولنے والوں سے میرا تعلق رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا علی گڑھ میں رہنے اور اردو بولنے سے کیا ہوتا ہے، وہاں تو جاہل بھی رہتے ہیں اور اردو بولتے ہیں۔

میاں شریف صاحب مرحوم باعتبار ترتیب کے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے دوسرے

اکیڈمک ڈائریکٹر تھے، وہ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی وفات کے بعد اس منصب پر فائز ہوئے تھے۔ فلسفے کے آدمی تھے اور اپنے موضوع میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ ان میں یہ خوبی تھی کہ مولانا کی کسی بات سے خفا نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کی طنزوں سے خوش ہوتے اور مُسکراتے رہتے تھے۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے اور بعض اسماء و اعلام کا تلفظ صحیح نہیں کر پاتے تھے اور بات لطیفے کی سی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ ابنِ تیمیہ کو وہ "ابنِ تِیمیہ" کہا کرتے تھے۔ ایک دن کوئی کتاب پڑھ رہے تھے جس میں "نورٌ علیٰ نور" لکھا تھا۔ بولے یہ بے محل سی عبارت معلوم ہوتی ہے، "نور علی نور" معلوم نہیں کون شخص ہے اور یہاں یہ لکھنے کا کیا مقصد ہے۔ بغیر اعراب کے بعض عام سے عربی الفاظ پڑھنے میں بھی انھیں دقّت پیش آتی تھی جو بسا اوقات ایسے ہنسی مذاق کا باعث بن جاتی تھی کہ اس کی صحت کا علم ہو جانے کے بعد وہ خود بھی ہنس پڑتے تھے۔ مثلاً ایک دن وہ اُردو میں ایک مسلمان فلسفی کے حالات پڑھ رہے تھے اور اس فلسفی کے نام کے آگے لکھا تھا، نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ، اس پر اعراب نہیں تھے۔ فرمایا یہ "نور اللہ مرقدہ" کیا لفظ ہے۔ یہ اس فلسفی کے نام کا جزء تو نہیں ہے، یہاں کیوں لکھ دیا گیا ہے۔

میاں محمد شریف مرحوم کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ وہ اپنے موضوع کے بہت بڑے محقق تھے اور پرانے آئی، سی، ایس (سی، ایس، پی) تھے۔ ان سے بھی مولانا کی بعض دفعہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی جسے سی، ایس، پی حضرات سننے اور برداشت کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ لیکن مولانا اس کی پروا نہیں کرتے تھے، جو بات ان کی نزاکتِ احساس کے منافی ہوتی اس کا فوراً جواب دیتے۔ ایک دن اکرام صاحب مرحوم نے کہا ادارے میں سکالروں کی ضرورت نہیں ہے، ان پر بہت زیادہ رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ باہر کے لوگوں سے کتابیں لکھائی جائیں تو سستی پڑتی ہیں۔ مولانا نے فرمایا: سب سے زیادہ رقم ڈائریکٹر کی تنخواہ لے جاتی ہے۔ میں آپ کو دو سو روپے تنخواہ پر ڈائریکٹر لا دیتا ہوں۔

اکرام صاحب مرحوم یوں تو تمام رفقائے ادارہ کا احترام کرتے تھے، لیکن مولانا جعفر شاہ مرحوم اور مولانا حنیف ندوی کی بالخصوص تکریم کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے

کہا، "ان دونوں بزرگوں کا وجود ادارے کے لیے باعثِ برکت ہے، ان کی قدر کرنا اور ان کے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھنا ہمارا فرض ہے"۔ میں اس سے بہت خوش ہوا اور خوشی میں آکر یہ بات شاہ صاحب سے بھی عرض کر دی کہ اکرام صاحب آپ دونوں کے وجود کو باعثِ برکت قرار دیتے ہیں۔ شاہ صاحب یہ سُن کر خلافِ توقع بھڑک اُٹھے۔ فرمایا: "اچھا اکرام صاحب کے نزدیک ہمارا وجود باعثِ برکت ہے اور ہمیں محض برکت کے لیے یہاں رکھا ہے۔ ہم کام وام کوئی نہیں کرتے، کام کوئی اور کرتا ہے یا اکرام صاحب کرتے ہیں۔ ہماری صرف برکت ہے۔"

اس زمانے میں جعفر شاہ صاحب، رئیس صاحب، مولانا حنیف صاحب، شاہد حسین رزاقی صاحب اور ان سطور کا راقم روزانہ کچھ دیر کے لیے ایک کمرے میں بیٹھ جاتے اور پھر علم اور عمر کا لحاظ کیے بغیر بے تکلفی سے ہر قسم کی باتیں ہوتیں۔ سید نذیر نیازی مرحوم کا مکان ہمارے دفتر کے بالکل قریب ہے، اکثر اوقات وہ بھی آجاتے اور تھوڑی دیر کے لیے خوب محفل جمتی۔

ایک تلخ حقیقت کا مختصر متن

مولانا حنیف ندوی مسلکاً اہل حدیث ہیں اور گوجرانوالہ کے جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی اہل حدیث ہے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم اپنے گاؤں ڈھونی کے (متصل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ) سے ۱۹۲۱ میں گوجرانوالے تشریف لائے۔ وہ ممتاز علمائے اہل حدیث میں سے تھے اور انھوں نے اپنے مسلک کی بہت خدمت کی۔ مولانا حنیف ندوی نے ابتدا سے لے کر تمام درسی کتابیں انھی سے پڑھیں اور ان کے علم و فضل سے بہت متاثر بھی ہیں۔ ۱۹۲۵ میں مولانا ندوی انھی کی کوشش اور سفارش سے ندوۃ العلما (لکھنؤ) میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۹۳۰ کو وہ بائیس سال کی عمر میں ندوہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور کی مسجدِ مبارک میں خطیب مقرر ہوئے۔ یہ جماعت اہل حدیث کی مسجد ہے۔ اس زمانے میں لاہور میں جماعت اہل حدیث کی صرف تین مسجدیں تھیں، ایک مسجد لسوڑیاں والی جو اندرون دروازہ شیراں والا، بنگلہ ایوب شاہ کے قریب ہے۔ اس مسجد میں کسی زمانے میں مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم (وفات ۲۹ جنوری ۱۹۲۰) خطابت و امامت

کے فرائض انجام دیتے تھے۔ دوسری مسجد چینیاں والی جس کی مسندِ خطابت پر پہلے مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم فائز تھے اور پھر ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم نے یہ مسند سنبھالی۔ تیسری مسجد جو بعد میں تعمیر کی گئی، مسجدِ مبارک تھی، اس میں درسِ قرآن اور خطابت کا سلسلہ مولانا محمد حنیف ندوی نے ۱۹۳۰ میں شروع کیا جو ۱۹۴۹ تک جاری رہا۔

مولانا داؤد غزنوی کی زندگی کا بڑا حصہ سیاسیات میں گزرا اور وہ برطانوی حکومت کی مخالفت کی پاداش میں مختلف اوقات میں کم و بیش بارہ سال جیل میں رہے۔ وہ عمر میں مولانا حنیف ندوی سے کافی بڑے تھے، لیکن مولانا ندوی کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کے علم و فضل کے مداح تھے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۴۸ کو جب مرکزی جمعیۃ اہل حدیث قائم ہوئی تو اس کے تاسیسی اجلاس میں مولانا ندوی موجود تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے صدر، پروفیسر عبدالقیوم (سینئر ایڈیٹر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی) کو ناظمِ اعلیٰ اور میاں عبدالمجید مالواڈہ کو (جنھیں پوری جماعت میں اپنے بے پناہ خلوص کی بنا پر انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے) ناظم مالیات منتخب کیا گیا تھا۔ مولانا حنیف ندوی اس کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے اور اس زمانے کی جمعیۃ اہل حدیث کی مجلسِ عاملہ اپنے دور کے عظیم افراد پر مشتمل تھی۔ ان سطور کا راقم جمعیۃ کا ناظم دفتر تھا۔ مولانا داؤد غزنوی ہر اہم معاملے میں مولانا حنیف ندوی سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے کو تمام ارکانِ عاملہ خاص اہمیت دیتے تھے۔ ۲۷، ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۴۹ کو لاہور میں جمعیۃ اہل حدیث کا پہلا جلسۂ عام منعقد کیا گیا تو اس کے صدر مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کو اور صدرِ استقبالیہ مولانا حنیف ندوی کو بنایا گیا تھا۔ انھوں نے اس میں جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا وہ ہر لحاظ سے بہترین خطبہ تھا۔ ۱۹۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۹ کو جماعت اہلِ حدیث کا ترجمان ہفت روزہ ”الاعتصام“ جاری ہوا تو اس کی ادارت کے لیے اکابر جماعت کی نگاہِ انتخاب مولانا حنیف ندوی پر ہی پڑی۔ اپریل ۱۹۵۵ میں لائل پور (حال فیصل آباد) میں جماعت اہل حدیث کا مرکزی دارالعلوم قائم کرنے کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو اس کا نام ”جامعہ سلفیہ“ مولانا ندوی کی تجویز سے رکھا گیا تاکہ اس کے فارغ التحصیل

حضرات کو "سلفی" کی نسبت سے پکارا جائے۔ پھر اس سے کئی سال بعد فیصل آباد ہی میں جماعت اہل حدیث کی ایک اور درس گاہ قائم کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو مولانا ندوی نے اس کا نام "ادارۂ علوم اثریہ" رکھا تاکہ اس سے فارغ ہونے والوں کو "اثری" کہا جائے۔ سلفی اور اثری کا اطلاق اہل حدیث حضرات پر ہوتا ہے۔ جماعت اہل حدیث کے مزاج و مسلک کے اعتبار سے یہ نام نہایت موزوں تھے۔

مولانا سید داؤد غزنوی کی وفات (۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳) تک مولانا حنیف ندوی جمعیۃ اہل حدیث کی تمام کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں کے رکن رہے اور جمعیۃ کے ہر مشورے اور فیصلے میں ان کی رائے کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ لیکن مولانا غزنوی کی وفات کے فوراً بعد جو حضرات آگے آئے (یا بعض مصالح کی بنا پر جن حضرات کو آگے لایا گیا) ان میں مولانا حنیف ندوی کو کسی عنوان سے بھی شامل نہیں کیا گیا بلکہ بعض حضرات نے تو ان کو اہل حدیث ماننے ہی سے انکار کر دیا اور ان کے چند ایسے افکار و تحریرات کا انکشاف فرمایا جن کی دور از کار تاویلیں کر کے انھیں زمرۂ اہلِ حدیث سے خارج کرنے کی راہ ہموار ہو سکے — یہ ایک تلخ حقیقت کا مختصر سا متن ہے، جس کی تشریح بہت سی تفصیلات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، لیکن اس کے بیان کا یہ محل نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ تحقیق و کاوش، علم و ادراک، وسعتِ معلومات، علوِّ فکر اور اصابتِ رائے کے اعتبار سے کم از کم جماعت اہل حدیث میں کوئی شخص مولانا حنیف ندوی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کوئی ان کے بارے میں جو جی چاہے کہے لیکن ان کے مرتبے کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس موقع پر مفتی صدر الدین آزردہ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

کامل اس فرقۂ زہاد میں اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

جی چاہتا ہے جمعیۃ اہل حدیث اور اس کے اکابر کے بارے میں جو یادداشتیں میرے ذہن کے کباڑ خانے میں اوپر نیچے دبی ہوئی ہیں، انھیں خاص ترتیب کے ساتھ کسی وقت قلم و کاغذ کے حوالے کر دوں۔ اس میں ان شاء اللہ یہ واضح کروں گا کہ جمعیۃ اہل حدیث کے قیام و تاسیس کی

ضرورت کیوں پیش آئی، کن حضرات نے اس کے لیے ابتدائی تگ و تاز کی، اس کے نظم و نسق کو مستحکم کرنے کے لیے عملی اور تحریری طور پر کن کن لوگوں نے کیا کیا خدمات انجام دیں اور اس کے کیا نتائج نکلے اور پھر ان لوگوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا اور کن لوگوں کے گننے سے کیا گیا۔ جن لوگوں نے اخبار "الاعتصام" میں مسلک اہل حدیث کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مختلف جماعتوں اور افراد سے ٹکرلی اور اس پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے، ان کی مدافعت کا فریضہ ادا کیا، ان کو بالکل بھلا دیا گیا۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے؟

جمعیۃ کی تاریخ اب مسخ کی جارہی ہے اور اس کے مؤسسین میں صرف دو ایک بزرگوں کے نام لیے جاتے ہیں، باقی سب کی کوششوں پر پانی پھیرا جا رہا ہے — میں چاہتا ہوں کہ کسی وقت اصل حقائق کی نقاب کشائی کروں اور واقعات کی پوری تاریخ لوگوں کے سامنے رکھ دوں۔ مجھے معلوم ہے جماعت اہل حدیث کا کوئی اخبار اسے شائع نہیں کرے گا اور ظاہر ہے دوسروں کو اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ تاہم میں ان شاء اللہ اصل واقعات و حالات ضرور تحریر کروں گا، ہو سکتا ہے میرے بعد جماعت اور اس کے مختلف ادوار و شخصیات سے متعلق کوئی شخص معلومات حاصل کرنا چاہے تو میرے کاغذات میں سے اسے کچھ مل جائے۔

بہرحال اس وقت صرف مولانا حنیف ندوی سے متعلق یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ جمعیۃ اہل حدیث کی تنظیم و تاسیس میں ان کی کوششوں کا بہت عمل دخل ہے لیکن مولانا داؤد غزنوی کی وفات کے بعد ان کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جماعت کے جو لوگ انھیں کسی جلسے یا میٹنگ میں بلاتے ہیں تو "حصولِ برکت" کے لیے بلاتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ پرانے بزرگوں کی نشانی صرف آپ ہی رہ گئے ہیں۔ آپ ہمارے لیے دعا فرمایا کریں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ان کا کام فقط دعا فرمانا رہ گیا ہے۔ جماعت سے متعلق کسی مشورے یا فیصلے میں ان کو شریک کرنا ممنوع ہے۔ یہ کام آپ حضرات کا ہے جو نہ جماعت کی تاریخ سے واقف ہیں، نہ اس کے افراد و شخصیات سے آگاہ ہیں اور نہ اس مسلک کے حدود اور نزاکتوں کا علم رکھتے ہیں۔

بعض حضرات مجھے بھی ازراہِ کرم جماعت کے جلسوں میں بلا لیتے ہیں اور مجھے بھی یہی فرمایا کرتے ہیں کہ آپ جمعیۃ کے بانیوں میں سے ہیں اور اس کی چلتی پھرتی تاریخ ہیں ـــ میں سمجھتا ہوں، جماعت کے موجودہ حضرات کا یہ کہنا بھی غنیمت ہے۔ اگر حالات کی رفتار یہی رہی تو ہمارے لیے یہ الفاظ کہنے والے بھی نہیں ملیں گے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مدتِ مدید سے مولانا سے میرے تعلقات ہیں۔ تعلقات (یا ملاقات) کے یوم اوّل سے لے کر اب تک ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مولانا کی عمر ضرور بڑھی ہے اور روزانہ بڑھ رہی ہے اور دعا ہے کہ بڑھتی ہی رہے مگر وہی وضع، وہی قطع، وہی میل، وہی جول، وہی طول، وہی عرض۔ کسی چیز میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ پنجابی محاورے کے مطابق "نہ ہاڑھ سُکے، نہ ساون ہرے" ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بعض علمائے کرام بہت موٹے ہو گئے ہیں اور ہر آنے والی گھڑی ان کا وزن بڑھا رہی اور انھیں موٹا کر رہی ہے۔ مگر مولانا وہی دھان پان اور ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ انھوں نے ایک دن یہ خوش خبری نہ سنائی کہ

میری پچھلے سال دی کُرتی
وکھیاں توں اڑ دی اے

آخری گزارش

مولانا جہاں فضل و کمال، تصنیف و تالیف اور درس و تقریر میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں وہاں لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ جس محفل میں بھی ہوں اس میں شگفتگی کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ پنجابی لوک گیت کے مطابق کہنا چاہیے:

گوری لاہ کے پزیباں رکھیاں
دھرتی نُوں پھُل لگ گئے

مَیں نے کوشش کی ہے کہ مولانا کے چھوٹے بڑے وہ تمام واقعات و لطائف ضبطِ تحریر میں آجائیں جو میں نے کچھ لوگوں سے سنے یا خود مولانا نے بتائے، یا جو میرے سامنے وقوع میں آئے اور جن کا میں "عینی اور سمعی شاہد" ہوں تاکہ ان کی شخصیت نکھر کر قارئین

کے سامنے آجائے۔ ان میں بعض واقعات یا لطائف ایسے بھی ہوں گے اور ہیں جو اپنے وقتِ وقوع اور حینِ صدور میں تو واقعی دلچسپی کا باعث تھے لیکن مرورِ ایام سے ان کی دلچسپی میں کسی حد تک کمی واقع ہوگئی ہے، اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے۔ ہر چیز اپنے وقت پر ہی زیادہ لطف دیتی ہے، وقت گزرنے پر اس میں پہلی سی جاذبیت باقی نہیں رہتی۔ بس پھر وہ ماضی کا ایک حصہ اور یادوں کا ایک جزء بن کر رہ جاتی ہے۔

میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ سب باتیں سادہ زبان میں بیان کی جائیں اور یہی زبان و اسلوب اس کے لیے موزوں بھی ہے اور تھوڑی بہت دلچسپی اسی میں قائم رہتی ہے۔

ان واقعات میں علمی اصطلاح میں کہنا چاہیے کہ بعض "ذیول" بھی آگئے ہیں اور یہ وہ ذیول ہیں جن سے مفر ممکن نہ تھا۔

مولانا سے میرا تعلق بہت عرصے سے ہے، اور تعلق کیا، امیر خسرو کے الفاظ میں معاملہ یہ رہا ہے کہ

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

لیکن اس کے باوجود ان سے متعلق بہت سی باتیں میں نے ترک کر دی ہیں۔ ان متروکات میں سے بعض گفتنی تو بے شک ہیں، نوشتنی نہیں ہیں۔ بعض اس لیے چھوڑ دی ہیں کہ ان کے بیان کرنے سے مولانا مجھ پر خفا ہوں گے اور ان کی خفگی مجھے ہرگز منظور نہیں۔

مولانا میری کمزوری ہیں اور میں چاہتا تھا کہ ایک خاص اسلوب سے انھیں پڑھنے والوں کے سامنے لا کھڑا کروں۔ اگر میں ہی یہ کام نہ کرتا تو اور کون کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کامیاب رہا ہوں اور کامیاب کیوں نہ رہتا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

میں یہ معذرت نہیں کروں گا کہ میری گفتگو بہت طویل ہوگئی ہے، میرے نزدیک ایسا ہونا ضروری تھا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

مولانا محمّد حنیف ندوی

کا

سفرِ آخرت

محمد اسحاق بھٹی

مولانا محمد حنیف ندوی جن کو مرحوم کہتے ہوئے زبان تھرتھراتی اور لکھتے ہوئے ہاتھ لرزتا ہے، تقریباً ڈھائی سال کی مسلسل اور طویل علالت کے بعد ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ کی شب کو نو بج کر چالیس منٹ پر اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

بیماری کے دورِ آغاز میں مولانا کا خیال تھا کہ انھیں مثانے کا درد ہے۔ معالجوں سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا اور عرصے تک اسی تشخیص کے مطابق علاج ہوتا رہا۔ ایلوپیتھی، یونانی اور ہومیوپیتھی تینوں قسم کے علاج کرائے گئے اور اس مرض کے ماہر معالجوں سے کرائے گئے، مگر افاقہ نہ ہوا۔ کبھی کبھی اتنا فرق ضرور پڑتا تھا کہ درد میں قدرے کمی آجاتی تھی۔ درد کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا۔

دو تین دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بعض ڈاکٹروں نے مثانے کے اپریشن کا ارادہ کیا، اس کے لیے تاریخ اور وقت کا تعیّن بھی کر دیا گیا، مگر ہر دفعہ عین موقعے پر ارادہ بدل دیا گیا اور دواؤں کے ذریعے علاج جاری رکھنا مناسب سمجھا گیا۔

مولانا ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۸۶ کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ تشریف لائے۔ مَیں نے عرض کیا، مَیں کل ۱۳۔ اکتوبر کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ فرمایا، کل تو مَیں اسلام آباد چلا جاؤں گا، پھر کل ہی وہاں سے علاج کے لیے لندن روانہ ہو جاؤں گا۔ یہ ہم سب کے لیے ان کی اچانک اطلاع تھی۔ وہ ملاقات کے لیے آئے تھے اور سب سے الگ الگ ان کے کمروں میں جا کر ملے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے میں آئے تو میں نے عرض کیا کہ آپ نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں جو تصنیفی خدمات انجام

دی ہیں، ان سے متعلق "ارمغانِ حنیف" کے لیے میں نے مضمون لکھا ہے، اجازت ہو تو ایک صفحہ سنا دوں، فرمایا "سناؤ" ایک صفحہ سنا چکا تو عرض کیا "بس کروں"؟ فرمایا "اور سناؤ!" مضمون کے شروع اور آخر کے فل سکیپ کے مسودے کے سات صفحے سنے اور نہایت خوش ہوئے۔ فرمایا "آپ نے بہت اچھا لکھا ہے اور میرے انداز میں لکھا ہے۔ مر جاؤں تو افسوس نہیں ہوگا، کام تو ان شاء اللہ زندہ رہے گا۔"

۱۳۔ اکتوبر ۱۹۸۶ کو وہ اپنے ذرائع سے علاج کے لیے لندن چلے گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ بھی ان کے ساتھ گئیں۔ وہاں جا کر سب سے پہلے مثانے کی بیماریوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس نے مختلف ٹیسٹ لیے تو اس نتیجے پر پہنچا کہ انھیں مثانے کی تکلیف نہیں ہے بلکہ معدے کا عارضہ ہے۔ چنانچہ اس کے مشورے سے معدے کی بیماریوں کے ماہر ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا۔ اس نے کئی قسم کے ایکسرے لینے اور تجزیے کرنے کے بعد بتایا کہ جس آنت کے ذریعے معدے کو خوراک پہنچتی ہے وہ آنت سکڑ گئی ہے۔ اس کے لیے اس نے غذا بھی بتا دی اور ضروری دوائیں بھی لکھ دیں۔

لندن کے ان دونوں ڈاکٹروں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس مریض کی حیثیت پاکستان کے گراں مایہ علمی سرمائے کی ہے اور یہ قدیم و جدید فلسفے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ڈاکٹر خود بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے اور ماتحت عملے کو بھی ان کی دیکھ بھال کے لیے خاص ہدایات جاری کر دی تھیں۔

امراضِ معدہ کے ماہر ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ ان کے پیشاب کا تجزیہ کیا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے ہیں، لیکن ان کے مرکز کا پتا نہیں چل سکا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ چند ماہ بعد پیشاب کی نالی میں رسولی پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن اس رپورٹ کا آخر وقت تک مولانا کو علم نہیں ہو سکا۔

تقریباً تین مہینے کے بعد ۷ جنوری ۱۹۸۷ کو مولانا لندن سے لاہور واپس آئے۔ ایئر پورٹ پر استقبال کے لیے ان سطور کا راقم بھی موجود تھا۔ صحت بظاہر اچھی تھی۔

مَیں نے بغل گیر ہوتے ہوئے ان سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے، آپ نے لندن جانے کے لیے بیماری کا بہانہ بنایا تھا۔ میاں بیوی نے مُسکراتے ہوئے کہا وہاں بھی بعض لوگ یہی کہتے تھے۔

لندن سے واپس آنے کے بعد علاج کا سلسلہ وہاں کے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق بدستور جاری رہا۔ اس اثنا میں وہ دو تین مرتبہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ بھی تشریف لائے، مَیں بھی گھر پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ کمزوری تو تھی، لیکن نظر بظاہر زیادہ خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔

مَیں نے ایّامِ مرض میں کئی دفعہ ان سے عرض کیا کہ صحت اچھی ہو جائے تو اپنے ایک پرانے مضمون "چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں" کے آخری پندرہ بیس صفحے لکھ دیجیے تاکہ یہ مکمل ہو جائے اور اُسے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ انھوں نے بشرطِ صحت لکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ لیکن جون کے پہلے ہفتے میں طبیعت یکایک خراب ہو گئی اور ضعف و مرض نے ان کے جسمِ ناتواں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔

ابتدا میں مختلف ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا، لیکن جون کی آخری تاریخوں میں انھیں لاہور کے اتفاق ہسپتال کے جنرل وارڈ میں داخل کرا دیا گیا۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر کو پتا چلا تو وہ ہسپتال پہنچے اور فوری طور پر ملک فیض الحسن (زکوٰۃ کونسل پنجاب) اور خالد شیرازی (ریڈیو پاکستان لاہور) سے ملے اور ان کو مولانا کی شدید بیماری کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے ہسپتال کی انتظامیہ کے بعض معزز ارکان سے رابطہ قائم کیا اور مولانا کو ہسپتال کے وی آئی پی روم میں منتقل کرا دیا گیا۔ ان حضرات کی کوشش سے ہسپتال کی انتظامیہ نے علاج معالجے کی ذمہ داری خود قبول کر لی اور ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں ان کا علاج ہونے لگا۔

پیشاب کی نالی کے بجائے پیٹ میں رسولی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اس کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ کینسر ہے، مگر قابلِ علاج ہے۔ اس کے بعد طبیعت کچھ سنبھل بھی گئی، لیکن یہ عارضی بات تھی۔

۹- جولائی کو مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھ کر مسکرائے اور خیر خیریت پوچھی۔ مَیں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے سر پر ہاتھ رکھا اور چند ثانیوں کے بعد غنودگی طاری ہوگئی۔ اسی دن شام کو مَیں نے ان کے چھوٹے صاحب زادے حماد سے ہسپتال میں ٹیلی فون پر رابطہ کیا تو انھوں نے کہا آپ کے جانے کے بعد ابّی کہہ رہے تھے کہ آپ ان کی عیادت کے لیے ہسپتال نہیں آئے۔ انھیں بتایا گیا کہ آپ آئے تھے تو فرمایا نہیں آئے۔ پھر بتایا گیا کہ آئے تھے اور آپ سے ایک آدھ بات بھی ہوئی تھی تو "اچھا" کہہ کر خاموش ہو گئے۔

۱۰- جولائی کو گیارہ بجے کے قریب میں ہسپتال گیا تو بظاہر طبیعت اچھی تھی اور مولانا کرسی پر بیٹھے تھے۔ اپریشن کے مقام پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کچھ باتیں بھی کیں، پشت پر رکھنے کے لیے مجھ سے تکیہ بھی مانگا۔ بعض اور دوست بھی آگئے، اُنھوں نے خیریت پوچھی تو فرمایا۔ الحمدللہ ٹھیک ہوں۔

۱۱- جولائی کو حاضرِ خدمت نہیں ہوسکا۔ ۱۲- جولائی کو مَیں دفتر نہیں گیا، گھر پر ہی رہا۔ خیال یہ تھا کہ شام کو مولانا کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ لیکن ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر سراج منیر نے دفتر سے ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ "کل آپ مولانا کے پاس گئے تھے؟ عرض کیا "کل نہیں جاسکا، آج شام کو جانے کا ارادہ ہے۔" انھوں نے بتایا کہ "کل دوپہر سے ان کی طبیعت بہت خراب ہے اور بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔"

یہ تشویش ناک خبر تھی۔ میں اسی وقت گھر سے نکلا اور دفتر پہنچا۔ پانچ بجے کے قریب سراج منیر صاحب، جناب ذوالفقار احمد، ملک فیض بخش اور ان سطور کا راقم ہسپتال پہنچے تو دیکھا کہ علم و فضل کا یہ کوہِ گراں اپنی جگہ سے ہل چکا ہے اور زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے۔ ڈاکٹر انتہائی توجہ سے مصروفِ علاج ہیں اور اعزہ واقارب تصویرِ یاس بنے ہوئے کمرے میں ان کے اردگرد بیٹھے ہیں۔

مجھ کو دیکھتے ہی پہلے ان کا چھوٹا بیٹا حماد میری طرف بڑھا اور لپٹ کر رونے لگا۔

پھر چھوٹی بیٹی سدرہ آئی اور روتے ہوئے بولی " چاچا ! اب کیا ہوگا"؟ (ان کے بچے مجھے چاچا کہتے ہیں) اس وقت خود میری حالت دِگرگوں تھی اور میرے پاس افسوس ہے تلقینِ صبر کے چند الفاظ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ ایسی تکلیف دِہ گھڑی تھی کہ سب کی آنکھیں پُرنم تھیں اور چہروں پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

شام کو ہم ہسپتال سے واپس لوٹے تو سراج منیر صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم سیدھے گھر جاؤ اور ٹیلی فون کے ذریعے ان سے رابطہ رکھو۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ زندگی کے آخری سانس ہیں اور چند گھڑیوں تک جسم و جان کا ۷۹ سالہ پرانا تعلق ٹوٹنے والا ہے۔ بہرحال گھر جا کر میں نے ہسپتال سے رابطہ قائم رکھا اور رات کو ساڑھے نو بجے سے چند منٹ بعد حُزن و ملال میں ڈوبی ہوئی یہ آخری اطلاع ملی کہ فضل و کمال کا یہ پیکر اس عالمِ خاکی سے مُنہ موڑ کر جنت کو روانہ ہوگیا ہے۔ قرآن کا یہ مفسر اور حدیثِ نبوی کا یہ محبِّ صادق چشمۂ کوثر پر جا بیٹھا ہے۔ چند گھنٹوں سے وہ جس کوفت میں مبتلا تھا، وہ دُور ہوگئی ہے، اب وہ باغِ بہشت میں جا کر آرام کی نیند سو گیا ہے۔

یہ خبر سنتے ہی گزشتہ اڑتیس برس کے لمحاتِ زندگی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور یکے بعد دیگرے بے شمار یادیں تازہ ہوگئیں۔

ان کی وفات کی اطلاع پا کر اخلاقاً مجھے ان کے گھر جانا اور وہیں رات رہنا چاہیے تھا۔ لیکن مَیں نے ان کے لڑکوں سے کہہ دیا کہ مَیں نہیں آؤں گا، اس لیے کہ اب اخبارات کو ان کی وفات کی اطلاع دینا، ان کی زندگی کے حالات بتانا اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات کی تفصیلات سے مطلع کرنا ضروری تھا اور میرے سوا کوئی اور یہ فریضہ انجام دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ چنانچہ تمام اُردو انگریزی اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کو مناسب تفصیل سے اطلاع دی گئی، ان کے حالات بتائے گئے، ان کی علمی تحقیقی اور تصنیفی تگ و دو سے مطلع کیا گیا اور اخبارات کے طلب کرنے پر ان کی مختلف تصویریں مہیا کی گئیں۔ تمام رات اخبارات سے رابطہ رکھا اور انھوں نے جو کچھ پوچھا،

بتایا۔

صبح ۱۳۔ جولائی کے اخبارات میں صفحہ اوّل پر نمایاں طور سے ان کی خبرِ وفات شائع ہوئی۔

اسی صبح کو ساڑھے چھ بجے سراج منیر صاحب نے ریڈیو پاکستان لاہور کے خصوصی پروگرام میں دس منٹ ان کے بارے میں تقریر کی اور ان کے ضروری حالات وضاحت سے بیان کیے۔ (یہاں یہ عرض کر دوں کہ صبح ساڑھے چھ بجے کے پروگرام میں ریڈیو پاکستان، لاہور سے روزانہ کئی روز سے سراج منیر اور خالد شیرازی مولانا کی بیماری کی تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں اعلان نشر کر رہے تھے۔)

مولانا حنیف ندوی نے ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء (۱۵ ذیعقدہ ۱۴۰۷ھ) کو اتوار کے دن رات کو نو بج کر چالیس منٹ پر وفات پائی اور دوسرے دن گیارہ بجے ان کا جنازہ اٹھایا گیا، اور انھیں کلفٹن کالونی (وحدت روڈ) کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ نمازِ جنازہ مسجد مبارک کے خطیب مولانا فضل الرحمٰن نے پڑھائی۔

علمی اعتبار سے گزشتہ کئی سال سے واقعات نے جو رُخ اختیار کر لیا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے آئندہ بظاہر حالات برصغیر پاک و ہند میں علم و عرفان کی اس قسم کی مثال پیدا ہونے کی توقع نہیں۔ وہ قدیم و جدید کے پیکرِ حسین اور کائناتِ فضل و کمال تھے۔ مفسّرِ کتابِ ہُدیٰ، فنونِ نقلیہ و عقلیہ کے ماہر، خزانۂ علومِ قرآن، محبّ رسولِ عربی، دلدادۂ حدیثِ نبوی، حاضر جواب، مقررِ شیریں بیان، خطیبِ نکتہ طراز، خلوت گزیں مجمعِ کمال اور گوشہ نشیں محفل آرا تھے۔ دنیا اور اہلِ دُنیا سے بے نیاز، دولت و ثروت سے مستغنی، لوگوں کی داد و تحسین سے بے پروا، عربی کے ادیب، اردو کے صاحبِ طرز مصنف، متوکل علی اللہ، مجسمۂ فہم و تدبر، اسلامی فلسفے میں یکتا، عمرانیات و علومِ حاضر میں منفرد، اور علم و مطالعہ کے علاوہ ہر شے سے بے تعلق ــــ!

یہ قناعت پیشہ صاحبِ علم و ہنر، جسے اس عالمِ خاکی میں محمد حنیف ندوی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے شمار خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ عملاً اپنے نام "حنیف"

کا صحیح ترین ترجمہ تھے۔ یعنی سب معاملاتِ غیر علمی سے کٹے ہوئے اور امورِ ناپسندیدہ سے الگ تھلگ۔! اگرچہ مال و دولت سے تہی داماں تھے مگر اقلیم علوم و فنون پر اُن کی حکمرانی تھی۔ یہ وہ خوش قسمت عالمِ دین ہیں جن کا علم ان کے سینے میں بند نہیں رہا اور ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن نہیں ہو گیا بلکہ کثرت کے ساتھ کاغذ کے سفینے میں منتقل ہوا، اور صفحاتِ قرطاس نے ہمیشہ کے لیے اُسے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا۔

اس گراں مایہ ہستی کو اپنے اوصافِ گوناگوں اور کمالاتِ بوقلموں کی بنا پر موجودہ کاروانِ علم کا آخری مسافر کہنا چاہیے۔ یہ انگریزی کالجوں اور مغربی طریقِ تعلیم کی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ نہیں تھے، بلکہ عربی مدارس کے بوریا نشین گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس طائفۂ انکسار کے رکن تھے جو مسجدوں کی چٹائیوں پر گلیم پوش اور درویش منش اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں۔

اس مردِ قلندر نے گوجرانوالہ کی ایک مسجد سے تعلیم کا آغاز کیا اور وہیں درسِ نظامیہ کی تکمیل کی۔ پھر وہاں سے لکھنؤ گئے اور ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔ پانچ سال ندوہ میں رہے۔ یعنی ان کے معلومات کا ابتدائی سرمایہ عربی مدارس کا رہینِ منت ہے۔ اس مردِ فقر پیشہ نے مسجد کی چٹائیوں سے ابھر کر اپنی خداداد ذہانت اور کثرتِ مطالعہ سے فلسفہ و منطق کی بلند و بالا چوٹیوں کو سر کیا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ علم و ادراک کے اسلحہ سے مسلح ہو کر یونان کے فلاسفہ اور اصحابِ منطق کے افکار و تصورات کے صنم کدوں کی خبر لائے۔ پھر ان کے بعض نظریات پر اس درجے زوردار حملے کیے کہ اس کی ضربیں برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کے ایوانوں میں سنی گئیں اور ان کے تحلیل و تجزیہ کے بہت سے حصوں کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا گیا۔

فلسفے پر ان کے عبور کا یہ عالم تھا کہ وہ ۱۹۵۴ء سے فلسفہ کانگریس کے رکن تھے جو دنیا بھر کے فلسفیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس کے اجلاسوں میں وہ جاتے اور مقالے پڑھتے تھے، یہ مقالے دیگر فلاسفہ کے مقالات کے ساتھ کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں فلسفہ کانگریس کا جو اجلاس پشاور میں ہوا تھا، اس کے مولانا صدر

تھے، اس کا افتتاح صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق نے کیا تھا اور مولانا نے اس میں صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔

مولانا کا فلسفے کا ذوق بہت پرانا ہے۔ تمام یونانی اور مغربی فلاسفہ کی کتابیں نہ صرف مولانا نے پڑھی ہیں بلکہ اپنے بہت سے مضامین میں ان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور ان کے بعض فلسفیانہ نظریات پر چبھتے ہوئے اعتراضات کیے ہیں۔ ان اعتراضات اور تنقیدات میں جو وزن اور زور ہے، اس کا اندازہ مختلف کتابوں میں پھیلی ہوئی ان کی تحریروں سے ہو سکتا ہے۔

مولانا کے فلسفے کے سلسلے میں یہاں ایک دلچسپ واقعہ بھی سنتے جایئے۔ ۱۹۴۹ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ مولانا حنیف ندوی مسجدِ مبارک میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے۔ دورانِ خطبہ میں زیرِ تلاوت آیت کے ضمن میں مشہور فلسفی کانٹ کے فلسفے کا کوئی نظریہ بحث کی زد میں آگیا اور مولانا نے قرآن کی رو سے فلسفیانہ انداز میں اس کو محلِ نقد و جرح ٹھہرایا۔ اس وقت مولوی محمد ابراہیم صاحب جو جج تھے اور عام طور پر مولانا کی اقتدا میں نمازِ جمعہ ادا کرتے تھے، خطبے میں موجود تھے۔ وہ بڑی وجاہت اور بارُعب شخصیت کے مالک تھے اور علمِ فلسفہ سے شناسا تھے۔ وہ یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ مسجد کا ایک خطیب فلسفے کی زبان میں کانٹ کے فلسفیانہ افکار کو تنقید و اعتراض کا ہدف بنا سکتا ہے۔ خطبہ ختم ہوا اور نمازِ جمعہ ادا ہو چکی تو جج صاحب مولانا کے پاس آئے اور بہ طریقِ نصیحت فرمایا کہ آپ کو خطبے میں دینی مسائل بیان کرنے پر اکتفا کرنا چاہیے، فلسفے کے نازک مباحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔

اس واقعے پر اڑتیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن یہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مسجد کے بہت سے نمازیوں کے علاوہ اس وقت اسلامیہ کالج کے چند اساتذہ اور طلبا بھی وہاں موجود تھے۔ جج صاحب نے مولانا سے فرمایا۔

"آپ فلسفہ جانتے ہیں؟"

مولانا نے کہا! "آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"

جج صاحب بولے: "آپ نے کانٹ کے فلسفے کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس کی ضرورت نہ تھی۔"

مولانا نے پوچھا: "آپ کو میری کس بات پر اعتراض ہے؟"

جج صاحب نے اپنے اندازِ خاص سے کچھ سوال کیے تو مولانا نے جواب دینا شروع کیا اور اس نہج سے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا کہ مولوی ابراہیم جج کو سوائے خاموشی اختیار کرنے کے مولانا کی گرفت سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ مولانا سے کچھ سمجھنے کے اسلوب میں بات کرتے اور مؤدب ہو کر ان کی مجلس میں بیٹھتے۔

محمد حنیف اپنے جسمِ نحیف میں ایک جہانِ دانش سمیٹے ہوئے تھے اور اُن کے تنِ زار میں ایک دنیائے علم آباد تھی۔ اُن کی خلوت میں معارف و ہنر کی بہت سی جلوتیں پنہاں تھیں، ان کی تنہائی کئی مجلسوں پر بھاری تھی، ان کی گوشہ نشینی کتنی ہی محفلوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھی، ان کی خاموشی میں انتہا درجے کا تلاطم تھا، ان کے سکوت میں تکلم کے بے شمار بھید مضمر تھے، ان کی قلندری کے حضور سکندری سرنگوں تھی اور اُن کی فقیری کے آگے میری کی گردن جھکی رہتی تھی۔ ان کی زبان کی جُنبش سے لولوئے لالہ بکھرنے لگتے اور قلم کی حرکت سے الفاظ کی شکل میں کاغذ پر موتیوں کی بارش شروع ہو جاتی۔

ان کی خصوصیت یہ تھی کہ منکسر کے سامنے انکسار اور نرمی کا پُتلا بن جاتے اور اگر کوئی غرور اور نخوت کا اظہار کرتا تو ان کے لہجے میں فوراً سختی اور خودداری کا عنصر اُبھر آتا۔ میدانِ علم میں کسی سے دب کر بات کرنا یا مرعوب ہونا ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ کسی کو اپنا حریف نہ سمجھتے تھے نہ بناتے تھے، لیکن اگر کوئی حریف کا روپ دھار کر سامنے آتا تو اس سے کئی قدم آگے بڑھ کر بات کرتے۔ آبروئے علم کی حفاظت کرنا اور علما کے صحیح وقار کو ملحوظِ خاطر رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن جو علما علم کو مادی منافع اور عاجل فوائد کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں، ان سے وہ سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔

اُنھوں نے علم و فن کے ہر دشت کی سیاحی اور فضل و کمال کے ہر گلستان کی سیر کو

اپنا وظیفۂ حیات قرار دیا۔ جب تک صحت نے اجازت دی وہ طلبِ علم اور مطالعۂ کتب میں مصروف رہے، اور یہی جذبہ ان کے معلومات کی وسعت کا باعث ہوا۔

قرآن سے متعلق اُنھوں نے تین مستقل کتابیں لکھیں جو کم و بیش تین ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔

ان میں سے ایک تفسیر "سراج البیان" ہے جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۶ء تک پندرہ مرتبہ چھپی۔ یہ برِصغیر کی پہلی کتاب ہے جو تیس اکتیس برس میں اتنی دفعہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب تقریباً دو ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کا رہوارِ قلم پچاس سال سے زائد عرصے سے شہراہِ تحقیق پر محوِ خرام تھا۔

قرآن کے سلسلے کی دوسری کتاب "مطالعۂ قرآن" تصنیف فرمائی جو تین سو سے اوپر صفحات پر محتوی ہے۔

پھر "لسان القرآن" کے نام سے دو جلدیں معرضِ اشاعت میں آئیں جو حروف ہجا کی ترتیب سے قرآن مجید کا توضیحی اور جامع لُغت ہے۔ اسے علوم و معارفِ قرآن اور تفسیری جواہر پاروں کا گنجینہ کہنا چاہیے۔ افسوس ہے یہ کتاب مکمل نہ ہو پائی۔ یہ سلسلہ حرف دال تک پہنچا تھا کہ مولانا اس دُنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ مطبوعہ صورت میں یہ دونوں جلدیں آٹھ سو صفحات پر محیط ہیں۔ اس سے آگے تقریباً سو صفحات کا مسودہ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا پڑا ہے۔ قرآن کے اس لُغت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ان کی بہت بڑی خواہش تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں، اللہ کو یہی منظور تھا جو ہو چکا۔

مولانا اگرچہ یہ کام تیزی سے کر رہے تھے اور اپنے عام معمول سے زیادہ محنت سے کر رہے تھے، لیکن اُنھوں نے عمر کی جس منزل میں اس کام کا آغاز کیا تھا، اس کے پیشِ نظر کئی دفعہ میرے دل میں یہ خیال آیا (اور بعض دیگر حضرات نے بھی اس کا اظہار کیا) کہ اگر یہ سلسلہ اتمام کی منزل کو پہنچ گیا تو اُسے معجزہ ہی قرار دیا جائے گا۔ بہرحال اگر یہ کام مکمل ہو جاتا تو لُغت کے ساتھ ساتھ اسے اچھی خاصی تفسیر کا درجہ بھی حاصل ہوتا۔

ان تین کتابوں کے علاوہ قرآن کے مختلف موضوعات پر اُن کے بہت سے مضامین متعدد رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہوئے۔

علمِ حدیث سے ان کو خاص شغف اور گہرا تعلق تھا۔ اس پر تنقید برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس ضمن میں ایک مستقل کتاب "مطالعۂ حدیث" تصنیف فرمائی اور بے شمار مضامین تحریر فرمائے جو کئی رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے۔

سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضبطِ تحریر میں لانے کا سلسلہ انھوں نے "چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں" کے دلکش عنوان سے شروع کیا تھا۔ ان کا مقصد قرآن کی روشنی میں آنحضرت کی حیاتِ طیبہ کو معرضِ کتابت میں لانا تھا۔ افسوس ہے یہ سلسلہ اتمام کو نہ پہنچ سکا۔ تاہم کتابی شکل میں یہ اب بھی تین سو صفحات کی کتاب ہو سکتی ہے جو اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہوگی۔

"اساسیاتِ اسلام" اپنے موضوع میں ان کی ایک اہم کتاب ہے، جس میں اسلام کے بنیادی تقاضے بیان کیے گئے ہیں۔

اسی طرح مسئلۂ اجتہاد، افکارِ ابن خلدون، افکارِ غزالی، سرگزشتِ غزالی، تعلیماتِ غزالی، عقلیاتِ ابن تیمیہ، تہافۃ الفلاسفہ کی تلخیص و تفہیم اور اس پر طویل مقدمہ، قدیم یونانی فلسفہ (غزالی کی **مقاصد الفلاسفہ کا اردو ترجمہ**)، مسلمانوں کے عقائد و افکار (ابوالحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین کا دو جلدوں میں ترجمہ) وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو ہر اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

مولانا ندوی نے متنوّع موضوعات کو ہدفِ بحث ٹھہرایا اور ان میں خوب دادِ تحقیق دی۔ تفسیر، حدیث، اجتہاد، سیرتِ رسول، اسلامی فلسفہ وغیرہ عنوانات پر انھوں نے جس نہج سے لکھا، وہ انھی کا حصہ ہے۔ زبان و بیان نہایت عمدہ اور ادبیّت سے مزیّن۔ ان موضوعات میں اتنی وسعت ہے کہ ان میں سے ہر موضوع پر اصحابِ تحقیق کے لیے پی، ایچ، ڈی کا ایک ایک مقالہ ہو سکتا ہے۔

مولانا کی "لسان القرآن" کے بارے میں ایک لطیفہ بھی نوکِ قلم پر آگیا ہے۔ ۱۹۸۵ء

کے نومبر کی بات ہے کہ ایک مشہور خاندان کے ایک عالمِ دین نے مجھ سے پوچھا کہ "مولانا محمد حنیف ندوی آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟"

میں نے بتایا کہ وہ "لسان القرآن" کے نام سے قرآنِ مجید کا لغت لکھ رہے ہیں جس کی پہلی جلد شائع بھی ہو چکی ہے۔

بولے "قرآنِ مجید کا لغت کیا ہوتا ہے؟"

میں حیران ہوا کہ ایک عالمِ دین کو اس کا کیا جواب دوں۔ عرض کیا:

"حروفِ تہجی کی ترتیب سے انھوں نے یہ کام شروع کیا ہے۔ مثلاً آدم کا کیا مطلب ہے، ابراہیم کس شخصیت کا نام تھا، الانسان کے کیا معنے ہیں، جنّ کون سی مخلوق ہے، جہنّم کا اطلاق کس پہ ہوتا ہے۔ اس طرح بہت سے الفاظ گنوانے کے بعد آخر میں عرض کیا کہ مثلاً جہل کیا ہے اور جاہلیت کا کیا مفہوم ہے۔"

وہ چوں کہ عالمِ دین ہیں اور عربی کے آدمی ہیں، سوچا کہ اس موضوع کی کسی عربی کتاب کا نام ہی ان کے سامنے لینا چاہیے۔ لہٰذا بتایا کہ مولانا اسی طرح قرآن کا لغت لکھ رہے ہیں، جیسے امام راغب اصفہانی کی مفردات القرآن ہے۔ فرق یہ ہے کہ مفردات القرآن مختصر ہے، مولانا کا لغت جامع اور توضیحی ہے، جس میں بہت سے الفاظِ قرآن کے مطالب، وضاحت و جامعیت سے بیان کیے گئے ہیں۔

وہ مفردات القرآن کے حروف کو کسی قدر طوالت دیتے ہوئے بولے:

مفردا —— ت —— القرآ —— ن

میں سمجھ گیا کہ قصور ان کا نہیں، میرا ہے جس نے ان کے سامنے ایسی بات کی جو ان کے ذہن سے ہم آہنگ نہیں۔ اس کے بعد دس بارہ منٹ ہم اکٹھے رہے، نہ انھوں نے کوئی بات کی اور نہ میرے لیے کچھ عرض کرنے کی گنجائش چھوڑی۔

دوسرے دن دفتر آکر مولانا کو یہ لطیفہ سنایا۔ پہلے تو سُن کر حسبِ عادت مُسکرائے۔ پھر کہا: انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وضع قطع اور ہیئت کذائی کے اعتبار سے مولانا کا انداز ہماری تہذیب کے انیسویں

صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے اساتذۂ فن سے ملتا جلتا تھا۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غالب، ذوق، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری اور حالی و شبلی کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالوں کی تراش خراش، شکل و شباہت، چال ڈھال، گفتگو، رکھ رکھاؤ، وضعداری، لب و لہجہ، خوش ذوقی اور خوش مزاجی میں انھی کی مجلس کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کی غربت و تنگ دستی اور گھریلو معاملات سے بے پروائی کے اوصاف بھی مولانا میں پائے جاتے تھے۔

موجودہ عہد کے علمائے برصغیر میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے مزاج اور فہم و فکر کے تنہا عالم تھے۔ نہایت روشن خیال، عالی فکر، صاف ذہن اور وسیع ظرف و ضمیر کے مالک ــــ! بعض لوگوں نے ان کے بعض افکار پر تنقید تو کی، جسے انھوں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی، لیکن طرزِ بیان و ادا اور اسلوبِ دلائل و استنباط میں یہ لوگ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور نہ حقائق کا جواب حقائق کی روشنی میں دے سکے۔

انھوں نے بیماری سے کچھ عرصہ پہلے ہی عام مجلسوں میں شریک ہونا اور تقریر و خطابت کی محفلوں میں جانا بند کر دیا تھا۔ اگر کسی کے اصرار پر بامرِ مجبوری جانا بھی پڑا تو خاموش بیٹھے لوگوں کی باتیں سنتے رہے، خود بہت کم بات کی۔ البتہ اگر درسِ قرآن کے لیے کہا جاتا تو تیار ہو جاتے اور اس میں نہایت علمی نکات بیان فرماتے۔ آخری علمی اور تدریسی مجلس جس میں وہ شریک ہوئے، دار العلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ، لاہور) کی تھی جو ان کی وفات سے تین مہینے قبل ۱۳۔ اپریل ۱۹۸۷ (۱۲ شعبان ۱۴۰۷ھ) کو اختتامِ صحیح بخاری کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔

اس مجلس میں ان کو شرکت پر آمادہ کرنے کے لیے دار العلوم کے اربابِ انتظام نے ان سے رابطہ کیا تو انھوں نے اپنی جسمانی کمزوری اور بیماری کی بنا پر معذرت کر دی۔ واقعۃً وہ اس معذرت میں حق بجانب تھے۔ پھر اصحابِ انتظام نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں شرکت پر آمادہ کروں۔ میں پروفیسر محمد یحییٰ (انجینئرنگ یونیورسٹی) کے ساتھ مولانا کے گھر پہنچا اور ان سے بات کی۔ پہلے تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر میرے کہنے

پر مان گئے۔ لیکن شرط یہ عائد کی کہ تقریر نہیں کریں گے، صرف پندرہ منٹ وہاں بیٹھیں گے ــــ وہ اُنھیں محض تبرکاً لے جانا چاہتے تھے۔ دوسرے دن دس بجے کے بعد وہ انھیں لے گئے۔ پندرہ منٹ کے بجائے پینتیس منٹ وہاں تشریف فرما رہے۔ تقریر وغیرہ نہیں کی۔ کمزوری کی وجہ سے تقریر کر بھی نہیں سکتے تھے ــــ یہ کسی تدریسی اور تعلیمی مجلس میں ان کی زندگی کی آخری شرکت تھی۔

مولانا ندوی جسم و جان کے اعتبار سے ہماری اس آب و گِل دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن ان کا کام جو انتہائی وقیع ہے، ہمیشہ باقی رہے گا اور لوگ رہتی دنیا تک اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ انھوں نے علم و فضل کا جو گلستاں سجایا ہے، اس کی مہک قیامت تک باقی رہے گی اور بہت سے گلچیں اس گلستاں سے اپنی اپنی پسند کے گل چُنتے اور مشامِ جاں کے لیے اس سے خوشبو حاصل کرتے رہیں گے۔

مولانا ندوی ۱۰۔جون ۱۹۰۸ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۔جولائی ۱۹۸۷ کو ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس طرح شمسی حساب سے انھوں نے ۷۹ سال ایک مہینہ دو دن عمر پائی۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء کی سردیوں میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک کئی دفعہ ان سے ملاقات کے مواقع میسّر آئے، لیکن ۱۹۴۸ء میں ہمارے تعلقات نے ایک نہایت خوش گوار کروٹ لی۔ اس وقت سے لے کر اُن کی تاریخِ وفات تک ہمارے باہمی مراسم میں روز بروز استحکام ہی پیدا ہوتا گیا۔ ان کی وفات کے بعد اس بھری پڑی دنیا میں، مَیں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے مشفق، کرم فرما اور انتہائی خیر خواہ تھے۔

۱۵۔مئی ۱۹۵۱ کو وہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستہ ہوئے۔ اپنی وفات تک (چھتیس سال دو مہینے) وہ ادارے سے منسلک رہے۔

مولانا ندوی نہایت بلند اخلاق، عالی کردار، خوش مزاج اور باغ و بہار عالمِ دین تھے۔ مَیں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف

ہوں۔ وہ انتہائی خود دار تھے۔ انھوں نے اپنی خود داری اور وضع داری کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور مکان یا پلاٹ خریدنے کی مالی اعتبار سے ان میں سکت نہ تھی۔ وہ کبھی کسی سرمایہ دار کے ہاں نہیں گئے۔ انھوں نے کبھی کسی کی جیب کے بوجھ کو قابلِ اعتنا نہیں گردانا، کبھی کسی کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کیا اور کبھی کسی سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کی کہ مخاطب کے دل میں ان کے لیے جذبۂ ترحم پیدا ہو اور وہ ان کی اعانت کرے۔ وہ بے شمار خصوصیات کے حامل تھے اور اس ضمن میں طبقۂ علما میں کوئی ان کا حریف یا مدِ مقابل نہیں تھا۔ وہ اپنے انداز کے تنہا عالم تھے۔

بعض حضرات نے مولانا حنیف ندوی کو علامہ سید سلیمان ندوی کا شاگرد لکھا ہے۔ وہ اس اعتبار سے سید صاحب کے شاگرد نہ تھے کہ انھوں نے سید صاحب سے کچھ پڑھا ہو۔ البتہ ان کے زمانۂ طالب علمی میں سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلما کے معتمدِ تعلیمات تھے۔ ندوہ لکھنؤ میں ہے اور سید صاحب دارالمصنفین (اعظم گڑھ) میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھے۔ تین چار مہینے کے بعد وہ دارالعلوم ندوۃ العلما کے بعض انتظامات کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لے جاتے تھے اور اساتذہ و طلبا سے وہاں ان کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس حیثیت سے اگر مولانا ندوی کو سید صاحب کے شاگرد کہا جائے تو الگ بات ہے، ورنہ انھوں نے براہِ راست سید صاحب سے کچھ پڑھا نہیں۔

مولانا حنیف ندوی کی موت تنہا ایک شخص کی موت نہیں ہے۔ ایک خاص قسم کے رکھ رکھاؤ اور وضعداری کی موت ہے، تہذیب و ثقافت کی صاف ستھری روایت کا خاتمہ ہے، فضل و کمال کی بلندیوں کے رو بہ زوال ہونے کا ماتم ہے، تحقیق و کاوش کی اعلیٰ قدروں کی جان کنی ہے، زبان و انداز کے پُرشکوہ اسلوب کے ختم ہو جانے کا دردناک نوحہ ہے اور تصنیف و تالیف کے پاکیزہ ذوق کو شدید دھچکا لگنے پر اظہارِ حزن و ملال ہے۔

اپنے دور کی ندوی برادری کے مولانا حنیف ندوی آخری رکن تھے، ان کی وفات کے ساتھ ہی بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے ندوی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ مولانا

سید ابوالحسن علی ندوی کا دَوران کے بعد کا ہے۔

مولانا حنیف ندوی علم وفضل کی محفلِ دوشیں کی وہ شمعِ فروزاں تھے جن کی تصنیفات وتحقیقات کی ضوفشانیوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا اور جن کے کمالاتِ علمیہ سے اصحابِ ذوق رہتی دنیا تک کسبِ ضیا کرتے رہیں گے۔

وہ اگرچہ طبعی عمر کو پہنچ گئے تھے، لیکن ان کا شمار ان اربابِ فضیلت میں ہوتا ہے، جن کی منازلِ عمر کو ماہ وسال کے پیمانوں سے نہیں ماپا جاتا، بلکہ اللہ سے ان کے لیے مزید درازیِ عمر کی دعا کی جاتی ہے، تاکہ ان کے علمی فیض رسانیوں کا دائرہ اور وسیع ہو اور ان کی تحقیق وکاوش کے حلقے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ اختیار کریں۔

موت وحیات کے ہمہ گیر قاعدے کے مطابق ہر متنفس کو مرنا ہے۔ مولانا کو بھی ایک دن مرنا تھا اور وہ موت کا لقمہ بن گئے۔ لیکن موت اور موت میں فرق ہے، انسان اور انسان میں بھی فرق ہے۔

قضا کس کو نہیں آتی ہے، یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

مختلف مسائل ومعاملات سے متعلق مولانا ندوی نہایت عمدہ تجزیہ کرتے تھے۔

ایک دن عام علمائے دین اور صوفیائے کرام کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تبلیغِ حق کے سلسلے میں دونوں ایک ہی قسم کی بات کہیں گے، لیکن دونوں کے لب ولہجے اور اسلوبِ کلام میں نمایاں فرق ہوگا۔

عالمِ دین کلمۂ حق کہنے میں انتخابِ الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دے گا۔ نرم یا سخت جو الفاظ زبان پر آئے بلا تامّل کہہ دے گا، یہ خیال نہیں کرے گا کہ مخاطب پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ حق کڑوا ہوتا ہے اور اس کی کڑواہٹ کا اثر مخاطب کے حلق اور معدے تک پہنچنا چاہیے۔ لیکن صوفی اور عارف اس طرزِ ادا کو نہیں اپنائے گا۔ وہ سخت سے سخت بات کہنے کے لیے بھی نرم سے نرم الفاظ تلاش کرے گا۔ اس کی کوشش یہ ہوگی کہ اپنی بات بھی کہہ دی جائے اور

مخاطب کو ذہنی اور قلبی تکلیف بھی نہ پہنچے۔

مولانا کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ آج کل اکثر مبلّغین کو ہم دیکھتے ہیں کہ انتخابِ الفاظ کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ایسا ترش اور کڑوا انداز اختیار کرتے ہیں کہ مخاطب پر اچھا اثر پڑنے کے بجائے بُرا اثر پڑتا ہے۔ حالاں کہ قرآن کا واضح حکم ہے کہ نرم و ملائم لفظوں میں تبلیغ کرنی چاہیے اور نوبت جھگڑے تک بھی پہنچ جائے تو گفتگو میں احسن طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

موت کے بارے میں مولانا ندوی کہا کرتے تھے کہ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ موت، تغیّرِ مقام اور تغیّرِ احوال کا نام ہے۔ جو شخص اس کارگاہِ آفرینش میں اس ڈھب سے زندگی بسر کرتا ہے کہ جو موت کے بعد پیش آنے والے ماحول و اسلوب سے ہم آہنگ ہو سکے، اس کی وہاں پہنچتے ہی اس ماحول اور اس طرزِ حیات سے مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور اسے وہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا ابتدا ہی سے اسی ماحول اور اسی نواح سے اس کا تعلق ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اس دنیا میں رہ کر بعد از موت کے اسلوبِ زلست کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، وہاں انھیں بلاشبہ دِقت پیش آئے گی۔ انھیں تھوڑی بہت اذیت اٹھانے اور کچھ عرصہ گزارنے کے بعد بہ تدریج اس ماحول سے موانست و مطابقت پیدا ہو گی۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس دنیا میں بھی ماحول کی عدم مطابقت اور اجنبیت کی وجہ سے عام طور پر ہمیں یہ دِقّت پیش آتی ہے۔ مثلاً ہم کسی ایسے علاقے یا ملک میں چلے جاتے ہیں جہاں کی زبان، ثقافت، تہذیب اور طرزِ معاشرت سے واقفیت نہیں ہوتی تو جب تک اس سے ذہنی مطابقت اور لسانی مناسبت نہیں پیدا ہو جاتی، احساسِ اجنبیت قائم رہتا ہے اور جوں ہی مناسبت و مطابقت پیدا ہوئی، غیریت اور دوئی کے تمام حجاب ختم ہو جاتے ہیں ــــ یہ صورتِ حال انسان کی قلبی اور علمی استعداد سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر یہ استعداد تیز ہے تو مطابقت جلد پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اس

میں کمی ہے تو مطابقت کی رفتار ظاہر ہے، کم رہے گی۔

یہ بات خالص عارفانہ ہے اور معرفت و سلوک کا کوئی ماہر ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔

اتنی بڑی حقیقت کو اس درجہ حکیمانہ پیرائے میں کوئی عام عالم بیان نہیں کر سکتا۔

مولانا کہا کرتے تھے کہ ہمارا خدا اپنے بندوں کو ان شاء اللہ عذاب و عقاب کی ناقابلِ برداشت شدت سے دوچار نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ وہ رحمن ہے، رحیم ہے، رؤف ہے، غفور ہے، غفار ہے، توّاب ہے۔ وہ اپنے بارے میں خود کہتا ہے:

رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۔ (الاعراف : ۱۵۶)

میری رحمت (کی فراوانی) کا حال یہ ہے کہ ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ردائے رحمت ہمہ گیر ہے اور دنیا کی ہر چھوٹی بڑی شے کو اس نے گھیر رکھا ہے۔ اس جہانِ ہست و بود میں اس کی رحمتوں کا فیضان اس قدر عام ہے کہ اس کو حیطۂ شمار میں لانا اور اس کی وسعتوں کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ جدھر دیکھو رحمتِ الٰہی کے فیوض ہی نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ بارگاہِ خداوندی سے فقط رحمت ہی کا صدور اور ظہور ہوتا ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ (الانعام : ۱۲)

اس (اللہ) نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ رحمت فرمائے۔

کائنات کے گوشے گوشے میں اس کے فضل و رحمت کی بارش ہو رہی ہے اور اس کا یہ قانون اور اصول ہے کہ زمین و آسمان کے دور دراز کناروں تک اپنی رحمت کو پھیلا دے اور ہر چیز کو اس سے مستفیض ہونے کے مواقع مہیا کرے۔

محمد حنیف! تو نے خودداری کی زندگی بسر کی۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے، جو کچھ مانگا اللہ سے مانگا۔ تجھ پر دنیائے فانی میں کئی دور آئے، اللہ نے ہر موقع پر تیری مدد فرمائی۔ تو عمر بھر اللہ اور اس کے رسول کے دین کی خدمت کرتا رہا۔ حدیثِ رسول پر جب کسی نے حملہ کیا، تیرا قلم جوش میں آگیا، تو نے حدیثِ رسول کا دفاع بھی کیا اور معترضینِ حدیث پر حملے بھی کیے۔ تیری زندگی کے لمحات خدمتِ قرآن

میں گزرے۔ تو اللہ کے کلام اور سینۂ لاہوت کے آخری بول کی خدمت میں مصروف تھا کہ تجھ پر مرض الموت نے حملہ کیا، تو اسی حالت میں آسودۂ لحد ہوا اور اطمینان کی نیند سویا۔ قرآن بھی تیرا شفیع ہوگا اور صاحبِ حدیث (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تیری شفاعت فرمائیں گے۔ تو ہماری اس عارضی دنیا میں ہمیشہ اور ہر حالت میں مطمئن اور پُرسکون رہا۔ ہم عاجز بندوں کو یقین ہے کہ اللہ کے نزدیک بھی جہاں دوام کی زندگی ہے، تو اطمینان وسکون میں ہے۔ اپنی حسنات کے پیشِ نظر اب تو عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوگا، قبول ومغفرت کے پھول تجھ پر نچھاور کیے جا رہے ہوں گے۔ موت کے بعد بارگاہِ قدس سے تجھے یہ مسرت انگیز ندا آئی ہوگی:

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِىٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۝ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۝